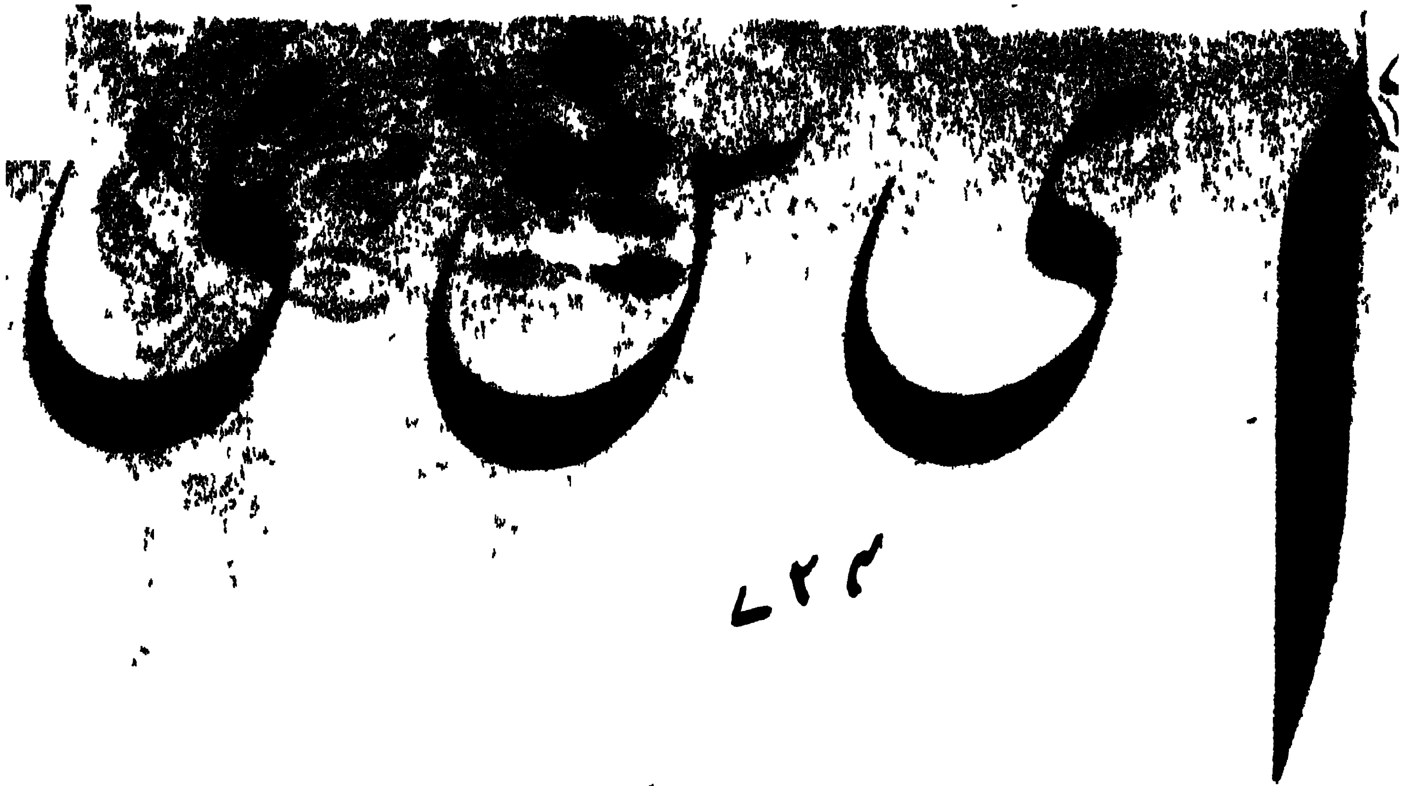


مشترک نمبر

(ستمبر و اکتوبر ۱۹۳۵ء)

قیمت ۱۲/

مدیر:-

ساغر نظامی

زیر سرپرستی

عالی جناب ڈاکٹر سید محمود مدظلہ العالی

ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی



برائے۔

کوہ ہمالیہ کا پیغام مادر ہند کے نام

کوہ ہمالیہ ایک سلسلہ ہے جو عظمت کا مظہر ہے ان پہاڑوں سے ہندوستان ایک سرزمین کی ... اور یہ سرزمین بہت متحرک ہے جس طرح یہ نفس متحرک ہوتی ہے جیسے ایک زندہ لفظ ایک زندگی بخشنے والی آواز ——— اور وہ آواز گونجتی ہے وہ مادر ہند سے خطاب کرتی ہے مادر ہند! اس پیغام کو سن جو ان بلندیوں سے تیرے لئے آتا ہے جو ہمالہ کا پیغام ہے یہ آواز تجھ سے کہہ رہی ہے:

وہ ساعت قریب ہے، وہ پُرعظمت گھڑی جب تو آزاد ہو گی قریب ہے اور تیری آرزو بر آئے مگر صرف یہی نہیں جو تو نے پایا تیری آرزو سے بہت زیادہ بہت ارفع، زیادہ حسین اور واضح، زیادہ متحرک وہ کسی سے مغلوب ہونے والی آرزو ہے حتیٰ کہ تو بھی اپنی طاقت سے مجبور ہو گی یہ آواز اس لئے آئی ہے کہ خدا کی بھیجی ہوئی ہے اور اسی لئے تعمیل اس کی طلب ہماری طلب ہماری گریہ زاری صرف جواب اور ہماری دعائیں محض آواز بازگشت ہیں یہ کہنا:

تیری ہوس نے فتح حاصل کی

مگر کوئی فتح حاصل نہیں کرتے جب تک پہلے خدا کا حکم نہ ہو۔ تو اپنی فتح کو اس کی ایسی بخشش جو تجھ کو قبول کرنا ہے تجھے کوئی محروم نہیں رکھ سکتا۔ جب نور حق کی گھڑی وہ وقت مطلق حکم آتا ہے تو کون ہے جو اس کے حکم سے انحراف کرے؟ بلکہ سب اس کی تعمیل کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اب وہ حکم دے رہا ہے اور تمام قوموں کو حکم دے رہا ہے وہ ہر قوم سے اپنے فیصلہ کی تعمیل کرا رہا ہے اور اپنا شاہی فرمان سنا رہا ہے ہندوستان کیلئے اس کا حکم ہے کہ ۔۔۔ "آزاد ہو جا"

موسیو پال رچرڈ

ادبی مرکز میرٹھ

بھکاری کی صدا

بات نہ پوچھے بابا کوئی دَر دَر دی آواز
کیوں بجتا ہے اب بھی پاپی یہ جیون کا ساز

طوفاں سر پر، رات اندھیری، ہر دم اک منجدھار
پیالہ میرا نیّا ہے اور قسمت کھیون ہار

بات نہ پوچھے بابا کوئی...

یہ گڑھ تاروں کے ہمسایہ یہ اونچے استھان
یاں مانگے یہ بھی ملتا ہے کب بھکشو کو دان

جس کو دیکھو داتا ہے اور سب داتا ہیں چور
اس نگری میں سب کو پایا پکا لال کٹھور

بات نہ پوچھے بابا کوئی..

چاند ستارے لعنت بھیجیں سورج دے دھتکار
بیٹھے بیٹھے دھیان میں مجھ کو دھکے دے سنسار

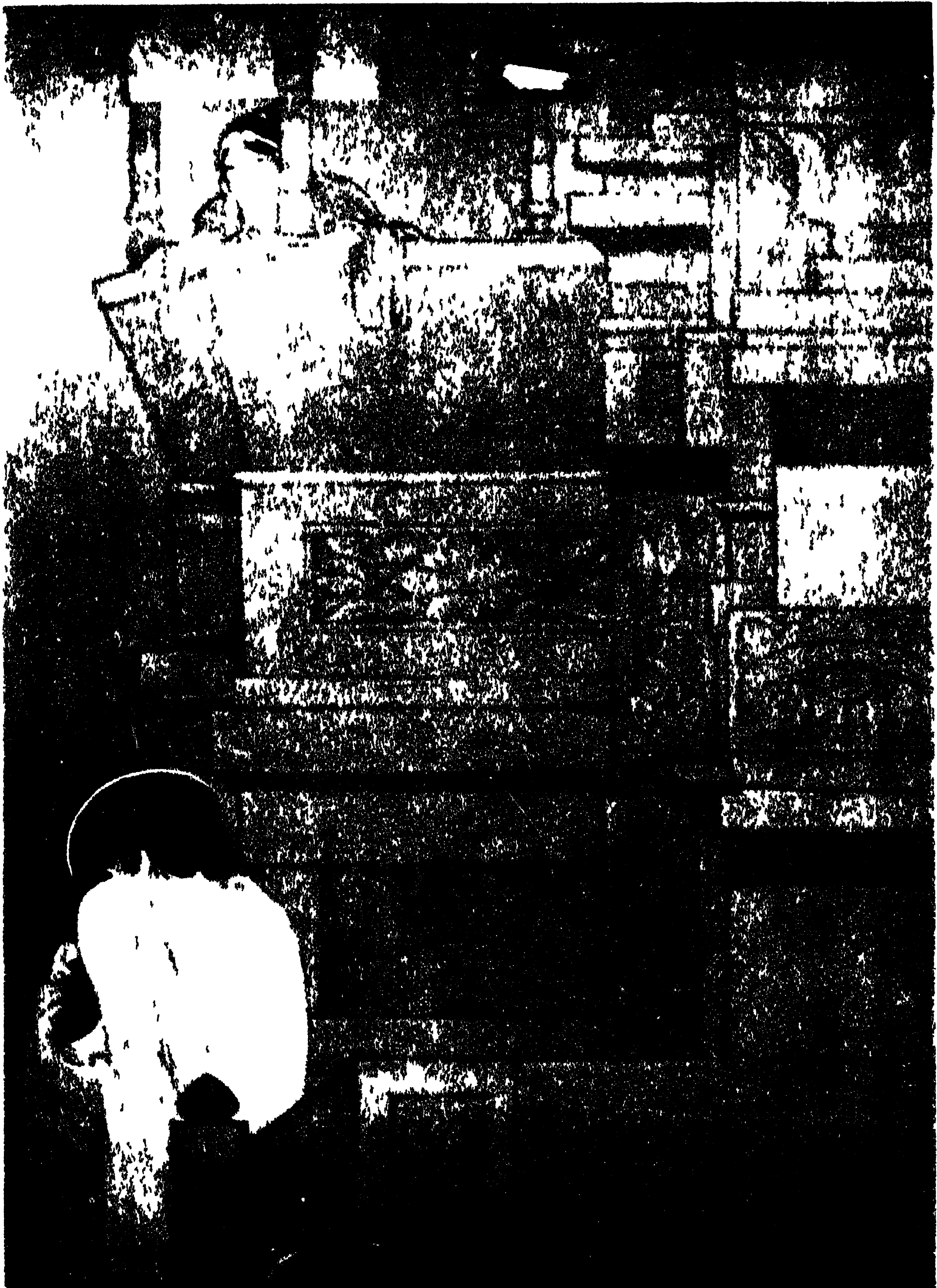
مایا بن جیون ہے جگ میں جیون کا ایمان
مایا ہی جنجال ہے بابا مایا ہی نروان

بات نہ پوچھے بابا کوئی...

بھیک بھکاری دان اور داتا سب کو پرے جان
پریم بھکاری کب رکھتے ہیں بھکشا پر ایمان

آس یہ ہے وہ چھم چھم کرتی کوٹھوں دوڑی آئے
اوپر سے اک آنسو ٹپکے اور پیالہ بھر جائے

ساغر نظامی



فہرست مضامین

بابت ماہنامہ ایشیا مشترک نمبر (ستمبر و اکتوبر ۱۹۳۵ء)

جلد (۱) نمبر (۳ و ۴)

تصاویر (۴)

بھکاری (سہ رنگ عمل)۔ رام گوپال (جے پوری)

کرشن گوپال (چہار رنگ عمل)۔ بینیٹی ڈے (بمبئی)

(۱) بھکاری (سہ رنگ) (۲) موسیو پال رچرڈ (۳) اربندو گھوش (۴) اُردو کا جوان سال ادیب (سید فرید جعفری) (۵) آغا محمد حشر کاشمیری مرحوم۔
(۶) مہر لال ضیا ایم اے (۷) کرشن گوپال (چہار رنگ) (۸) میر منظور وکی امرتسری (۹) صابر خلیلی امرتسری۔

محبت
ایشیا
ہمدردی — صداقت

اذکار و مباحث

علالت کے متعلق کیا عرض کروں۔ صحت و بیماری زندگی کے لوازمات سے ہے۔ پھر اس وقت تک جئے تو کیا کیا۔ مر جاتے تو کونسی کمی واقع ہو جاتی۔ اب زندہ ہیں تو کیا کریں گے۔ جگر نے خوب کہا ہے ؎

لے لیا کام جو لینا تھا غمِ ہستی نے! گرچہ ثابت نہ ہوئی میری ضرورت مجھ کو

لیکن بہر حال شدید علالت کے بعد ابھی رگوں میں صحت و تندرستی کا تازہ اور قوی خون اچھی طرح گردش بھی نہ کرنے پایا تھا کہ احساس نے بطور خاص ان فرائض کی طرف اشارہ کیا جو **ایشیا** کی ادارت اور انتظامی امور سے تعلق رکھتے تھے ہر چند کہ میں اس قابل نہ تھا کہ ابھی کوئی مادہ دماغی کام کر سکتا لیکن اس کمزوری اور ناطاقتی ہی میں کام شروع کر دیا۔ کچھ احساس فرض تھا اور کچھ جنونِ شوق دونوں نے مل کر وہ قوت پرواز بخشی کہ بالآخر منزل پر تھا۔

مشترک نمبر

مجھے اطمینان ہے کہ ایسی مایوسی اور بے بسی کی حالت میں دماغ و قویٰ پر کوئی قابو نہیں رکھتا تھا **مشترک نمبر** مجموعی طور پر بڑی حد تک اس معیار کے مطابق ترتیب دیا جا سکا جو **ایشیا** کی اشاعت اول سے اس وقت تک میرے پیشِ نظر رہا ہے۔ غالباً میں اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوتا اگر **ایشیا** کی وہ زبردست معاون جماعت جو ہندوستان کے گوشے گوشے میں کارفرما ہے میری امداد نہ فرماتی۔ بڑی حق تلفی ہوگی اگر میں اختر حسین رائے پوری بی اے حضرت جوش ملیح آبادی، نواب جعفر علی خاں صاحب اثر بی اے، محمد یونس سلیم بی اے (حیدر آباد)، سید طالب علی الہ آبادی ایم اے، مہر لال ضیا سونی فتح آبادی ایم اے، سید عسکری طباطبائی بی اے لکھنوی، سید فرید جعفری مچھلی شہری، اقبال احمد بی اے، سید محمد یحییٰ میرٹھی، سید عنایت علی بی اے اجمیری، صابر صاحب امرتسری، خانصاحب خواجہ لطیف احمد بی اے (برار) خواجہ مسعود علی ذوقی بی اے (علیگ)، مولانا ماہر القادری بدایونی، خواجہ غلام محمد نانی بی اے (علیگ) اور

فلکی صاحب، جمیری وغیرہ کا شکریہ ادا کروں گا۔ ان تمام دوستوں نے اپنے فرائض کو محسوس کیا اور میری ذات سے جو خلوص ان پرستاران محبت کو ہے اس کا پورا ثبوت دیا۔ جس کے لئے میری روح ممنون ہے اور میں ان حضرات کی محبت و دوستانہ امداد کو کبھی فراموش نہیں کر سکوں گا۔

ناظرین پر یہ حقیقت اچھی طرح روشن ہے کہ علاوہ مالی اور انتظامی امور کے کسی صحیح معیاری رسالے کو شائع کرنے کے لئے کافی دقتیں درپیش ہوتی ہیں۔ ہمارے ملک میں جس قدر خوش نگار ادیب ہیں وہ انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں جس قدر خوش فکر شعراء ہیں ان کی محدود تعداد بھی ظاہر ہے پھر ان سب کیلئے مختلف ذمہ داریاں اور مختلف اشغال کے ساتھ ساتھ ہر رسالے اور ہر ادارۂ ادبی کے مطالبات ہیں، اور میں ذاتی تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ اصحاب ذوق صدی مضامین کی فرمائشوں کی تکمیل سے بھی قاصر رہتے ہیں دور جانے کی ضرورت نہیں، میں خود باوجود ذوق اور اس خواہش کے کہ رسائل اور اخبارات کے مطالبۂ مضامین کی تعمیل کروں اپنی ذاتی مصروفیات اور انبار در انبار خطوط دیکھ کر ہمت ہار دیتا ہوں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کچھ نہیں ہوتا۔ اردو جرنلزم کا جو کچھ حال ہے وہ سب پر روشن ہے پھر بھی بعض ایسے دل جلے حضرات ہندوستان میں موجود ہیں جو سب جانتے ہوئے بھی "معاوضہ" کی شرط پیش کرکے کچھ نہ کچھ فائدہ اٹھا لیتے ہیں لیکن چند سادہ لوح ایسے بھی ہیں کہ جن کی زبان اس باب میں گنگ ثابت ہوتی ہے اور قلم بے زبان۔

ان تمام صورتوں میں ایشیا ۱۲۰ صفحات کا قطعی غیر مطبوعہ سامان مطالعہ لیکر حاضر ہو رہا ہے جو ہمکا، معترض کا رہین منت نہیں ہے بلکہ بطور خاص ایشیا ہی کے لئے بیمار اور معذور ایڈیٹر نے اپنے ذاتی اثرات سے حاصل کیا ہے اور جو کچھ ہو سکا ہے خود بھی لکھا ہے تاہم اس نمبر کو ہم اپنی ساری ذوق اور معیار کی تکمیل اور ارتقاء تعبیر نہیں کرتے۔ ہماری کوشش ہوگی کہ آئندہ نمبر مشترک نمبر سے بہتر مضامین اور ترتیب و خوشنمائی کے لحاظ سے فزوں تر ہو۔ اگر خدا نے چاہا تو ایشیا اپنے مقصودہ معیار کی طرف برابر بڑھتا ہی چلا جائیگا اور ایک نہ ایک دن کامیابی سے ہمکنار ہو کر رہیگا۔

ایشیا کے ناظرین کیلئے سال میں ۲ دو مکمل کتابیں

محض اس لئے کہ ایشیا کے ناظرین کو بہترین اور ارتقائی اردو ادب کی نذر دی جائے مشترک نمبر سے ایک نیا سلسلہ شروع کیا جاتا ہے "سوتیا ڈاہ" مستقل ڈرامہ مکمل طور پر اس نمبر میں شائع ہو رہا ہے اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ ایک سال میں ہم اپنے ناظرین کو دو مستقل کتابیں پیش کر دیا کرینگے "سوتیا ڈاہ" جو ایک بہترین ڈرامہ ہے اور جس کا خاکہ مغربی ہے لیکن ترقی دادہ ہندوستانی سوسائٹی کی تصویر پیش کرتا ہے اردو زبان میں فطری ڈرامہ نگاری کی طرف ایک احسن قدم ہے اس کے بعد "ڈورین گرے" آسکر وائلڈ کے مشہور عالم ناول کی باری ہے ہم نے اپنے محب صادق سید محمد تقی صاحب میرٹھی کو اس کی اشاعت اور صوت بیانیوں کا مداح پایا اور کوئی شک نہیں کہ آسکر وائلڈ اپنے جن خصوصیات کے لئے انگریزی ادب میں مشہور ہے وہ زیادہ سے زیادہ "ڈورین گرے" میں پائے جاتے ہیں۔ ایک ایسے مترجم کے لئے جو اصل زبان کی نزاکتوں اور خصوصیتوں کا بھی لذت شناس ہو اور وہی کیفیت ترجمہ میں بھی پیدا کرنا چاہے بڑی دشواریاں اور دقتوں کا سامنا ہو جاتا ہے۔ پھر اس کی تکمیل و ترتیب کے پردے ہیں جب دوسری "ادائیں" کی نمائش بھی مقصود ہو تو ان "دقتوں" کی اہمیت ظاہر ہے بہرحال سوتیا ڈاہ کے ساتھ ہی "ڈورین گرے" کا مسودہ بھی شروع کر دیا جاتا اگر ناول کا تمام و کمال ترجمہ ہو گیا ہوتا۔ لیکن سید صاحب اپنی بعض مصروفیتوں کی وجہ سے ترجمہ کی تکمیل نہیں فرما سکے ہم بھی اس کی اشاعت میں عجلت کو مناسب خیال نہیں کرتے کیونکہ آسکر وائلڈ کی یہ ایک معرکۃ الآرا تصنیف ہے اور اس تصنیف کے ترجمہ کو شان و تکمیل ہی کے ساتھ پیش ہونا چاہیئے۔

مشترک نمبر کے افسانے

پریم کی بھینٹ، اور ثریا دونوں طبعزاد افسانے ہیں پریم کی بھینٹ ہندوستان کی دیہاتی زندگی کو پیش کرتا ہے، اور ثریا شہری ارتقائی زندگی کو۔ فریدی نے زبان کی سادگی اور تاثیر نگاری کا کمال دکھایا ہے۔ زبان و شیرینی بیان کے لحاظ سے کہانی کا درجہ بہت بلند ہے ثریا عسکری صاحب کا شاہکار ہے اور کوئی شک نہیں کہ اس کا پلاٹ اس کا اسلوب اسکی زبان اسدرجہ بے تکلف اور آزاد ہے کہ افسانے کو کوئی بھی غیر قیاسی نہیں کہہ سکتا افسانہ بہت سادگی بے تکلفی سے شروع ہوتا ہے اور آغاز اتنی عمومیت لئے ہوئے ہے کہ مزاج مطالعہ پر بار معلوم ہوتی ہے لیکن چشم زدن میں یہی عمومیت تخصیص پیدا کرتی ہے کہ افسانے کو ختم کئے بغیر جی نہیں مانتا۔ اپنے عروج کے لحاظ سے کہانی برابر ترقی کرتی گئی ہے اور جوش زبان بڑھتا گیا ہے بہ نتیجے نہایت آزادی کے ساتھ قلم سے نکل گئے ہیں "ضمیر فروش ملکہ" ہمارے دوست مرزا اقبال احمد بی۔اے ایڈوکیٹ کا تالیفی افسانہ ہے جو انگلستان کی رومان آفرین تاریخ سے ماخوذ ہے لیکن زبان و بیان کی کیفیت کا کریڈیٹ بطور خاص اقبال صاحب ہی کو ہے مشترک نمبر کے عام افسانے کم معلوم ہوتے ہیں لیکن "ضمیر" میں "سبب اثر" کا قائل ہوں اگر افسانے زیادہ نہیں ہیں تو مکالموں اور ڈرامہ کے اصلوب نے [illegible] کا توازن قائم کرنے میں مدد دی ہے۔

مشترک نمبر کی نظمیں

پھول جب تک ہے [illegible] ہوتی ہے [illegible] پھولوں [illegible] کا یہ عالم بھی دیدنی ہوتا ہے مگر جب وہ [illegible] بن جائیں جب وہ [illegible] صورت میں منتقل ہو جائیں تو ان کے حسن کی شان ہی دوسری ہو جاتی ہے [illegible] کل [illegible] جو ادبی ہوتی مشترک نمبر میں پیش کئے [illegible] کا [illegible] ذخیرہ کر دینے والے تھے لیکن ذوق ترتیب [illegible] زیادہ [illegible] کرنے میں مدد دی ہے۔ [illegible] بیماری کی حالت میں بھی [illegible] قائم رکھنے میں کامیاب ہوا [illegible] نظمیں میری نظموں کو نظر انداز کرنے کے [illegible] لطیف [illegible] کرتی ہیں [illegible] جوش [illegible] نظم شام [illegible] نہیں [illegible] اردو میں [illegible] عشق و جنون کی باتیں [illegible] اشعار پر ختم [illegible]

جو میں [illegible] عشق و جنون کی باتو نکہ

[illegible] ترا نہ میں [illegible] اقبال [illegible] نظم [illegible]

درخصوصاً جیل میں پنڈت جواہر لال کے خطوط اندرا کے نام بہترین ترجمے ہیں۔ زبان کی سلاست و روانی اور با محاورہ اظہار بیان کے لحاظ سے ان تاریخی و سیاسی و ادبی تراجم کی حیثیت طبعزاد مضامین سے کسی حیثیت سے کم نہیں، شہر راج گیر نجیبہ کارانہ ترجمہ کا بہترین نمونہ ہے۔ یونس سلیم نے بھی جواہر لال جی کے خطوط کو محنت اور دلچسپی سے ترجمہ کیا ہے اور زبان کا ایک خاص معیار قائم رکھا ہے۔ سقراط کی موت ہمارے دوست ضیا صاحب ایم۔ اے کا سلیس ترجمہ ہے جس میں باوجود اہم اور عمیق مطالب کے سادہ زبان اختیار کی گئی ہے اور یہ بڑا کمال ہے۔ آخر میں اپنے عزیز محترم مہر لال ضیا ایم۔ اے کے متعلق وہ تاثر پیش کئے بغیر رہ نہیں ہو سکتا جو ان کے اخلاص، برادرانہ سعادت، ذوق علمی، و تکی کی بے لوث اسپرٹ کی طرف سے میرے دل میں پرورش پا رہا ہے خصوصاً بیماری کے زمانے میں انھوں نے جس محنت و محبت کے ساتھ میرے کاموں میں حصہ لیا اس کیلئے گو شکر گذاری ایک ادنیٰ چیز ہے مگر میں انکا شکریہ ادا کئے بغیر نہیں رہ سکتا ضیا صاحب ایم اے پنجاب کے ایک با ذوق ہندو نوجوان ہیں جنکی نثر و نظم کی بلند پائگی کے آئینہ دار ایشیا کے صفحات ہیں۔ انکے مزاج میں رفعت، دل میں ذوق اور ذوق میں ثبات پایا جاتا ہے جو اُن کے زرّین مستقبل کا پتہ دیتا ہے۔

اُردو اور ہندی کا بے وقت و بے معنی قضیہ

قبل اس کے کہ میں اس مسئلے پر اپنی ناچیز رائے ظاہر کروں نہایت آزادی سے یہ عرض کر دینا اپنے ضمیر کی عبادت خیال کرتا ہوں کہ "وطن" اور "قوم" کے باب میں اپنے عقائد کے لحاظ سے میں خود کو ان لوگوں سے مختلف محسوس کرتا ہوں جو ملک پر دوسری چیزوں کو مقدم خیال کرتے ہیں، اس باب میں کسی قسم کا دعویٰ تو حماقت ہے کہ یہ بڑی سخت راہ ہے اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ ہم راہ کے ان تمام شدید مراحل کو طے کر سکتے ہیں جن میں بڑے بڑے گم ہو کر رہ گئے تاہم میں ذاتی طور پر ان جزئیات میں الجھ کر رہ جانا نہ صرف کم دلی اور حماقت خیال کرتا ہوں بلکہ "بے ایمانی" سمجھتا ہوں۔ میرا ذاتی عقیدہ ہے کہ:۔

"اگر ہندوستان کی تمام موجودہ کائنات ملیا میٹ ہو کر خاکستر ہو کر، راکھ ہو کر ایک غیور قوم، ایک آزاد ملک، اور ایک سچی نذر انسانیت کا مقدس نخل پھوٹ سکتا ہے۔ تو سب کچھ اس اہم ترین مبارک کام کے لئے مٹ جانے دو، مگر خدا کے لئے دنیا کی نگاہوں میں بلند ہو جاؤ، اگر فارسی رسم الخط کی تباہی کے بعد ہندوستان کامل آزادی حاصل کر سکتا ہے۔ اگر اُردو کے 'ہندی' ہو جانے کے بعد ہندو مسلمان محض سیاسی طور پر ہی "واحد قوم" بن سکتے ہیں تو مجھے اس عظیم و مبارک فائدے کے مقابلے میں یہ تمام نقصانات منظور ہیں۔"

لیکن یہ میرا ذاتی عقیدہ ہے جس کی بنیاد ایک آتشکدہ پر قائم ہے یہ آتشکدہ ہر کوئی سلگنے کیلئے اپنے سینے میں کیوں رکھنے لگا۔ ہاں ایسے سرد و جمے ہوئے کلیجے رکھنے والے موجود ہیں جن میں کبھی حرارت پیدا بھی ہوتی ہے تو اس سے خوف اور دہشت کا دھواں بلند ہوتا ہے اور وہ اس دھوئیں کی دیواروں سے محاذ قائم کرکے پاکستان، ہندو انڈیا، اور "مسلم انڈیا" کے خواب دیکھنے اور دکھانے میں عملی طور پر ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ ایسی فضا میں اس مسئلے پر اجتماعی نقطۂ نگاہ سے غور کیا جائے اور کوئی ایسا نتیجہ نکالا جائے جس سے اس مسئلہ کا حل ہو سکے۔ فرقہ وارانہ نہیں بلکہ ملکی مفاد کو پیش نظر رکھتے ہوئے میرا خیال ہے کہ موجودہ نازک وقت میں جو لوگ اردو اور 'ہندی' کے قضیے کو مقابلاتی طور پر بڑھا رہے ہیں وہ ملک میں ایک نئے فتنے کو پرورش دے رہے ہیں اور اس خلیج کو وسیع کر رہے ہیں جو ناگوار حالات نے ہندو اور مسلمانوں کے درمیان مدت سے حائل کر دی ہے ضرورت تو اس بات کی تھی کہ وہ نام نہاد قومی کارکن جو سیاسی مناظر پر متحدہ قومیت، عالمگیر اخوت ہندو مسلم اتحاد اور محبت و رافت کے گیت گاتے تھے سیاسی جدوجہد اور سول نافرمانی کے ختم ہونے کے بعد ملک میں امن و اتحاد کی روح پیدا کرنے کے لئے کوئی بنیادی کام کرتے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ وہ لوگ اس رو میں بہہ گئے جنکی غواصی مثال میں پیش کی جاتی تھی اور جو میدان صحافت کے تجربے کار شناور تھے۔ جہاں تک قوموں کی اپنی اپنی زبان کی حیات اور توسیع کا تعلق ہے ہر قوم کو حق حاصل ہے کہ وہ روحانی یا کلچرل طور پر جس زبان اور رسم الخط سے قریب ہے اسکی توسیع و استحکام کے لئے سعی کرے، چنانچہ ہندی اور ناگری رسم الخط کی تحریک آج کی تحریک نہیں ہے بلکہ یہ اس وقت شروع ہو گئی تھی جس وقت حکومت نے غدر کے بعد مسلمانوں کو بہ ہر نوع مٹا دینے کی پالیسی پر عمل شروع کیا۔ جو خدشہ اس وقت مسلمانوں کو رسم الخط کی تبدیلی کے تخیل میں نظر آ رہا ہے۔ انگریزوں نے اپنے تدبر سے آغاز میں اس کو معلوم کر لیا تھا اور اسی کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ حکومت کے دفاتر سے فارسی کو خارج کرنے کی اسکیم پر عمل درآمد کیا گیا اور فارسی کی جگہ انگریزی نے لے لی۔ کوئی شک نہیں کہ یہ بھی حاکمیت کا ایک ادنیٰ کرشمہ تھا فارسی کی دشمنی کے علاوہ اس اہتمام کو حکومت کی لسانی مشکلات کے حل کی حیثیت بھی دی جا سکتی ہے۔ لیکن فارسی کے مقابلے میں محض انگریزی ہی نہیں تھی بلکہ برادران وطن کا بھی یہ مطالبہ تھا کہ دفاتر میں ہندی کو رائج کیا جائے۔ اس کے بعد مسلمانوں کے نظام حیات پر دوسری ضرب طریقۂ تعلیم کے تبدل و انقلاب نے لگائی، رفتہ رفتہ انگریزی کی وسعت و اثر گیری اور خود مسلمانوں کی ذہنی غلامی نے انکو فارسی سے بظاہر دور کر دیا لیکن وہ کلیۃً دور نہیں ہو سکے گو حالات بہت بدل گئے ہیں تاہم آج بھی سوسائٹی میں وہ شخص جاہل ہی تصور کیا جاتا ہے جو فارسی نہیں جانتا۔ بہر حال ہم فارسی سے روحانی طور پر کتنے ہی قریب ہوں لیکن بہ حیثیت ہندوستانی ہماری زبان "فارسی" نہیں ہے یہ لا پرواہی۔ ہم اس لئے اختیار نہیں کرتے کہ ہمیں ایران سے اسلامی بھائی چارہ توڑ دینا ہے بلکہ یہ استغنا محض اس لئے ہے کہ سب زبانوں کے فیضان و کرم سے ہمارے پاس اپنی ایک زبان ہے اور وہ اُردو ہے۔ جسکو آج گیارہ کروڑ افراد بولتے ہیں اور جو دنیا کی سات بڑی زبانوں چینی انگریزی جرمانی، روسی، عربی، ترکی میں شمار ہو سکتی ہے جسے پہلے "ہندوستانی" کہا گیا اور اب ہندی کہنے پر زور دیا جا رہا ہے۔ بہر حال مجھے یہ کہنا ہے کہ فارسی کے اثرات کو مٹانے کے لئے تیسری طاقت کی طرف سے ہندو بھائیوں کے ذریعہ یہ مقابلاتی تحریک اس لئے شروع کی گئی کہ ہندوستان کے رگ و ریشہ سے مغل ایمپائر کے عہد کے "فاسد خون" کو نچوڑ کر پھینک دیا جائے اور فرنگ کی تازہ کاریاں رگ رگ میں دوڑ جائیں یہ تحریک بہ ہر نوع چلتی رہتی لیکن ۱۹۲۸ء کی تحریک ترک موالات کے سلسلے میں جو ہندو مسلم اتحاد کے مبارک مناظر دیکھنے میں آئے انہیں

سب سے عظیم الشان منظر ایک یہ بھی تھا کہ قومی پلیٹ فارم پر مہاتما جی تک اُردو میں تقریر کرتے نظر آئے اس کی وجہ محض یہ تھی کہ تحریک کا مرکز اور تمام زور یو پی میں تھا اور یہاں کا کام کرنے والا جہاں جاتا تھا اس کی ہمہ گیر زبان تمام فضا پر چھا جاتی تھی۔ کیونکہ وہ نہ صرف ایک اچھی اور میٹھی زبان ہے بلکہ اپنا نو زائیدہ کلچر رکھتی ہے۔ اس کے بعد جو ہوا بلیٹی توسین ہی دوسرا تھا۔ وہ مقدس ہاتھ جنہوں نے متحدہ قومیت کا مندر اپنا خون پسینہ ایک کرکے تعمیر کیا تھا بھیڑیوں کی طرح سے امن و اتحاد کی دیوی کی بوٹیاں نوچنے لگے۔ ادہر مسلمان سیاسات سے علیحدہ ہو گئے انہدام خلافت کے بعد کرتے بھی کیا' برادران وطن چونکے تو پھر نہ سوئے اور آج تک نہیں سوئے جاگے تو کیوں سوئیں؟ آل انڈیا نیشنل کانگرس میں جہاں فارسی رسم الخط اور ناگری حروف دوش بدوش نظر آتے تھے۔ مسلمانوں کی اجتماعی علیحدگی نے جہاں اور نقصانات کئے وہاں فارسی رسم الخط اور اُردو سے جو عالمگیر رغبت پیدا ہو گئی تھی وہ بھی رخصت ہو گئی جب اُسکے نام لیوا ہی باقی نہیں رہے تو اسکی کیا ضرورت باقی رہ گئی تھی۔ سے

یہ بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی — جو بڑھکر خود اٹھالے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

تاریخ شاہد ہے اور کیونکہ حالیہ تاریخ ہے اس لئے ہمارے حافظہ سے محفوظ کئے ہوئے ہیں' کہ ہر تحریک آزادی کے بعد بعض ایسی "تعمیری" تحریکیں شروع کی جاتی ہیں جو تحریکات کے علمبرداروں کے خیال میں تو تعمیری ہوتی ہے لیکن دراصل انکے اجراء کا نتیجہ نہایت خوفناک تخریب کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔
نان کوآپریشن کے بعد شدھی اور سنگھٹن اور تبلیغ کی تحریک نے ملک کی جو فضا خراب کی تو آج تک ملک اس کے اثرات سے آزاد نہیں ہوا بلکہ گہرا رنگ ہوتا جاتا ہے جسکے بعد گو اس کا اڑجانا بھی یقین ہے لیکن فی الحال تو فضا اس رنگ سے خون ریز ہے تازہ تحریکات آزادی کے بعد' بعض تحریکات کو فروغ دیا گیا جن میں سے اُردو ہندی کی تحریک بھی ہے جو میرے خیال سے نہایت عظیم سیاسی خدشات اپنے اندر پوشیدہ رکھتی ہے۔ اس مختصر شذرہ میں مجھے مسئلہ کے افادی وغیر افادی پہلو سے گفتگو نہیں کرنی ہے اور نہ میری پوزیشن جج کی ہے کہ قول فیصل پیش کروں' مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ اس مسئلہ کو ہندو مسلم مسئلہ بنا کر جو خطرناک رنگ دیا جا رہا ہے وہ نہایت ناعاقبت اندیشی اور ملک دشمنی ہے' پھر اس کے ساتھ مسلمانوں کے ان خیالات کی ضمنی ترجمانی بھی کر دینی ہے کہ وہ رسم الخط اور زبان کے مسئلہ میں کیا خیالات رکھتے ہیں اور ان کو کیا کیا خدشات اسی باب میں ہیں اور سب سے مبارک اور عظیم اس صورت حال کو واضح طور پر بیان کر دینا ہے کہ اردو اور فارسی رسم الخط سے صرف مسلمانوں ہی کی وابستگی نہیں ہے بلکہ جن صوبوں میں یعنی یو پی پنجاب وغیرہ میں یہ زبان بولی اور سمجھی جاتی ہے وہاں صرف مسلمان ہی نہیں بستے ہیں بلکہ برادران وطن بھی آباد ہیں اور وہ بھی اُردو ہی بولتے اور لکھتے ہیں۔ کوئی اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ اُردو تین چوتھائی ہندوستان کی زبان ہے۔ مسئلہ پر گفتگو کرنے کے لئے ہمیں ماضی کی تاریخ کے کچھ اوراق اُلٹنے ہونگے کوئی شک نہیں کہ جب مسلمان ہندوستان میں حکمران تھے تو بہ حیثیت رعایا ہندوستان کی قومیں اُنکے کلچر' انکی زبان' اور ان کے ادب سے غیر شعوری طور پر متاثر ہوئیں غیر شعوری کا لفظ میں نے عمداً اسلئے استعمال کیا کہ میری رائے میں شیوا جی سے بھی پہلے مغل سب سے اول "نیشلسٹ" (قوم پرست) تھے جنکی تاریخ اعمال بتاتی ہے کہ وہ ہندوستان کو اپنا محکوم نہیں سمجھتے تھے بلکہ اکبر و جہانگیر اور شاہجہاں نے ہندوستان کو واقعی طور پر "جنم بھومی" کی حیثیت دی۔ وہ جسطرح ماں کی ہر ایک چیز بچہ کو پیاری ہوتی ہے اسی طرح ان بھارت کے پجاریوں کو آریہ ورت کی زبان' کلچر' لٹریچر' اور دوسری چیزوں سے محبت تھی۔ یہ حاکمیت تھی کہ فارسی ملک پر چھا گئی تھی مگر یہ محبت تھی کہ بھاشا اُنکو دل و جان سے پیاری تھی یہی نہیں وہ ہندی رنگ میں شرابور ہو گئے تھے۔ آخری دور میں اگر مغل امپائر کی باگ ڈور دارا شکوہ کے ہاتھ میں آجاتی تو نقشہ ہی دوسرا ہوتا اور اس وقت ہم "متحدہ ہندوستان" میں امن و امان سے جی رہے ہوتے ہی نہیں بلکہ "ایک قوم" ہوتے۔ پھر بھی شاہجہاں کے عہد تک جو کوششیں ہم کو نظر آتی ہیں ان میں سے مہتم بالشان تحریک "زبان" کی ہے جس کو آج ہم اُردو کے نام سے پکارتے ہیں اور جس کو میرے خیال سے ہندوستان کے منحوس اشتیتوں کی ناپاک اور سامعہ خراش "ہندو چائے" اور "اسلامی پانی" کی طرح سے "اسلامی زبان" کہہ کر پکار کر تاریخ اور اُسکی نوعیت تخلیق کو جھٹلاتا ہے' اُردو کی بنیاد میں خالص "نیشلزم" کی روح ہے۔ اور وہ متحدہ ضرورت ہی کی بنا پر پیدا ہوئی' اس وقت مجھے اُسکی عہد بہ عہد تاریخ کو دہرانا مقصود نہیں ہے بلکہ یہ ماتم کرنا ہے کہ خود غرضوں نے معاملہ کو غلط ملط کرکے کیا سے کیا بنا دیا ہے' اور وہ لوگ جو زبان کے مسئلہ کو بھی فرقہ وارانہ حیثیت دینا چاہتے ہیں اور دے رہے ہیں وہ کتنا بڑا گناہ کر رہے ہیں۔ (باقی۔ باقی)

ساغر (نظامی)

سلہ (معیہ عہد کے ہندی شعرا) یہ بات لحاظ کے قابل ہے کہ یہ سب زمانہ مغلیہ فرمانرواؤں کا ہے جس کے بعد مغلیہ دربار کا نام باقی تھا۔ یعنی [illegible] کے صرف ۲۵ برس بعد یعنی [illegible] میں لاڈ لیک آیا اور مغل بادشاہ کو پینشن پانے والا بنا دیا۔ [illegible] میں [illegible] ہندی شعرا کے خاتمہ کی تاریخ خیال کی جاتی ہے اور یہی نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ جب مغل دربار ختم ہوتا ہے تو ادھر ہندی شاعری ختم ہوتی ہے مغلوں کے بعد انگریزوں کا تسلط شروع ہوتا ہے اور اس جدید [illegible] کے دوران میں آج [illegible] ۱۹۴۵ء تک اس [illegible] کی سرپرستی میں ہندی [illegible] کے جو کچھ [illegible] اس کے جاننے کا ہم کو اشتیاق رہ گیا تاکہ مغلوں کے زمانے اور ان کی ہندی شاعری اور ادب کی ترقی کے حالات سے موازنہ اور مقابلہ ہو سکے لیکن ہم کو یقین ہے کہ [illegible] میں یہ بھی دکھایا جا سکے گا کہ ہندی شاعری اور ہندی ادب کی سرپرستی و ترقی کا سہرا مسلمان فرمانرواؤں کے ہی سر ہے [illegible] تک کے ہندی شعراء ملاحظہ ہوں:۔ [illegible]

ایشیا اقوامِ مشرق کی زندگی کے ہر رُخ کا ترجمان ہے

مجھے خوشی ہے کہ ایشیا ہندوستان کے ہر طبقہ و ہر گوشہ میں مقبول ہو رہا ہے تنقیدیں بھی ہمت افزا ہیں۔ دراصل پہلے دو پرچے میری آرزوؤں کے مطابق نکلے ہی نہیں "مشترک نمبر" میری کاوشوں کا ایک ادنیٰ سا نمونہ ہے اور اب میں اپنی صحت کو بھی اس قابل پاتا ہوں کہ ایشیا کے لئے کافی وقت دے سکوں۔ مجھے یقین ہے کہ ایشیا کی آئندہ اشاعتیں بہ بلند تر ہو کر ملک کے سامنے پیش ہونگی۔

بعض احباب نے گزشتہ دو اشاعتوں کی خامیوں سے مجھے آگاہ کیا ہے میں ان کا شکر گزار ہوں۔ میں کوشش کروں گا کہ حتی الوسع رسالہ کو مقبول عام بناؤں لیکن اسی سلسلہ میں مجھے چند ایسی تحریروں کا ذکر بھی کرنا ہے جو لاہور اور دہلی کے انگریزی اخبارات میں شایع ہوئی ہیں جن میں ایشیا پر تنقید کے علاوہ میری شاعری اور میرے افکار پر زیادہ روشنی ڈالی گئی ہے۔ صاحبِ تنقید میرے ایک دوست ضیاء الاسلام ہیں۔ میری شاعری میرے مجموعۂ کلام کے نام (بادۂ مشرق) اور میرے افکار پر جو اعتراضات ہیں، ان کی صفائی مجھے پیش کرنے کی ضرورت نہیں البتہ ایشیا کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے اس پر اظہار خیال میں ضروری سمجھتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ دونوں گزشتہ اشاعتوں کی ترتیب و تدوین ایسی حالت میں ہوئی جب میں زندگی سے دور اور موت کے قریب تھا پھر بھی ادبی اور علمی مواد انہیں پیش کیا جا سکا اس میں اردو جرنلزم کے لئے کافی سے زیادہ انقلابی پیغام تھا رہا یہ سوال کہ ایشیا ادبی پرچہ ہے یا سیاسی، اس کا جواب صاف ہے ایشیا مشرقی اقوام کی زندگی کے ہر رُخ کا ترجمان ہے۔ میں یہ نوٹ لکھ ہی رہا تھا کہ ایڈیٹر نیرنگ خیال لاہور کا مکتوب مجھے ملا ہر چند کہ اس میں میری بیجا مدح سرائی ہے جس کو میں قبول کیا پسند بھی نہیں کرتا میرا یقین ہے کہ اس قسم کی ستائش انسانی دماغ کو غیر متوازن کر دیتی ہے لیکن محض اس اندیشہ سے کہ موضوع کی جزئیات میں داخل ہو کر میں کوئی لغزش نہ کر بیٹھوں اور اس خیال سے بھی کہ ایشیا اور اپنی ذات کے متعلق خود میری رائے "حماقت" سے زیادہ درجہ نہیں رکھ سکتی۔ میں وہ مکتوب ہی شایع کئے دیتا ہوں جو فرید صاحب جعفری نے مسٹر ضیاء الاسلام کے ریویو سے متاثر ہو کر مجھے لکھا ہے۔

(مکتوب فرید)

ایشیا کے متعلق ایک ریویو مجھے دکھایا گیا جو غالباً بیک وقت ایسٹرن ٹائمز لاہور اور ہندوستان ٹائمز دہلی میں شایع ہوا ہے احباب نے میری رائے دریافت کی اور جب انہیں میرے خیالات کا علم ہو گیا تو اصرار کرنا شروع کیا کہ میں جو کچھ لکھوں میرے نزدیک تو ایسی تحریروں کا جواب یہی ہے کہ خموشی اختیار کر لی جائے مگر تمہیں نہیں معلوم کہ لاہور کے ارباب علم تمہارے کس قدر پرستار ہیں انہوں نے مجھ سے کہا کہ مذکورہ تنقیدوں میں صوبہ جاتی ذہنیت پیش کی گئی ہے اس لئے میں ضرور کچھ لکھوں۔ بدقسمتی یا خوش قسمتی سے میں یہاں پنجاب میں "مزہبا" اردو" سمجھا جاتا ہوں ورنہ پوچھو تو اردو کی فلاح و بہبود کے لئے اور استحکام کی خاطر میں ہر قسم کے تعصب سے بیزار ہوں۔ ایشیا کے متعلق میں نیرنگ خیال میں اظہار رائے کر چکا ہوں مگر وہ رسمی چیز تھی۔ ایک مخلص دوست کی حیثیت سے میں تمہیں براہ راست بھی لکھ دینا چاہتا ہوں۔

کہ ایشیا میرے نزدیک اپنے رنگ کا انوکھا رسالہ ہے "الہلال" مرحوم کے بعد سے برابر ضرورت محسوس کی جاتی رہی کہ قوم کے ہاتھ میں ایک ایسا آرگن ہو جس کے ذریعہ وہ حسیات خفتہ کو بیدار کر سکے مجھے خوشی ہے کہ ایشیا سے قوم کی یہ ضرورت کما حقہٗ پوری ہو جاتی ہے تمہارے جوان ولولوں نے ایک عجیب و غریب مواد جمع کر دیا ہے۔ پہلا پرچہ "نقشِ اول" سہی مگر "قوم کی حیاتِ نو" کی ایک مکمل تصویر معلوم ہوتا تھا مجھے مسٹر ضیاء الاسلام کا وہ ریویو دیکھ کر رنج ہوا اس لئے نہیں کہ میرے ایک دوست کے مساعی کو نہیں سراہا گیا بلکہ اس لئے کہ حوادث کے تیز و تند جھونکوں کے باوجود قوم میں تعمیری جذبات ابتک نہ پیدا ہو سکے۔ ہم تعمیر تو جانتے ہی نہیں اول تو حرکت ہی ہمارے لئے غیر اختیاری چیز ہے پھر اگر کبھی ذرا جھرجھری پیدا ہوئی تو "تخریب" کے لئے سرگرم عمل ہوتے ہیں۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ پنجاب کے ادیب تمہارے قدردان ہیں اور نہ صرف قدردان بلکہ تمہیں "نئے ہندوستان" اور عصر حاضر کا کامیاب ترین ترجمان سمجھتے ہیں تمہارا زندہ کلام ابتک بریڈلاہال کی فضاؤں میں گونج رہا ہے اور بیس ہزار کا وہ مجمع جس نے مسٹر جنی دیوی کے زیر صدارت تمہارے آتشیں نغمات سُنے تھے۔ آج بھی تمہارے لئے بیتاب ہے۔

پنجاب کے ادباء و شعراء فہیم اور ذکی ہیں اور وہ صوبہ جاتی تعصب سے سخت نفرت کرتے ہیں میں نے اکثر حضرات کو یہ "بانگ دہل" کہتے سنا ہے کہ اردو اگر دوسری زبانوں کے مقابلہ میں زندہ رہ سکتی ہے تو اردو کو مرکز کے حدود سے نکلنا ہوگا اور سارے ہندوستان کی قومی زبان بنکر پیش ہونا پڑے گا دوسری طرف میں تمہارے خیالات بھی جانتا ہوں تمہیں یاد ہوگا کہ تم نے ایک مرتبہ خود مجھے قائل کرتے ہوئے کہا تھا کہ پنجاب میں حیات ہے اور اہل پنجاب سراپا بیباکی ہیں اس لئے ان کی قدر کرنی چاہیئے" ایک موقع پر تم نے یہ بھی کہا تھا کہ "یقینی اقبال دنیا کا بہت بڑا فلسفی شاعر ہے اور پین اسلامزم کا دل سے علمبردار لیکن ہندوستان کی جنگ آزادی کیلئے وہ نیور جب کا چارپایہ تیئیں نہ چھیڑ سکے کیونکہ اس کی ذمہ وار وہ غلط ذہنیت ہے جو شمالی ہندوستان کے اس حصہ پر طاری ہو رہی ہے —— پھر مجھے تعجب ہے کہ مسٹر اسلام نے تمہیں کیوں غلط سمجھا، اور تمہارے کلام اور رسالہ کو دیکھکر یہ نتیجہ کیوں نکال لیا کہ تم اقبال کے رقیب کی حیثیت سے ملک میں اپنی آواز پھیلا رہے ہو شاید تم نے وہ ریویو نہ دیکھا ہو اس لئے میں تمہیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ مسٹر اسلام نے تمہارا اور اقبال کا ذکر کرتے ہوئے مختلف موقعوں پر لکھا ہے۔ ــ

(۱) ساغر نظامی جدید اردو شعراء میں بلند درجہ رکھتے ہیں لیکن اُن کو اقبال کی طرح "مفکر سیاسی" سمجھنا غلطی ہے۔

(۲) ساغر نے نظموں کی ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام "بادۂ مشرق" ہے وہ غالباً جانتے ہیں کہ "پیامِ مشرق" مجموعۂ کلام اقبال مشہور و معروف تصنیف ہے اسی طرح کا نام رکھنا خطرہ سے خالی نہیں۔ ساغر اچھے شاعر ہیں لیکن عوام ساغر کو اقبال کا ہم پایہ کبھی نہیں سمجھیں گے۔

ساغر تم طبعی طور پر کتنے ہی معصوم کیوں نہ ہو لیکن اس قسم کی باتیں "نوجوان ہندوستان" کو چڑھانے کے لئے کہی جاتی ہیں۔ مسٹر ضیاء اسلام کا اخباری مطالعہ اگر وسیع ہوتا تو وہ یقینی یہ سمجھتے کہ اب زمانہ بہت آگے نکل گیا ہے ایک وقت تھا کہ موپاساں اور ٹالسٹائی کی پرستش ہوتی تھی مگر آج زمانہ چیخوف کو بھی نہیں پڑھنا چاہتا۔ جب خالص گروہ بندیوں کا زمانہ تھا اس وقت دستر روسو اور ٹالسٹائی موپاساں اور برگساں ہی پڑھے جاتے تھے اور اس وقت کی تبدیلی و تحریکات میں ان کے پیغامات سے کام لیا جاتا تھا اس کے بعد شخصی ذاتی اور ذہنی آزادی کے داعیوں میں گورکی اُس وقت لینن اور چیخوف پسند کئے گئے لیکن آج زمانہ بہت بلند چیز کا طالب ہے۔ مسٹر ضیاء اسلام کے رجحانات ذہنی بہت محدود

ابی سینیا

(سید محمد یحییٰ میرٹھی)



نقشہ ابی سینیا

جغرافیائی محل وقوع

تا ایک براعظم یعنی افریقہ کے شمالی مشرقی گوشہ میں جہاں تنگنائے باب المندب براعظم ایشیا کو جدا کرتی ہے خط استوا سے متصل زمین کا ایک ٹکڑا جس کے سینہ پر پہاڑ اور جنگلات کے سلسلے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ملک ابی سینیا کے نام سے موسوم ہے۔ اس کا صحیح محل وقوع ۲° و ۱۵° عرض البلد اور ۴۸° و ۳۲° طول البلد کے درمیان ہے۔ اس کے شمال میں بحر احمر، سوڈان، مغرب میں انگریزی مصری سوڈان جنوب میں کینیا کی نوآبادی، اور اطالوی سمالی لینڈ کا جنوبی حصہ اور مشرق میں فرانسیسی سمالی لینڈ اطالوی سمالی لینڈ اور برطانوی سمالی لینڈ واقع ہیں۔ ابی سینیا کی طبعی حالت یہ ہے

کہ اس ملک کا چپہ چپہ پہاڑوں۔ گھنے جنگلوں اور ہولناک وادیوں دلدلوں سے بھرا پڑا ہے۔ جھیلیں بھی بکثرت پائی جاتی ہیں۔ آب و ہوا مرطوب و صحت کے لئے غیر مفید ہے۔ ملک کا رقبہ ۳۵ لاکھ مربع میل ہے۔

باشندے

لفظ ابی سینیا کے معنی مخلوط کے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں کے باشندے مخلوط النسل ہیں یہی وجہ ہے کہ ابی سینیا کے حبشی لوگ ملک کو ایتھوپیا کے نام سے پکارتے ہیں۔ ایتھوپیا یونانیوں کے نزدیک دو لفظوں سے مرکب ہے جس کے معنی "سیاہ چہرے والا" ہے۔ یہی لفظ بگڑ کر ابی سینیا بن گیا۔ اس ملک کی ابتک مردم شماری نہیں لی گئی ہے

کے مجموعی آبادی کا اندازہ قطعاً صحیح نہیں بتایا جا سکتا۔ لیکن عام طور پر ایک کروڑ کی آبادی مانی جاتی ہے۔ اس میں۔ ایک لاکھ تیس ہزار نفوس خاص عدیس ابابا (دارالسلطنت) میں آباد ہیں۔ ابی سینیا کی مختلف نسلوں کی کوئی مستند تحقیقات موجود نہیں ہے۔ تورات وانجیل میں حبشہ (ابی سینیا) کو حضرت نوح کے پوتے کا آباد کردہ لکھا ہے۔ حضرت نوح کے بیٹے حام کے چار لڑکے تھے (۱) کنعان (۲) مصر (۳) سوڈان (۴) حبش اس لحاظ سے ابی سینیا حبش کا آباد کیا ہوا ہے۔ بہرکیف حقیقت کچھ بھی ہو یہ واقعہ ہے کہ باشندوں کی اصلیت تاریکی میں ہے۔ اور موجودہ باشندے بیرونی فاتحین اور باہمی مناکحت کی وجہ سے مخلوط النسل ہیں جس کی وجہ سے ابی سینیا کی سیاست میں مشکلات پیدا ہوتی رہتی ہیں بالعموم باشندوں کو تین اہم گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ (۱) امحرہ (۲) غالی (۳) سمالی اور دناکلی امحرہ سامی نسل سے ہیں کیونکہ ان کا رنگ نگروں کے مقابلے میں زیادہ زرد ہوتا ہے اور خدوخال بھی سامی نسل سے ملتے جلتے ہیں اور ممکن ہے کہ ابتدا میں جنوبی عرب سے نقل وحرکت کرکے اس ملک میں داخل ہوئے ہوں۔ امحرہ نسل آج کل حکمران طبقہ ہے اور ابی سینیا کے باشندوں کا اطلاق بالعموم انہیں لوگوں پر ہوتا ہے۔ ان کی زبان امحری ابی سینیا کی مستند زبان ہے اور مجموعی آبادی میں ان کی تعداد ۲۵ لاکھ ہے۔ دوسرا گروہ غالی قبیلہ کا ہے جو حامی نسل سے ہیں اور تعداد میں سب سے زیادہ ہیں ان کی مجموعی تعداد ۴۰ لاکھ ہے۔ اس ملک میں ان کا ورود جنوب کی سمت سے ۶ صدی عیسوی میں ہوا۔ تیسری نسل سمالی اور دناکلیوں کی ہے یہ لوگ بھی حامی نسل سے ہیں۔ بے حد وحشی خونخوار تہذیب وتمدن سے بالکل ناآشنا بالکل مختلف زبان بولنے والے۔ زیادہ مشرق اور شمال مشرق میں آباد ہیں۔ امحرہ لوگوں کا مذہب کلیسائے یونان کے مطابق عیسائی ہے غالی، دناکلی اور سمالی قبیلوں کے لوگ مسلمان ہیں۔

اقتصادی حالت

ابی سینیا کم وبیش اپنی ضروریات کو خود پورا کر لیتا ہے۔ شمالی حصہ زرخیز ہے اچھی چراگاہیں اور قابل زراعت زمین موجود ہے۔ گیہوں، جو اور کافی کی کاشت زیادہ تر کی جاتی ہے ربر بھی اچھی خاصی مقدار میں پایا جاتا ہے۔ بعض مقامات پر روئی کی کاشت کی جاتی ہے۔ باہر والوں کی تجارت بہت کم ہے۔ روئی سے تیار کی ہوئی چیزوں کی درآمد ہوتی ہے اور تجارت کا بڑا حصہ جاپان کے ہاتھ میں ہے۔ برآمد کی خاص چیزیں کافی اور خام کھال ہے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ابی سینیا تمام دنیا میں سب سے زیادہ معدنیات کا مخزن ہے لیکن یہ بات ہنوز پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچی پوٹاش، سونا اور پلاٹینم تھوڑی مقدار میں برآمد ہوا ہے۔ ابی سینیا میں قومی قرضہ بالکل نہیں۔ صرف اس سال سامان حرب خریدنے کے لئے پہلی مرتبہ عام ٹیکس لگایا گیا ہے۔ تمام ملک میں صرف ایک بنک ہے جس کو بنک آف ایتھوپیا کہتے ہیں۔

طرزِ حکومت

ابی سینیا میں خود مختار شخصی حکومت ہے جو جاگیرداری سسٹم پر مسلط ہے مختلف صوبے اور علیحدہ علیحدہ اضلاع ہنوز خود مختار جاگیرداروں کے قبضہ اور تصرف میں ہیں ان جاگیرداروں کو "راس" کے لقب سے پکارا جاتا ہے لیکن جب تمام ابی سینیا کا مشترکہ معاملہ پیش آتا ہے تو شہنشاہ حبشہ واحد ڈکٹیٹر تسلیم کیا جاتا ہے۔ شہنشاہ کی جانب سے صوبوں میں گورنر بھی مقرر کئے جاتے ہیں جو جاگیرداروں کی نگرانی کرتے ہیں۔ موجودہ شہنشاہ نے دستور آئینی کو جمہوری طرز پر لانے کی کوشش کی ہے حال ہی میں اس نے پارلیمنٹ قائم کی ہے اور جنگ، تجارت، مالیات وغیرہ کے لئے علیحدہ علیحدہ وزرا مقرر کئے ہیں۔ لیکن شہنشاہ ہنوز شعبۂ تنفیذ کا افسر اعلےٰ ہے۔ خود مختار صوبہ داروں کے علاوہ ملک میں پادریوں کا ایک زبردست طبقہ موجود ہے۔ یہ لوگ بے انتہا قدامت پسند ہیں لیکن ملک میں ان کا اثر واقتدار بہت زیادہ ہے۔

ابی سینیا کی تاریخ

ابی سینیا کی قدیم تاریخ بہت دلچسپ ہے۔ دنیا کی تاریخ جب سے سپرد قلم ہونی شروع ہوئی ہے اس وقت تک اس ملک میں بادشاہوں اور وسیع سلطنتوں کا سراغ ملتا ہے۔ حضرت سلیمان اور ملکۂ سبا بلقیس کا پرلطف رومان آج تک ہمارے لئے فردوس گوش ہے۔ ملک کی ادبیات ہزاروں داستانوں سے بھری پڑی ہیں۔ توت غنخ کے زمانہ میں مصر وحبشہ کے تعلقات نہایت اچھے تھے۔ مصر دارالخلافہ تھا بطالتہ کے عہد میں یونانی باشندے ابی سینیا میں داخل ہوئے اور اس کو اپنا وطن بنا لیا۔ وہاں ایک یونانی کتبہ ہے جس میں لکھا ہے کہ اہراتا سی نے قبیلہ بوغوی پر غلبہ پایا اور مریخ وزہرہ کے لئے قربانی کی۔ شہر اکسم قدیم زمانہ سے ہی حبشہ کا دارالخلافہ چلا آتا ہے۔ اسی دارالخلافہ میں ابی سینیا کی سب سے بڑی سلطنت پہلی صدی عیسوی سے لیکر ساتویں صدی عیسوی تک قائم رہی۔ اس دوران میں ایک پادری مسمی فرومنٹیس نے عیسائیت کو اس ملک میں پھیلایا اور یہاں کا شہنشاہ عیسائی ہوگیا۔

چھٹی صدی عیسوی میں جسٹنین (Justinian) شہنشاہ قسطنطنیہ نے حبشہ کے بادشاہ کو حکم دیا کہ وہ ملک یمن کو فتح کرے چنانچہ ایسا ہی ہوا لیکن یمن پر حبشیوں کا تسلط کچھ زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکا۔ مسلمانوں کی فتوحات کی بے پناہ موج نے ان کو یہاں سے نکال باہر کیا۔ اس وقت سے مغربی استعماری ریشہ دوانیوں تک حبشہ کی تاریخ بالکل تاریکی میں رہی۔ امحرہ، شوعا اور ٹاگرے کے سردار وقتاً فوقتاً باہمی جدال وقتال کرتے رہے حتیٰ کہ مغرب نے کروٹ لی اور افریقہ اس کی استعماریت کا شکارگاہ بن گیا۔

ابی سینیا کی موجودہ تاریخ میں تین نام بہت مشہور ہیں (۱) تھیوڈور (۲) منلک اور (۳) موجودہ شہنشاہ راس تفاری میکونن۔ مرکزی حکومت قائم کرنے کی بنیاد تھیوڈور نے ڈالی تھی اور وہ ایک حد تک اس میں کامیاب بھی ہوا۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد پاگل ہوکر مر گیا۔ اس کے بعد منلک نے زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لی اور بہت کوششوں کے بعد تمام ابی سینیا کو اپنے تحت میں کر لیا۔ اس بادشاہ کے عہد حکومت کا اہم ترین کارنامہ یہ تھا کہ اس نے سنہ ۱۸۹۶ء میں مقام اڈوا پر اٹلی کو شکست فاش دی۔ منلک کے انتقال پر سنہ ۱۹۱۳ء میں ملکہ زاڈیٹو کو تخت ملا اور راس تفاری بحیثیت مشیر سلطنت اصل حکمران تھا اس ملکہ کے انتقال پر سنہ ۱۹۳۰ء میں حبشہ کا موجودہ شہنشاہ "ہیل سلاسی" معروف بہ راس تفاری میکونن باقاعدہ تخت نشین ہوا۔

ممالک غیر سے تعلقات

انیسویں صدی میں یورپ درندوں کی طرح افریقہ میں نو آبادیات قائم کرنے میں مصروف ہوا۔ اگرچہ ابی سینیا غیر معروف اور دشوار گزار ملک تھا لیکن مغربی پنجہ ستم سے محفوظ نہ رہ سکا۔ اس وقت جبکہ یہ ملک اپنی خانہ جنگیوں میں لگا ہوا تھا برطانیہ فرانس اور اٹلی نے موقع پاکر اس کے ساحلی حصوں پر قبضہ کرلیا اور اس کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ یہاں کے بادشاہ کو مجبوراً مصالحت کرنی پڑی اور برطانیہ سے معاہدہ کرلیا جس کی ایک وجہ یہ تھی کہ برطانیہ ابی سینیا کے شمالی ساحل کی حفاظت کرے گا۔ اٹلی اس معاہدہ کو ٹھکراتے ہوئے اس شمالی حصہ کو جس کو ایری ٹریا کہتے ہیں دبا بیٹھا بعد ازاں منلک کے دور حکومت میں برطانیہ کو یہ حق دیدیا گیا کہ جھیل ٹانا یا ان دریاؤں کے متعلق جو نیل میں گرتے ہیں اگر کوئی اسکیم بنائی جائے گی تو برطانیہ کا حق سب پر فائق ہوگا۔ ۱۹۰۶ء میں برطانیہ، فرانس اور اٹلی نے باہمی میثاق مرتب کیا جس کی رو سے ابی سینیا کے ٹکڑے کردئے گئے اور ہر ٹکڑا ان تینوں حکومتوں کے زیر اثر تقسیم کردیا گیا اور یہ بھی طے کردیا کہ اپنے اپنے زیر اثر حصے میں ان تینوں طاقتوں کو ریلوے اور سڑکیں بنانے کا حق ہوگا۔ لیکن ابی سینیا نے اس معاہدہ کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا اس وجہ سے یہ اسکیم بار آور نہ ہوسکی۔ باایں ہمہ برطانیہ اور اٹلی اپنے مطالبات کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرتے رہے۔ لیکن فرانس ان کی ریشہ دوانیوں میں مخل ہوا۔ بالآخر ابی سینیا نے اس کے خلاف انجمن اقوام میں احتجاج کیا اور یہ سرگرمیاں بند ہوگئیں۔

موجودہ نزاع کے اسباب

اصل سبب جس کی وجہ سے آج اٹلی ابی سینیا پر چڑھائی کر رہا ہے یورپ کی استعماری ہوسناکیوں میں مضمر ہے۔ درحقیقت اٹلی چاہتا ہے کہ اطالوی سمالی لینڈ کو زرخیز بنانے کی خاطر دریائے دیبی شبلی پر قبضہ کرے جس کا منبع ابی سینیا میں ہے دوسری وجہ اقتصادی ہے۔ اٹلی کا موجودہ ڈکٹیٹر اطالوی مصنوعات کے لئے جدید منڈیوں کی تلاش میں ہے اس لئے وہ چاہتا ہے ——— کہ کمزور ابی سینیا کو ذرا دھمکا کر اپنا سیاسی اور اقتصادی تسلط تمام ملک پر قائم کرلے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ انتقامی جذبہ بھی موجزن ہے ۱۸۹۶ء میں اٹلی کو جو شکست فاش ہوئی تھی وہ ہنوز اس کو نہیں بھولا۔ لیکن بہرطور ۹ اکتوبر ۱۹۳۴ء تک دونوں ملکوں میں بظاہر کوئی وجہ مخاصمت نہ تھی اٹلی نے اعلان کیا تھا کہ وہ ابی سینیا پر کسی قسم کی دراز دستی کی نیت نہیں رکھتا۔ لیکن یہ عہد و پیمان بہت جلد تار عنکبوت کی طرح ٹوٹ گیا۔ اور اس کا موجب غالباً وہ دو حملے ہوئے جو یکے بعد دیگرے ۱۹ نومبر ۱۹۳۴ء کو گاندر (شمالی حبشہ) پر اور ۵ دسمبر ۱۹۳۴ء کو حبشہ کی سرحد کے قریب اطالوی سمالی لینڈ پر ہوئے۔ پہلا حملہ اطالوی سفارت خانہ پر ہوا تھا لیکن ۲۷ نومبر ۱۹۳۴ء کو اس کا پُرامن تصفیہ ہوگیا۔ دوسرا حملہ اطالوی سمالی لینڈ میں دلوال کے محافظ فوجی دستہ پر ہوا۔ اطالیہ کی پیشقدمی کے متعلق ۱۶ دسمبر ۱۹۳۴ء کو حبشہ نے انجمن اقوام کے سامنے حسب ذیل الفاظ میں احتجاج کیا۔ "گزشتہ نومبر کی تیئسویں تاریخ کو ایک انگریزی و حبشی کمیشن حبشہ کے صوبہ اگڈن میں مرغزاروں کی تفتیش کر رہی تھی مقام دلوال پر اطالوی فوجی دستہ اس کام میں مزاحم ہوا۔ دلوال اپنے کنوؤں کی وجہ سے ایک اہم سرحدی مقام سمجھا جاتا ہے اور دونوں ممالک اس کی ملکیت کا دعویٰ کرتے ہیں۔ گزشتہ چند سال سے اٹلی اس علاقہ میں اپنی فوجی طاقت بڑھا رہا ہے۔ دلوال، اردوب اور ودڈیر کے علاقے مستحکم کرلئے گئے ہیں۔ حبشہ والوں کا دعویٰ ہے کہ یہ تینوں سرحدی مقامات حبشہ کی حدود کے اندر ہیں۔ اطالوی فوج نے ۵ دسمبر کو بغیر اشتعال تفتیش کمیشن پر ٹینکوں اور ہوائی جہازوں سے حملہ کردیا۔ حبشہ نے اس پر احتجاج کیا۔ لیکن اس کا جواب اٹلی نے یہ دیا کہ تین دن کے بعد فوجی ہوائی جہازوں کے ذریعہ اسی علاقہ کے دو شہروں یعنی اڈووا اور جبرلولوبی پر بم برسائے۔" یہی دو تازہ ترین واقعات ہیں جو دونوں ملکوں کی باہمی آویزش کا بڑا سبب سمجھے جاتے ہیں۔ تمام متمدن دنیا کا متفقہ فیصلہ ہے کہ اٹلی ظالم اور ابی سینیا مظلوم ہے۔

—— :)✻(: ——

آدم

ٹوٹ کر گردوں سے اک ذرہ چلا سوئے زمیں ... وہ کہ تابانی تھی جس کی غازۂ روئے زمیں

آسماں کو چیر کر نکلا ستارے کی طرح ... فرشِ خاکی پر گرا گیں شرارے کی طرح

اس ذرا سے پیکر نوری میں اتنا سوز تھا ... جس کی حدت سے ہر اک ذرہ تپش اندوز تھا

لے اڑی یوں کائنات اس سے حرارت کا اثر ... جس طرح شبنم شعاعِ خور سے حدت کا اثر

تازہ یہ گلزارِ آب اشلہائے غم سے ہے

گرم یہ بازارِ جنسِ ہستی آدم سے ہے

درویش میرٹھی

شامِ رُخصت

(از حضرت جوشؔ ملیح آبادی)

تجھ سے رخصت کی وہ شام اشک افشاں ہائے ہائے
وہ اُداسی وہ فضائے گریہ ساماں ہائے ہائے

وہ مرے سینے میں سیلِ آب و آتش، الاماں!
وہ ترے چہرہ پہ موجِ برق و باراں ہائے ہائے

وہ مری آنکھوں میں سوزِ دل کا پرتو، الاماں
وہ ترے چہرے پر اشکوں سے چراغاں ہائے ہائے

وہ مرے اطوار میں اندازِ سیلِ بے پناہ
وہ تری آواز میں آثارِ طوفاں ہائے ہائے

وہ جُدائی کی ہوا کے تُند جھونکے وائے غم
وہ جوانی کا چراغِ زیرِ داماں ہائے ہائے

اس طرف اُلجھی ہوئی موجِ حیاتِ یک نفس
اُس طرف بکھرے ہوئے گیسوئے تاباں ہائے ہائے

اِس طرف تاریکیٔ شامِ مریضانِ کُہن
اُس طرف آلامِ صبحِ سوگواراں ہائے ہائے

یاں چمکنے ہی پہ برقِ نالۂ درد آفریں
واں برسنے ہی پہ ابرِ چشمِ حیراں ہائے ہائے

یاں ہر اک تارِ نظر زنجیرِ پائے عافیت
واں ہر اک موجِ نفس دیوارِ زنداں ہائے ہائے

یاں لبوں پر جنبشِ آہِ تنک جاں، وانصیب
واں مژہ میں لرزشِ اشکِ گریزاں ہائے ہائے

حسرتِ دیدار یاں ہر آن بے تاب و شدید
فرصتِ نظّارہ یاں پیہم پریشاں ہائے ہائے

یاں لرزتا ساغرِ عزم و ہمّت، الاماں
واں جھجکتی سی نگاہِ فتنہ ساماں ہائے ہائے

یاں کفِ پا چوم لینے کی بجھی سی آرزو
واں بغل گیری کا شرمایا سا ارماں ہائے ہائے

تمتمائے ولولوں کی آگ اور تیری جبیں
سنسناتی آنچ اور میرا گلستاں ہائے ہائے

میں سراپا سازِ عشرت اور رہینِ بزمِ غم
تو مجسّم نازکی اور بارِ حرماں ہائے ہائے

وہ مری نظروں میں کچھ کہنے کی حسرت الاماں
وہ تیری آنکھوں میں کچھ سُننے کا ارماں ہائے ہائے

اللہ اللہ آنکھوں ہی آنکھوں میں یہ کہنا ترا
جوشؔ میرا دل ہوا جاتا ہے ویراں ہائے ہائے

اے فغاں برلب ترنّم، اے خزاں بر کف بہار
جوشؔ تیرے دل کی ویرانی کے قرباں ہائے ہائے

میری ڈائری کے چند ورق

(اختر حسین رائے پوری بی۔ اے)

یہ مضمون بنگلہ ہندی اور اُردو زبان کے نوجوان باکمال ادیب اور ایشیا کے سچے دوست اختر حسین رائے پوری بی۔ اے کا فطری طبعزاد مضمون ہے جو اپریل ۱۹۳۵ء میں ہندی کے مشہور رسالہ "وشوامتر" کلکتہ میں شائع ہو کر تمام ہندی دنیا میں ایک زلزلہ پیدا کر چکا ہے۔ یہاں تک کہ ہندی زبان کے ادیب جلیل اور قومیت متحدہ کے سچے علمبردار پنڈت بنارسی داس ایڈیٹر "وشال بھارت" نے اس کے مطالعہ سے متاثر ہو کر اختر کے لئے یہ قابل رشک رائے ظاہر کی تھی کہ "وہ ہندی زبان کے پانچ چھ بہترین صاحب طرز ادیبوں میں سے ایک ہیں" ہندی زبان کے بعد گجراتی اور مرہٹی میں بھی اس کے تراجم شائع ہوئے اور ہر زبان میں اس کو بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔

اب ایشیا نوازی کے سلسلہ میں سپہر ادب پر مہر نیم روز کی طرح چمکنے والے اختر نے اس کو اُردو زبان میں منتقل کیا ہے اور محض اس لئے کہ اُردو ادب کا افسانوی معیار قائم رہے اور اختر کے افسانوں پر یہ منطبق بھی ہو سکے انہوں نے اس کو بہت کچھ بدل دیا ہے اور باوجودیکہ یہ اسی ہندی مضمون کا ترجمہ ہے تاہم اس میں بجائے خود ایک انفرادیت پائی جاتی ہے۔

یہ کس درجہ کی چیز ہے؟ میں اپنے تاثر کو بہت ہی محدود کرنے کے بعد آزادانہ کہہ سکتا ہوں کہ اُردو زبان میں اس وقت تک یہ طرز اور یہ عمیق تاثرات پیش نہیں ہو سکے، اس کی پہلی وجہ غالباً یہ ہے کہ اُردو زبان میں جس قدر بھی صاحب طرز ادیب ہیں ان میں سے چند کے علاوہ سب ذہنی طور پر مقلد ہیں اور جہاں تک ذاتی تفکر کا تعلق ہے ان میں فکر و عقیدہ کی انفرادیت نہیں پائی جاتی۔ چوٹی کے چند ادیبوں میں سے بعض کو منتخب کرنے کے بعد اس معیار پر اگر پرکھا جائے تو ان کے افسانوں کا اور ان کی ادبیت کا کوئی کلچر اور مقصد نظر نہیں آئے گا۔ بعض کے افسانے یونانی علم الاصنام کا چربہ معلوم ہوتے ہیں بعض عرب کے صحرا و کیلی فورنیا کے میدانوں میں گھوڑے دوڑاتے ہیں اور بعض کیوپڈ و سائکی کے تیروں کے گھائل ہیں۔ لیکن زندگی کی کشمکش کو کسی شخص نے پیش نہیں کیا اس کیلئے غلطی سے اُردو میں بہت کم گنجائش محسوس کی گئی کیونکہ میرا جہاں تک خیال ہے اُردو ناظرین میں ہندی اور بنگالی کی طرح ذہنی انقلاب ہی نہیں ہوا لیکن بہرحال قدیم و جدید کے تازہ افسانوں میں زندگی کی کشمکش بہت زیادہ پائی جاتی ہے اور اختر کا یہ شاہکار ایک عظیم الشان مستقبل کا پتہ دیتے ہوئے ان کے حال کی عظمت کا قصیدہ خواں ہے۔ سدرشن اور پریم چند کے افسانوں میں جو اخلاقی روح پائی جاتی ہے وہ اب ایک ماؤف رگ کی حیثیت رکھتی ہے اور دنیا ذہنی انقلاب اپنی انگلیوں میں تیز نشتر دبائے ہوئے اس رگ میں فصد دینے کے لئے تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ یہ کوئی غیر متوقع انقلاب نہیں ہے۔ مادہ اور روح کے متعلق قدیم نظریات دن بدن مشکوک ہوتے جاتے ہیں اور انسانی سوسائٹی کے عریاں مشاہدات پر آزادی سے غور کرنے والے اس راز کو اچھی طرح سمجھ چکے ہیں کہ انسانی ذہن نے اگر سب سے عظیم گناہ کیا ہے تو وہ مادہ اور روح کے موضوع ہی سے تعلق رکھتا ہے سوسائٹی میں امیر و غریب اور قسمت و اسباب کی تعیین کرنے کے بعد انسانوں کو درجاتی طور پر بانٹ دینا اور دنیا کی تمام زبانوں میں ایسا اخلاقی لٹریچر تیار کر دینا جو صریحاً اس سے دنیا کی تشریح مادی طور پر اس طرح کرے کہ وہ "فانی ہے اور رہنے کی جگہ نہیں ہے" جو یہاں تکلیف اٹھائے گا اس کے لئے جنت بنی ہے اور جو یہاں آرام پائے گا اس کے لئے آسمانوں پر جہنم دہکایا جا رہا ہے" ایک زبردست اور انتہائی فریب ہے۔ تمام اصلاحی و اخلاقی اصولوں کے علمبردار اس تشریح سے مطمئن ہیں کہ فرض انسانیت ادا ہو گیا حالانکہ ہر دن سجدوں، سینکڑوں مندروں اور بے گنتی گرجاؤں کے باوجود آج بھی دنیا جہنم زار بنی ہوئی ہے اور ہندوستان میں جہاں آئے دن ان اخلاقی نظریات کی غلامی کے سلسلہ میں خونریزی ہو رہی ہے۔ سڑا ہوا کھانا خوشی سے کھا لینے والے انسان میری آنکھوں کے سامنے موجود ہیں اور میری آنکھوں کے سامنے وہ قزاق گروہ بھی موجود ہے جو باوجود بافراغت اور پر شکم ہونے کے زیادہ سے زیادہ روپیہ اس تعداد میں ہڑپ لیتا ہے جس تعداد میں وہ کبھی کنگالوں کو روٹیوں کے ٹکڑے بھی نہیں دیتا تو کیا ذی حس اور بادماغ انسانوں کے لئے یہ تمام دنیا یہ قزاقی کی فیکٹری یہ لوٹ کھسوٹ کا کارخانہ اور اس کی "اخلاقی" و "نظریاتی" "زندگی" خود موت نہیں ہے اور کیا اس دبیز ترین پردۂ فریب کو اب دیر تک برداشت کرنے کی گنجائش و تاب ہو سکتی ہے یہ [illegible] کہ مادہ اور [illegible] کی کشمکش اور اس کے تمام پہلوؤں کے متوہم پھوڑے اس درجہ پختہ ہو گئے ہیں کہ وہ بغیر پھوٹے رہ نہیں سکتے۔ میرے دعوی کی تائید میں یہ مضمون پڑھئے کہیں رونے اور کہیں ہنسنے ہی نہیں شاید بعض ایسے مقامات بھی آئیں کہ آپ قہقہہ لگائیں اور اس کے تار میں یکایک آنسوؤں کی لڑی جڑ جائے۔

ساغر

اس عالم بیداری میں جانداروں کے اس اژدہام عظیم میں زندگی کی اس پُر شور روانی میں رہتے ہوئے بھی محسوس ہوتا ہے کہ میں اکیلا ہوں ——— اکیلا، بالکل اکیلا! میری تنہائی اس قیدی سے بھی زیادہ المناک ہے جو ایک چہار دیواری میں بند ہونے کے بعد یہ سوچ رہا ہو کہ اسیروں کے اس انبوہ میں کوئی داد رس مکل آئیگا ——— اور بلا اطلاع اسے ایک کال کوٹھری میں بند کر دیا جائے۔ اس کے ساتھی دنیا کو آواز دینے کے لئے جس بیقراری کا اظہار کرتے ہیں وہ فریاد بھی اس سیہ بخت کیلئے اتنی ہی غیر مبہم ہو جاتی ہے جتنی ہوا کی مسلسل ہچکیاں

میری بے چارگی کو صرف وہ ستارہ سمجھ سکتا ہے جو افق بعید سے بھی یہ سے اس حسرت میں جھلملاتا رہتا ہے کہ اس کی تابانی کو کوئی نگاہ دیکھے اور ہمیشہ کے لئے خیرہ ہو جائے۔

میری زندگی کی طرح آج بھی میں بہت سی غلط عبارتوں کو پڑھ کر تھک چکا ہوں جن کا ماحصل [illegible]۔ اور میری آنکھیں ان دوائیوں کو دیکھ رہی ہیں جو زندگی کے رنگ میں [illegible] کے پیچھے ڈاکٹر خدا سے ملنے چلے جا رہے ہیں۔ صبح شام سے میں بستر پر لیٹا ہوا ہوں اور میری [illegible] کے ساتھ اس الکحل [illegible] ہوئی ہے صبر و سکون کے بجائے یہ لمحات [illegible]

بھی جان لیوا ہو جاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ میری زندگی ایک تشنۂ آب اندھے کنوئیں کی طرح ہے جس میں مشاہدات کے کنکر گرتے ہیں تو 'میں' کی صدائے بازگشت آسمان پر حلقے بنانے لگتی ہے

کئی روز سے سر میں گرانی سی ہے۔ درد تو نہیں ہے لیکن جیسے پارہ کا ایک ایک قطرہ کوئی میرے دماغ پر ٹپکا رہا ہے یا ناخن سے آہستہ آہستہ ٹھوکے دے رہا ہے۔ آج پتہ چلا کہ اس گرانباری کی وجہ کیا ہے۔ میرے کمرے کے سامنے ایک دیسی ہوٹل ہے جس کے تنور میں صبح سے شام تک خمیری روٹیاں سینکی جاتی ہیں۔ نان بائی کے ہاتھ اتنے منجھے ہوئے ہیں کہ وہ گندھے ہوئے آٹے کی ایک خاص مقدار نوچتا ہے لت توے پر ایک خاص مقدار کے ساتھ بجا کر پھر ایک دھماکے کے ساتھ تنور میں ٹھوپ دیتا ہے۔ آٹے کے گولے پر پہلے تین تھپکیاں زور سے اور پھر ایک دھیرے سے! دن میں سترہ سو ساٹھ مرتبہ یہی ڈفلی بجا کرتی ہے اور اب یہ بھیانک راگ پیارو قوال کی نعت کی طرح میرے دماغ کے سونے آسمان میں گڑگڑا تا رہتا ہے۔

شام کو پڑوس کی مسجد سے نکل کر نمازی ثواب کی خانہ پری کے لئے بھٹیار خانہ کے آگے فقیروں کو روٹیاں بانٹا کرتے ہیں۔ اور ثواب و افلاس کی اس کشاکش میں راہ چلنا دشوار ہو جاتا ہے کل میرے ساتھ ایک عبرتناک واقعہ پیش آیا جب میں راہگیروں کے دھکوں سے پتلون کی کریز بچاتا ہوا ہوٹل کے آگے سے گزر رہا تھا تو ایک فقیر نے میرا بازو تھام لیا۔ میری رگِ شرافت پھڑک اٹھی اور میں اسے جھڑکنے ہی والا تھا کہ ــــــ ششدر رہ گیا۔ اس کے ہاتھوں کو لقوہ مار گیا تھا اور وہ گھاس کی طرح تھرتھرا رہے تھے اس کی بغل میں روٹی کے ٹکڑے دبے ہوئے تھے لیکن اتنی سکت نہ تھی کہ خود انہیں کھا سکتا۔ ناک سے رینٹھ بہہ کر ڈاڑھی مونچھ کے بالوں میں لپٹ گئی تھی۔ کیا انسان اتنا بھی بے بس ہو سکتا ہے؟ وہ صرف یہ چاہتا تھا کہ اس کی روٹیاں کوئی اسے ہی کھلا دے۔ جب میں اس کے منہ میں نوالے ڈالنے لگا تو وہ درندوں کی طرح بلبلا کر بغیر چبائے انہیں نگلنے لگا اور اس کی آنکھوں کے آنسو میری انگلیوں پر ٹپکنے لگے۔ وہ انسان تھا اور انسانیت کے ساز سے ہم آہنگ ہو سکتا تھا۔ میرے کچھ ملاقاتی مسجد کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر حیرت و حقارت سے مجھ پر ہنس رہے تھے۔ آہ یہ قدرت اور اس کے بے حس، بیدرد، ڈونگے جانور!

۱۹ جولائی ــــ

آج سیٹھ ــــــ نے میرے شدید احتجاج کے باوجود میلود شریف کر ہی ڈالا۔ میں بھی روشنی بجھا کر برآمدے میں آرام کرسی ڈال کر بیٹھوں گا۔ اور دور ہی سے ذکرِ حبیب سے لذت آشنا ہوں گا۔ فکر ثواب کو میں نے ایک مدتِ دراز کے لئے طاق نسیاں کے سپرد کر دیا ہے اس لئے زندگی کے ان اوقات کو امن و امان سے گزار سکتا ہوں۔

چندن چوک پر ایک مولوی اس آواز سے جو خلاف معمول آج چکنی چپڑی ہو گئی ہے جھوم جھوم کر مولود پڑھ رہا ہے بیچ بیچ میں سامعین کو درود شریف پڑھنے کی ہدایت دے کر خود چائے پینے لگتا ہے۔ اس کے روبرو ایک جریب زمین کا حلقہ کئے جو حاجی جی بیٹھے ہیں وہ آج ہی ریس کورس کا وارا نیارا کر چکے ہیں اور ان وکیل صاحب نے آج ہی ایک سود خوار کی پیروی میں کئی گاڑی بانوں پر قرقی کا وارنٹ نکالا ہے۔ ان کی آنکھیں اشک بار ہیں شاید فرطِ الوہیت ہیں۔ گو کہ ان کے پاس کچھ غیر مقلد بیٹھے یہ سرگوشیاں کر رہے ہیں کہ توندہی کی وجہ سے یہ آنکھیں ہمیشہ بسورتی رہتی ہیں۔ ان سب کے چہرے بقعۂ نور ہیں اور وہ ہمہ تن تجلی زار بنے ہوئے ہیں۔ شیرینی کے لالچ میں فقیر اور قلی اس مجمع کے عقب میں شامل ہو گئے ہیں اور بآہنگِ دہل 'یا نبی سلام علیک' کا ورد کر رہے ہیں۔ ایک لمحہ کے لئے ان کے چہرہ بھی اطمینان اور مسرت سے دمک رہے ہیں۔ کیوں نہیں وہ اس امتیاز کو سمجھتے جو ان کے اور اس سیٹھ کے مابین ہے کیوں

نہیں وہ خوانچہ والا اس ڈاکٹر کا شانہ ہلاتا جواب سراپا جلائے نماز ہو رہا ہے لیکن جس نے اس کے جاں بلب بچہ کو صرف اس وجہ سے دیکھنے سے انکار کر دیا تھا کہ وہ فیس میں چار روپے نہیں دے سکتا تھا۔ وہ قلی جن کی کمائی کا ایک حصہ پولیس کا یہ حولدار چھین لیتا ہے۔ کیوں نہیں اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیتے جو یوں گلا پھاڑ رہا ہے گویا رسولؐ کے نہ ماننے والوں کو کچا چبا جائے گا۔

بندے اور بندہ نواز ایک صف میں کھڑے ہوئے ہیں لیکن ان کے فرق کو میں صاف دیکھ رہا ہوں۔ مگر مجھ سے زیادہ تو ان رنجگروں کو اس تمیز کا احساس ہونا چاہئے تھا۔ لیکن نہیں وہ کچھ نہیں سمجھتے۔ قسمت کے جادو نے ان سب کی آنکھوں پر پردے ڈال دئے ہیں۔

قسمت قسمت قسمت! دن میں کتنی مرتبہ یہ بے معنی لفظ میرے کانوں سے ٹکرایا کرتا ہے۔ غریب اس لئے بھوکا مرتا ہے کہ یہ اس کی قسمت ہے' امیر اس لئے عیش کرتا ہے کہ یہ اس کا نصیب ہے۔ غریب اس لئے عبادت کرتا ہے کہ یہ اس کی قسمت ہے' امیر اس لئے گناہ کرتا ہے کہ یہ اس کا نصیب ہے! واہ ری قسمت اور تیری شعبدہ گری!

۲۷ جولائی ــــ

مر گیا! وہ خبیث مالک مکان آخر مر ہی گیا۔ اگر ہنگامہ کا خوف نہ ہوتا تو میں ضرور اس کے دروازے پر نوبت بجواتا۔

آج اس مکان کا ہر ذرہ مسرور و مطمئن ہے۔ صبح سویرے نیم کے پیڑ پر دو مرغ خوش الحان بیٹھے "گاندھی جی" اور "گاندھی بھاگو" کا تکراری گیت گا رہے ہیں۔ اب مجھے ہر قسم کی موسیقی میں یہی دو گتیں سنائی دیتی ہیں۔

وہ اپنے خون، تھوک اور پیپ میں شرابور چوکھٹ پر مرا پڑا ہے۔ اب تک ایسی روح فرسا موت نظروں سے نہ گزری تھی کہ ہر آدمی اس کی ناپاک لاش کو دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ اس نے مرتے دم تک کسی معالج کو نہ بلایا کہ روپے دینے ہونگے۔ آخری سانس تک اسے کسی تیماردار کی منت کشی منظور نہ تھی، مبادا کچھ خرچ کرنا ہوگا۔ اس نے اپنی بیوا بہن کو ایک کانی کوڑی دینے سے انکار کر دیا۔ وہ اس کی آنکھوں کے آگے طوائف کا پیشہ کرنے لگی مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اس کا اکلوتا بیٹا پان کی دوکان کرنے لگا لیکن اس کا دل نہ پسیجا! اور انجام کار وہ آج مر گیا اور اس کی تمام دولت کا عرق پلا کر بھی کوئی اسے زندہ نہیں کر سکتا۔

لوگ نیلام ہونے والے لاوارث گھوڑے کے ایال، کھر اور پٹھوں کی طرح اس اتری ہوئی کینچلی کے ثواب و عذاب اور روپیوں پیسوں کا حساب لگانے لگے اور سگریٹ کی پھونک اور پان کی پیک کے ساتھ اسے خدا اور اس کے جہنم کے حوالے کر کے رخصت ہو گئے۔ اس لاش کے سرہانے گھڑی کے کانٹے وقت کو اپنی پیٹھ پر بٹھا کر سرعت سے عدم کی طرف بھاگ رہے ہیں۔ ہر منزل پر وہ ایک لمحہ کے لئے رکتے ہیں اور ابدیت کے دروازہ پر دستک دے کر پھر اپنے نامعلوم راستہ کی طرف بے تحاشہ بھاگنے لگتے ہیں اس کی متعفن لاش کو مچھر بھی نہیں چھونا چاہتے۔ اس کے خون میں اپنے ڈنک ڈوب کر وہ تڑپنے لگتے ہیں۔

اس خوشی میں کل میں اپنے دوستوں کو چائے پر بلاؤں گا۔

۴ اگست ــــ

پھر ریل کا سفر! میں ڈرائنگ ماسٹر کے پرکار یا پٹواری کی جریب کی طرح ہمیشہ گردش میں ہوں۔ میں کہاں جا رہا ہوں؟ معلوم نہیں! کیوں جا رہا ہوں؟ نہیں جانتا! ایک شش

ہے جو بے بس مجھے اس شہر خموشاں کی طرف لئے جا رہی ہے۔ گاڑی کی قرأت کی ایک لئے ہے —— چلا چل، چلا چل!

ریل کے ڈبہ کے تقدس کی کچھ انتہا ہے! ہمارے ملک میں یہی ایک جگہ ہے جہاں ذات پات کی قیود ٹوٹتی ہیں، یہیں ہندو مسلم اتحاد کی بیل قومیت کے منڈھے چڑھتی ہے، یہیں جنسی مساوات کا علم بلند ہوتا ہے، یہیں برقعے اٹھتے ہیں، یہیں گھونگھٹ اٹھتے ہیں یہیں دیسی رومان کا آغاز ہوتا ہے! صلوٰۃ بر دیسی ریل۔

پورے ۲۴ گھنٹے گزر گئے اور ان چٹیل میدانوں کو تکتے تکتے آنکھیں آ گئیں میدان مولوی کے سر کی طرح سپاٹ ہیں، درخت اس کے جذبات کی طرح خشک ہیں، ندیاں اس کے احساس کی طرح بے آب ہیں، پشاور سے لیکر کلکتہ اور کلکتہ سے لیکر کراچی تک بے برگ و شجر میدانوں کے سوا کہیں کچھ نہیں۔ بورڈنگ کی زندگی کی طرح یک رنگ و یکساں مٹی کے تودوں کا انبار، ہندوستان جنت نشان کی جمال آفرینی پر نکتہ چیں ہے۔

ماں کا پیٹ چھوٹے سے پیمانے پر ریل کا ڈبہ ہی ہے۔ بھائی بہن مسافروں کی طرح کچھ وقت کے لئے اس میں جمع ہوتے ہیں اور پھر اپنے اپنے اسٹیشن پر اتر کر ہنگامۂ ہستی میں گم ہو جاتے ہیں۔

مادرِ ہند کے اس مختصر سے ایڈیشن میں ہر چیز اپنی جگہ پر دلچسپ ہے۔ دو صاحب بڑی سنجیدگی سے اس مسئلہ پر بحث کر رہے ہیں کہ بنگال کلکتہ کا دارالسلطنت ہے یا کلکتہ بنگال کا! ایک بوہرا تکیہ کے غلاف میں روپیوں کی تھیلی بھر کر اسے سرہانے رکھے ہوئے اسم اعظم پڑھ رہا ہے! ایک سردار جی طرح طرح سے منہ بنا کر اس تیزی سے منتر جپ رہے ہیں۔ گویا ان کے نام خدا گنج کا پروانہ آ چکا۔ اور لالہ جی کا سپوت انہیں دیکھ کر زار و قطار رو رہا ہے۔ لالائن نے اپنے "تھن" اس کے منہ سے لگا دئے لیکن اسے چپ نہ ہونا تھا، وہ بدستور روتا ہی رہا۔ تنگ آ کر ماں نے اسے ڈرانے کے لئے میری طرف اشارہ کر کے کہا "پیتا ہے تو پی، ورنہ ان بابو جی کو دے دوں گی!" —— کیا میں اتنا ہَوّا معلوم ہونے لگا ہوں؟

۵ ستمبر ——

میں اپنے نئے مکان میں اٹھ آیا ہوں۔ ایک ہفتہ کے اندر میرا کمرہ خاک دگر دیں اٹ گیا ہے گویا کسی شاعر کی خوابگاہ میں اس کا دل جل کر خاکستر ہو گیا ہو۔ گناہوں کے بار سے دبے ہوئے بڑھاپے کی طرح میرا پلنگ جھلنگا ہو گیا ہے

نہیں مانتے، لوگ کسی طرح نہیں مانتے۔ سلام علیکم، اور مزاج شریف، سے ناک میں دم آ گیا ہے کہتے کہتے تھک گیا کہ بابا سلامتی کی ضرورت نہیں ہے اور مزاج بہت خراب ہیں لیکن یہ ہیں کہ کسی طرح نہیں مانتے۔

آج ٹھاکر —— سے ملاقات ہوئی۔ بڑے قوم پرست اور روح پرور بزرگ ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی روح بھی کھدر پوش ہوگی۔ اپنی نگرانی میں مکان کی مرمت کرا رہے ہیں۔ صبح سے شام تک بیٹھک میں ڈٹے بیٹھے موٹی عینک کے اندر سے مزدوروں کی کارگزاری کا جائزہ لیا کرتے ہیں۔ آج کئی کسان بقایا ادا کرنے کے لئے زمینداری سے آئے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی بڑی گرمجوشی سے بغلگیر ہوئے اور مسند پر بٹھا لیا۔ اس کے بعد روح و مادّہ کا تنازعہ شروع ہو گیا۔ اگر نپولین اور حیدر علی بیک وقت کئی کام انجام دے سکتے تھے تو یہ حضرت کم از کم کسان، مزدور اور روح کو تو ایک ساتھ بنٹا سکتے ہیں۔

ٹھاکر صاحب، "جی ہاں، آپ جیسے متعصب مادہ پرست کبیر داس کو نہ سمجھ سکیں تو عجب نہیں۔ کہئے تو سنی کا یا، کہ 'مایا' نہ کہیں تو —— ارے بیا کھو، کمبخت ڈیڑھ گھنٹہ دیر سے آ رہا ہے؟۔ اس بچہ کو اسپتال لے گیا تھا تو بھائی کیا ہم نے اسے پیدا کیا ہے۔ منشی جی، آج کی مزدوری کاٹ لیجئے گا —— جی ہاں مولانا روم نے بھی مثنوی شریف میں ایک ہم معنی شعر لکھا ہے.. صاحب عدم تشدد کے اصول پر ٹھنڈے دل سے غور کیجئے یہیں تو انسان و بہائم کا اصل فرق ظاہر ہوتا ہے جسے آپ زندہ نہیں کر سکتے اسے مارنے کا حق —— سنو جی بودہ رام تمہارے ذمہ جو پچھلے سال کا ۱۷ روپیہ تھا وہ سود وغیرہ ملا کر ۳۴ روپئے سوا دس آنہ ہو گیا ہے۔ اگر ۳۴ روپئے ابھی جمع کر دو تو ہم سوا دس آنہ معاف کر دینگے۔ کیا کہا؟ زمین رہن رکھکر —— ایں، تو ہم پر کیا احسان کیا! ماں کی تجہیز و تکفین —— نہ کھاؤ سر ہمارا - - - جی ہاں یہی تو وہ جرمنی والے مولانا بھی کہتے ہیں۔

میرا سر چکرانے لگا، میں بیک بینی و دو گوش نو کدم وہاں سے بھاگ نکلا۔ روح کے ساتھ کسانوں کے مصائب اور عدم تشدد کے ساتھ سرمایہ داروں کے مظالم میں مجھے کوئی خاص ارتباط نظر آنے لگا۔

۱۵ ستمبر ——

میری داخلی دنیا میں عرصہ سے ایک ہنگامہ برپا ہے اور ماحول و شخصیت کا یہ تنازعہ روز بروز بڑھتا جاتا ہے۔ خودی کا احساس مجھے آپ اپنی بیچارگی کا شکار بنا رہا ہے۔

آج بھی وہ آئی اور چلی گئی۔ اس کے لرزۂ تبسم سے میرے گھر کے چراغ جلتے بجھتے رہتے ہیں اور جب وہ دل کی کنڈی ہلا کر ایک ریشمی ڈوپٹے کی طرح لہرا کر آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی ہے تو میرے محبوب کامنی کے پھول ٹوٹ ٹوٹ کر شبنم کے قطروں سے لپٹ جاتے ہیں۔

ہر روز کی طرح آج بھی وہ زندگی کی سیاہی کو تاریک تر بنا کر شب کے اندھیرے میں گھل مل گئی۔ میں نے باہر نکل کر دیکھا کہ جس جگہ کھڑا ہوں، وہاں تک ایک راستہ ماضی کی سمت سے نکل کر آیا ہے اور دوسرا راستہ یہاں سے شروع ہو کر مستقبل کی منزلوں سے گزرتا ہوا موت کے دروازے پر غائب از چشم ہو گیا ہے ان دونوں کے درمیان میں تاریخ کی سولی پر تھرتھراتی ہوئی انسانیت کی طرح پیکر تصویر بنا کھڑا ہوں۔ یکایک ایک بادل کراہتا ہوا میرے قدموں پر گر پڑا، درخت حال زدہ صوفیوں کی طرح سر دھننے لگے، کتے بھونکنے لگے، چوکیدار بڑے چوروں سے چھوٹے چوروں کی غمازی کرنے لگے اور مؤذن نے مجھے یاد دلایا کہ "خدا بڑا ہے! خدا بڑا ہے! خدا بڑا ہے"!

جب میں اس شورش سے پناہ لینے کے لئے کمرے میں جا بیٹھا تو یک بیک اختلاج کا دورہ شروع ہو گیا۔ ہاتھ تھرانے لگے، دل پنکھے کی طرح گھومنے لگا کانوں میں سنسناہٹ ہونے لگی۔ چہرہ خون کی حدت سے سرخ ہو گیا۔ سراسیمگی کی اس کیفیت میں یہ معلوم ہونے لگا کہ درخت روئی کے گالوں کی طرح ہوا میں اڑ رہے ہیں، پہاڑ شریر بچوں کی طرح کھڑکی سے جھانک کر منہ چڑھا رہے ہیں اور فرشتے اپنے پروں سے بسکٹ توڑ کر منہ میں بھر رہے ہیں ——

اور اسی دہشت میں یہ گمان ہوا کہ حضرت میکائیل پرو وائس چانسلر سے معانقہ کر رہے ہیں اور دونوں میں اس مسئلہ پر بحث ہو رہی ہے کہ اسے جنت سے نکال کر یونیورسٹی روانہ کر دیں یا یونیورسٹی سے نکال کر جنت بھیج دیں! × × × × × ایسا دورہ کبھی نہ ہوا تھا۔ ہاتھ پاؤں ڈھیلے ہونے لگے۔ اور غش طاری ہو گیا۔

۳۰ ستمبر ———

کیا انسان روٹی کھانے اور کھانے والے جانور کے سوا کچھ نہیں کیا یہی اس زندگی کا انجام ہے؟ کیا یہی اس لفظ کی آخری تفسیر ہے؟ اگر کام کرنے اور زندہ رہنے میں کوئی فرق نہیں تو میں ہرگز کام نہ کروں گا۔ کیوں نہ ان پرندوں کے ترانوں اور ستاروں کے نغموں کو سنتا ہوا' دوب پر خاموش پڑا رہوں۔ اُس وقت تک جب تک کہ میرا جسم سڑ کر اس زمین میں نہ مل جائے اور اسی جگہ سے ایک شجرِ گندم پیدا ہو جو تنہا قیامت کے ہیولے میں لہلہاتا رہے اور پھر ایک آدم آئے' خدا کی نافرمانی کرکے دوبارہ اس شجرِ ممنوعہ کے پھل کو چکھے اور ایک جہانِ نو کی بنا ڈالے۔ اگر میں اس دُنیا کے لئے تدفضول ہوں تو وہ بھی میرے نزدیک کتابِ زندگانی کے غلط نامہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔

آج کئی دلچسپ واقعات نظر سے گزرے جس جگہ مولوی صاحب تفسیر پڑھا رہے تھے' وہیں کسی بھکاری کے بچے کُترے سڑے ہوئے امرود نکال کر کھا رہے تھے! شہر میں ایک بنیا سانڈوں کو مٹھائی کھلا رہا تھا اور جب کسی فاقہ زدہ نے اس تھال کو اپنی طرف سرکالیا تو اس کے مُنہ پر پے در پے کئی طمانچے پڑ گئے لیکن بھاگتے بھاگتے بھی وہ ان ٹکڑوں کو اُٹھا ہی لے گیا جو اس چھینا جھپٹی میں نالی میں گر پڑے تھے۔ وہ اس روایتی کتے سے زیادہ چالاک تھا جو نقش برآب روٹی کی طرف لپکا اور اپنی ہم بھی گنوا آیا۔ سامنے کے مندر میں بنئے کا خدا ایک شہ نشین پر بیٹھا یہ تماشہ دیکھ رہا تھا۔

کون سی وہ تین چیزیں ہیں جو مجھے قدرت کی خوش مذاقی کا قایل بنانے لگی ہیں؟ سمندر' عورت اور ٹومیٹو! ایک وسیع ہے' دوسری عمیق ہے' تیسرا من سلویٰ ہے اور ٹومیٹو پیدا کرنے والے' اگر تو میرے باغ کو "ٹومیٹو زار" بنادے تو میں ہمیشہ کے لئے تیرا اطاعت گزار ہو جاؤں۔

۱۶ راکتوبر ———

یہ ماحول کس قدر زہریلا ہے! اس میں میرا دم گھٹ رہا ہے۔ اس آتشکدہ میں میرا جسم ہی نہیں میری روح تک جل کر خاک و سیاہ ہو رہی ہے۔ ان گو بریلوں میں جگنو کی طرح کبھی جلتا ہوں اور کبھی بجھتا ہوں۔ اب بھی موقع ہے' کیوں نہ اس تنگ و تاریک باؤلی سے نکل کر اس بہتے ہوئے دریا میں کود پڑوں جو قید و بند سے آزاد اور سمت و ساحل سے بے خبر ہو کر تحت الثریٰ سے نکل کر آسمان کی طرف بہہ رہا ہے۔ اور یا کیوں نہ میں اپنا پلنگ اس پہاڑ کی چوٹی پر بچھا کر دم بھر آرام کروں۔

مجھے خوش ہونا چاہئے تھا کہ اپنی بے راہ روی پہ حاوی ہو گیا۔ لیکن نہیں آہ اپنے فیصلہ پر میں آپ غمزدہ اور ماتم کناں ہوں۔

اس نے کہا کہ تو چلا جا' لیکن میں تیرا انتظار کیا کروں گی! اس نے کہا کہ جب تو ہر رستہ پر چل کر تھک جائیگا اور حراس و مایوسی سے بیدم ہو جائے گا تو دل کی راہ کی طرف بھی ایک نظر دیکھ لینا۔ تجھے ایک چراغ نظر آئے گا۔ جس کی کمزور شعاعیں طوفان کے تھپیڑوں سے سر نکال کر تیری رہبری کریں گی ——— اور یہ محبت کا چراغ ہوگا۔

کیونکر اس نے میری زندگی کی رو کو بدل دیا؟ کیوں اس نے نفرت کے اس سیہ کرہ میں الفت کی جوت جگا دی؟ کل تک اس دل کی دُنیا میں سونا پن تھا ——— وہ دنیا جس کا ہر ذرہ آگ سے بنا تھا۔ ایک ایسا آسمان جس میں ستاروں کی جگہ بجلیاں جھلملایا کرتی تھیں۔ کیوں اس نے اس آگ کو کریدا' کیوں اس نے اس زندگی سے محبت پیدا کر دی کیوں اس نے اس فریب میں مجھے مبتلا کر دیا ——— محبت کا فریب! کیوں "آہ" ایسا کیوں ہوا۔!!؟

کل تک میں اپنے متعلق کچھ نہ سوچتا تھا۔ تنکے کی طرح حالات کے بہاؤ میں بہا چلا جاتا تھا کیوں اس نے راہ روک کر پوچھ لیا کہ او خود فراموش' او خوابگر' کیا تو ہمیں نہیں پہچانتا؟ اور مجھے یہ محسوس ہوا کہ یہ وہی آواز ہے جو روزِ اوّل سُنی تھی چشم زدن میں کائنات کا ہر ذرہ ایک دوسرے کا شانہ ہلا کر پوچھنے لگا کہ کیا تو ہمارا آشنا نہیں ہے؟ روح کے خلاء اور مادہ کے ہیولے سے صرف ایک صدا سُنائی دینے لگی ——— کیا تو ہمیں نہیں پہچانتا؟

۱۰ فروری ———

اس بیمار کی طرح جسے مرتے مرتے مسیحا نے زندگی عطا کی اور جب وہ زندہ ہونے لگا تو اپنا دامن چھڑا کر چلا گیا' اس نے مجھے وہاں لا کر گرا دیا ہے جہاں حیات و ممات کی حدیں ملتی ہیں۔ جہان ظاہر میں ہی نہیں عالم باطن میں بھی غضب کا اکیلا پن ہے۔ قلم ہاتھوں سے چھوٹ رہا ہے اور نبض کی ہر جنبش اور دل کی ہر دھڑک دمِ واپسیں کی صدائے بازگشت معلوم ہوتی ہے۔

لیکن میں بھی اپنی دُنیا بنا سکتا ہوں۔ جب ہر طرف اندھیرا ہوگا تو آسمان میرے لئے نورانی محفل سجائیگا۔ کبھی اس شجرِ بے برگ میں بھی شگوفے آئیں گے۔ یہ بجھی ہوئی بجلی پھر چمکے گی۔ یہ کملایا ہوا پھول پھر کھلے گا۔ ابھی نہ زندگی ہے اور نہ موت ——— بیکاری ہے' بے حرکتی ہے' بے حسی ہے۔ لیکن کیا وہ دن کبھی نہ آئیگا جب کہ میری زندگی موت پیدا کریگی تو موت زندگی کا تانا بانا بننے لگے گی؟

تجلیاتِ کلیم!

تجلیاتِ خدائی نہ ہوئے کھیل ہوا

ایک موسیٰ کو ملا ایک زمیں کو ملا!

جلال دہلوی

کوہِ ہمالیہ کا پیغام مادرِ ہند کے نام

میرٹھ کی برگزیدہ و محترم ہستی عالی جناب پنڈت پیارے لال صاحب شرما مد ظلہ العالی نے از راہ ایشیا نوازی موسیو پال رچرڈ کی معرکۃ الآرا تصنیف (Message of Himmalyas) کا ترجمہ عنایت فرمایا ہے۔ ذیل میں ہم اس مختصر مگر جامع تصنیف کا ایک شذرہ تمہید کے ساتھ شایع کرنے کی عزت حاصل کرتے ہیں جو یہ ہے یہ مختصر کتاب جس کا ایک ایک حرف روحانیت اور ایشیا سے خصوصی روحانی تعلق کا آئینہ دار ہے بزبان اردو نہایت حسن و جمال کے ساتھ شایع ہوگی۔ قبلہ شرما صاحب نے بڑے کمال کے ساتھ اس کا ترجمہ فرمایا ہے اس کی داد دینا گستاخی ہے لیکن بہ حال اس بزرگانہ عطایہ پر ہم آپ کا شکریہ ضرور ادا کرتے ہیں۔ اور ہمیں امید ہے کہ یہ سلسلۂ کرم برابر جاری رہے گا۔ ساغر

تمہید مترجم

شری یت آربندو گھوش، وہ فنا فی الوطن ہستی جس کا نام ہندوستان کے ہر فرد کے دل میں خاص عزت کی جگہ پائے ہوئے ہے۔ یورپ اور ہندوستان کی مختلف زبانوں کا عالم مشرقی اور مغربی فلسفہ کا ماہر زاہد گوشہ نشین حکومت وقت کا شہید ناز آج چودہ سال ہوئے انگریزی ہندوستان سے جلا وطن ہو کر پانڈی چری میں اس غرض سے پناہ گزیں ہے کہ مادرِ ہند کی نجات کے لیے سخت سے سخت ریاضت اور تپشیا اس وقت تک کیے جائے جب تک کہ اس پاک مقصد کی تکمیل ہو۔ اسی برگزیدہ ہستی کا شریک کار ہم خیال اور راز داں موسیو پال رچرڈ ایک فرانسیسی عالم اور فلسفی ان اوراق کا قابل مصنف ہے روحانیت کا دلدادہ زہد اور ریاضت کا مشتاق اپنے خیال کی نئی دنیا اور نئی قوم کا متلاشی ترک دنیا کی زندہ تصویر برف سے ڈھکے ہوئے ہمالیہ کے ایک ایک مقام پر جہاں عبد اور معبود کا رشتہ قریب نظر آنے لگتا ہے کچھ عرصہ خلوت گزیں رہا اور اسی جگہ اپنے خیالات کو موسیو پال رچرڈ نے فرانسیسی الفاظ کا جامہ پہنا کر ان خیالات کا نام ہمالیہ کا پیغام مادرِ ہند کے نام رکھا۔ فرانسیسی زبان سے انگریزی میں ترجمہ ہو کر یہ کتاب شائع ہوئی ہے۔ "ہمالیہ کا پیغام" موسیو پال رچرڈ کی پرواز خیال کو ایک اجنبی زبان سے اپنی اردو زبان میں نیا جامہ پہنانے کا خیال ایک گستاخانہ جرأت ہے۔

میں اپنی ناقابلیت سے واقف ہوں اور اپنی کم علمی کا معترف میرا مقصد موسیو پال رچرڈ کے اعلیٰ خیالات کو اپنے ان برادران وطن تک پہنچا دینا ہے جن کی زبان صرف اردو یا ہندی ہے۔ ان خیالات کے پہنچانے کی مجھے کیوں ضرورت ہوئی وہ تو صرف ع دل من داند و من دانم و داند دل من

میرا صرف خیال ہی نہیں بلکہ عقیدہ ہے کہ مادرِ وطن کی نجات کا راز ایشیا کی بقا کا راز مہذب دنیا کی سچی آزادی کا راز ان خیالات میں مضمر ہے۔ ہندوستان کا مستقبل ایشیا کے مستقبل سے وابستہ ہے اور متحدہ ایشیا ہی محبت کا وہ پیغام دنیا کو پہنچا سکتی ہے جو آنے والے زمانے میں تمام جہان کے امن کا ضامن ہو سکتا ہے۔ کاش ہندوستانی قوم میں جو بنی نوع انسان کا پانچواں حصہ ہے اپنے اس عظیم الشان مقصد کا احساس پیدا ہو۔ برادران وطن! ہم میں قومیت کا روز افزوں احساس خدا کی قدرت کا ایک کرشمہ ہے۔ ہمارا "آج" دنیا کی آنے والی "کل" کا پیش خیمہ ہے۔ اسلامی اخوت "انسانی اخوت" کا پیغام سنائے گی۔ بچھڑوں کو ملائے گی۔ ہنستوں کو رلائے گی۔ روتوں کو ہنسائے گی۔ سوتوں کو جگائے گی۔ جو اب تک نہیں ہوا تھا وہ کر دکھائے گی۔ بقول اقبال سہ

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی۔

پیارے لال مترجم

۱۷۲

کوہِ ہمالیہ کا پیغام

مادرِ ہند کے نام

کوہ ہمالیہ کا سلسلہ جہاں تک نظر جاتی ہے ان پہاڑوں کے سمندر میں ایک مسرتِ نامتناہی ہے اور یہ سہ روز یہ مسرت متحرک ہے جس طرح تیز نبض متحرک ہوتی ہے یا جیسے اک زندہ لفظ، اور ایک زندگی بخشنے والی آواز! سنو! ——— وہ آواز کچھ کہتی ہے وہ مادرِ ہند سے خطاب کرتی ہے۔ بھارت ماتا! اس پیغام کو سُن جو ان بلندیوں سے تیرے لئے آیا ہے **جو ہمالیہ کا پیغام ہے۔** یہ آواز تجھ سے کہہ رہی ہے:۔

وہ ساعت قریب ہے، وہ پُرعظمت گھڑی جب تو آزاد ہوگی قریب ہے کہ تیری آرزو برآئے، مگر صرف وہی نہیں جس کو تونے چاہا تیری آرزو سے بہت زیادہ، بہت ارفع، زیادہ وسیع، اور واضح، زیادہ متحرک وہ کسی سے مغلوب نہ ہونے والی آرزو ہے حتیٰ کہ تو بھی اس کی طاقت سے مجبور ہوگی!

یورپ کی قدیم روح کے ساتھ ساتھ اس کا خاتمہ ہو رہا ہے یورپ اور اسکے مقبوضات کے ساتھ ساتھ یہ رخصت ہو رہی ہے جب جسم ہوتا ہے تو اس کا کوئی عضو کب بچ سکتا ہے تم اسے کسی سلطنت کا خاتمہ نہیں بلکہ یورپ کی سلطنت کا خاتمہ سمجھو اسپر لعنتیں نہ بھیج نہ اس کی تقلید کر البتہ اس سے اپنا ورثہ حاصل کر اس سے سیکھ کہ تجھے کیا کرنا چاہئے (دنیا کے لئے) نور اور روشنی دے اور یہ بھی سیکھ کہ تجھے کیا نہ کرنا چاہئے کہ تو اضمحلال و انحطاط سے محفوظ رہے۔

جو گذر گیا اُسے خیرباد کہہ اور جو آئندہ سامنے آئے اسکی طرف رجوع ہو۔ وہی موج جو ایک جگہ ڈوبتی ہے تو ایشیا کی جانب اُٹھتی ہے گویا وہ ایشیا کو جگانے آرہی ہے وہی آفتاب جو گذرے ہوئے دنوں میں مشرق سے گذر کر مغرب کی طرف دورہ کر رہا تھا لیکن اب وہ وہاں نمودار ہوتا ہے اگر صبح صادق کا نظارہ دیکھنا ہے تو **ایشیا** کی طرف متوجہ ہو جاؤ۔

میزانِ زمانہ کی وہی حرکت جس نے یورپ کے اونچا ہوتے وقت ایشیا کو جھکا یا تھا اب یورپ کو جھکا رہی ہے کہ ایشیا کو اُٹھا دے۔

یورپ کا زوال، ایشیا کا عروج، مساوات کے یہ دو پہلو ہیں اور انہی کے ذریعہ اقوامِ عالم کی تقدیروں کا عقدہ حل ہوگا۔ دروازہ کے دونوں کواڑ کھل رہے ہیں یہ دروازہ تمہارے مستقبل کا باب آرزو ہے ایک در تاریکی میں ہے دوسرا روشنی میں۔

"دخترِ ایشیا" (مادرِ ہند) تم اس لئے خودی کی عادت چھوڑ دو کہ کوئی قوم اور کوئی انسان تنہا اپنے لئے زندہ نہیں رہتا اور نہ کوئی انسان یا قوم زندہ رہ سکتی ہے جبتک کہ وہ اپنے سے اونچی بلندی کو نہ دیکھے۔

اقوامِ یورپ کی طاقت کا ایک سبب یہ تھا کہ زندہ یورپی جذبہ اُن سب پر حاوی اور ان سب میں ساری تھا۔ اب ان کا خاتمہ اس لئے ہو رہا ہے کہ وہ اس اجتماعی جذبہ اور اس یورپی حُب الوطنی میں قاصر رہیں۔

ایشیا کی قومیں زندہ رہیں گی وہ مضبوط اور آزاد ہوکر زندہ رہینگی لیکن صرف اس وقت جب اُن سب میں یہی اجتماعی جذبہ اور ایشیا کی حبِ الوطنی کی روح زندہ ہوگی۔

ایشیا والے یعنی ہندوستان، چین، جاپان، فارس، عرب کے شہری تو مجھے اس وقت سب جگہ نظر آتے ہیں لیکن ایشیا کے شہری ایشیا کے فرزند کہاں ہیں؟

ایشیا کہاں ہے؟

مَیں ایشیا والے تو ہر جگہ دیکھتا ہوں لیکن ایشیائی کہاں ہیں؟

وہ کہاں ہیں جن کی نگاہ ایشیا کی طرف لگی ہو اور جنہیں کثرت میں وحدت کا احساس ہو، وہ ایشیا جو تین نسلوں کا گہوارہ، پانچ مذہبوں کی عبادت گاہ اور سات سلطنتوں کی سرزمین ہے، یہ وہی سات سلطنتیں ہیں جو کل بھائیوں کی طرح مل کر "ایک" ہونے والی ہیں۔

وہ کہاں ہیں جن کی نگاہ ایشیا کی طرف لگی ہو، وہ ایشیا جو تمام افکارِ عالیہ اعلیٰ خیالات کا ایک گلدستہ ہے، مسیحی ایشیا شمال میں اسلامی ایشیا مغرب میں، بودھ کی ایشیا جنوب میں، کنفوشس کی ایشیا مشرق میں، ویدوں کی ایشیا اسی جگہ اور روحانی ایشیا سب جگہ۔

وہ کہاں ہیں جن کی نگاہ ایشیا کی طرف لگی ہوئی ہو؟ وہ ایشیا جہاں نصف بنی نوع انسان آباد ہیں، وہ ایشیا جو اس وقت غلام ہے مگر آئندہ آزاد ہوگی، وہ ایشیا جس کا تعلق اقوام مغرب سے طاقت کے زور سے ہے اور جو اس لئے آزاد ہوگی کہ محبت سے ان کے سامنے جُھکے۔

وہ کہاں ہیں جن کی نگاہ ایشیا کی طرف لگی ہوئی ہے؟ وہ ایشیا جو صرف روح میں اس وقت ایک ہے اور جس کو اس وجہ سے متحد ہونا چاہیے کہ اس روح کا ظہور ہو اور اس ظہور سے دُنیا پُرنور ہو۔ کیونکہ ایشیا کے اتحاد پر دُنیا کے اتحاد کا انحصار ہے۔

وہ کہاں ہیں جن کی نگاہ ایشیا کی طرف لگی ہے؟ وہ ایشیا جسے قدرت نے "گرینڈ مدر" کا خطاب عطا کیا ہے۔

موسیو پال رچرڈ

پیدا ملک ہو اور ایشیائی ہو جب
یکسا قصۂ رنگ و نسل و مذہب ہو ختم
ہر ایک انگ انگ ارتقائی ہو جب
سرشار آزادی و رہائی ہو جب

ساغر نظامی

آربندو گھوش

بنگال کا انقلاب پسند سادھو رہنما

بنگال کے مشہور انقلاب پسند رہنما بابو آربندو گھوش کئی سال سے پانڈیچری کے فرانسیسی علاقہ میں راہبانہ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ دنیا کی ہنگامہ آرائیوں میں جی بھر کر حصہ لیا عیش و تنعم کی بہاریں بھی لوٹیں۔ فانی دنیا کی فانی شہرت بھی حاصل کی۔ لیکن مادیات کی ظلمت میں جب شمع حقیقت کی روشنی ہوئی تو سب کچھ مجاز نظر آیا اور سینہ میں جذبۂ شوق کی آگ بھڑکی اور علائق دنیاوی کی زنجیروں کو توڑ کر شاہد حقیقی کی تلاش میں مصروف ہو گئے عزم و استقلال نے دستگیری کی اور بنگال کا یہ انقلاب پسند لیڈر اپنے مقاصد میں کامیاب ہو کر آج اس روحانی دنیا میں متمکن ہے جس کے بام و در حقیقی مسرتوں کے نور سے جگمگاتے ہیں جہاں نہ تو قومیت و وطنیت کی سنگین دیواریں ہیں نہ رنگ و نسل کے امتیازات ہر طرف اسی کا جلوہ ہے جس کی تلاش تھی۔ اور جس کے جمال کی شان غیرت برق غضب بن کر ما سوا کو پھونک دیتی ہے

شری آربندو گھوش کی زندگی میں انقلاب عظیم برپا ہوا ہے انہیں اور ان کی متصوفانہ تعلیمات کو اچھی طرح ذہن نشین کرنے کے لئے ہمیں ان کے ابتدائی حالات پر ایک نظر ڈالنی پڑے گی پانڈیچری کے ایک خاموش آشرم میں بیٹھ کر دنیا کو ترک و تجرید کا پیام سنانے والا آربندو گھوش بنگال کے ایک دولتمند خاندان میں پیدا ہوا۔ سات سال کی عمر میں بغرض تعلیم انگلستان بھیج دیا گیا۔ مانچسٹر کے ایک انگریز خاندان میں تربیت پائی۔ چودہ برس کامل مادیات کی پرستش کرنے والے انگلستان کی سرزمین پر بسر کئے۔ اس کیمبرج یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی جو دنیا کی تو اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم دیتی ہے لیکن جسے مذہب و معرفت کی تدریس سے کوئی واسطہ نہیں۔ آربندو گھوش نے وید اور اپنشد کے نہیں بلکہ لاطینی زبانوں کے اعلیٰ ترین امتحانات پاس کئے۔ بھگوت گیتا کو تو شاید کبھی ہاتھ لگانے کا بھی موقع نہ ملا ہو گا لیکن اطالوی فرانسیسی اور جرمن ڈراموں کی روزانہ ورق گردانی ہوتی تھی۔ ۱۸۹۰ء میں ادبی و علمی کمالات حاصل کرنے کے علاوہ آربندو گھوش نے آئی سی ایس کا امتحان بھی پاس کر لیا جسے فاقہ کش مگر روحانیت کا گہوارہ ہندوستان اپنی ناتواں پیٹھ کے لئے ناقابل برداشت بار سمجھتا ہے۔

بہت ممکن تھا کہ مادر مشرق سے بیگانہ اور مغربی ماحول میں پرورش پایا ہوا آربندو گھوش بنگال کے کسی ضلع میں مجسٹریٹ مقرر ہو کر آ جاتا اور آج وہ گمنامی کے اس پردہ میں روپوش ہو جاتا۔ جو اس سے پیشتر آئی سی ایس کے ہزاروں افراد کو چھپا چکا ہے۔ لیکن قدرت کو تو کچھ اور ہی منظور تھا۔ مسٹر آربندو گھوش گھوڑے کی سواری میں کم مہارت رکھنے کی وجہ سے نوکری کے ناقابل قرار دئے گئے اور ان کو مہاراجہ بڑودہ جو ان دنوں انگلستان میں تھے اپنے ہمراہ ۱۸۹۳ء میں بڑودہ لے آئے مسٹر آربندو گھوش پہلے تو کئی سال تک محکمۂ مال و سکریٹریٹ میں کام کرتے رہے اس کے بعد انہیں علمی خدمات تفویض ہوئیں اور وہ بڑودہ کالج کے وائس پرنسپل مقرر ہوئے۔ مسٹر گھوش اب ملکی و مالی جھگڑوں سے آزاد اطمینان خاطر سے ادبی مشاغل میں مصروف ہو گئے اور ان کی بہت سی معرکۃ الآرا نظمیں جو بعد میں پانڈیچری سے شائع ہوئیں اسی زمانہ میں لکھی گئی تھیں۔ مسٹر گھوش مشرقی علوم سے اب تک بالکل بیگانہ تھے لیکن قدرت نے اس کی تلافی بڑودہ میں کر دی۔ یہاں رہ کر مسٹر گھوش کو سنسکرت کتابوں کے مطالعہ کا شوق ہوا اور انہوں نے سنسکرت کے علاوہ بعض دوسری مشرقی زبانیں بھی زمانۂ قیام بڑودہ میں سیکھ لیں۔

یوں تو ۱۹۰۲ء سے مسٹر آربندو گھوش کو سیاسیات سے کسی نہ کسی حد تک دلچسپی ہو گئی تھی مگر وہ بڑودہ کی سرکاری ملازمت کی وجہ سے پس پردہ کام کرنے پر مجبور تھے اور سیاسیات میں عملی حصہ نہیں لے سکتے تھے۔ ۱۹۰۵ء میں جب تقسیم بنگالہ کا پُرزور ایجی ٹیشن شروع ہوا تو مسٹر گھوش کے لئے اپنے جذبات پر قابو حاصل رکھنا دشوار ہو گیا اور ۱۹۰۶ء میں وہ بڑودہ کی ملازمت سے مستعفی ہو کر کلکتہ چلے آئے جہاں جدید قائم شدہ بنگال نیشنل کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے۔

مسٹر آربندو گھوش نے بنگال میں قوم پرستی کی نئی آگ بھڑکائی اور لوکمانیہ تلک کی قیادت میں ایک نئی پارٹی قائم کر کے آزادی کامل کے نصب العین کو سامنے رکھا اور ان اعتدال پسندوں کے خلاف جنگ شروع کر دی جو سالہا سال سے کانگریس پر قابض تھے۔ اس غرض سے آپ نے ۱۹۰۶ء میں اپنا مشہور اخبار "بندے ماترم" نکالا اور اس سال آپ پر بغاوت کا مقدمہ چلا لیکن بری ہو گئے اور سورت کی مشہور نیشنلسٹ کانفرنس کے صدر منتخب ہوئے دوسرے سال آپ علی پور کے مقدمہ سازش میں اپنے بھائی بریندر کمار گھوش کے ساتھ گرفتار کر لئے گئے لیکن ایک سال تک زیر سماعت قیدی کی حیثیت سے جیل میں بند رہنے کے بعد آپ بری ہو گئے اور انگریزی زبان میں مشہور اخبار "کرم یوگن" جاری کیا۔

علی پور جیل کے زمانہ حراست نے آپ کی زندگی میں ایک اور انقلاب پیدا کر دیا قید خانہ کی تاریک کوٹھریوں میں آپ کو یوگ کی مشق کا شوق پیدا ہوا اور ایک سال کے اندر اس میں پوری مہارت حاصل کر لی فروری ۱۹۱۰ء میں آپ کے لئے چندر نگر کی پُرسکون فضا غیر معمولی دلکشی ثابت ہوئی۔ اور آپ ضروری انتظامات کے بعد اپریل ۱۹۱۰ء میں برٹش انڈیا کو خیرباد کہہ کر چندر نگر چلے گئے۔ آپ کی غیبت میں "کرم یوگن" کے ایک مضمون پر بغاوت کا مقدمہ چلا۔ چونکہ مسٹر آربندو گھوش اب انگریزی لا اینڈ آرڈر کی دسترس سے باہر تھے لہٰذ

انخبار کے پرنٹر پہ مقدمہ چلایا گیا اور اسے سزا ہوئی۔ لیکن ہائیکورٹ میں اپیل کرنے پر بری ہو گیا شروع میں آپ چندر نگر اس خیال سے گئے تھے کہ سیاسی صورت حالات کے موافق ہو جانے پر آپ بنگال واپس آ جائیں گے لیکن وہاں پُر سکون فضا میں جب یوگ کی مشق زیادہ بڑھی اور نورِ حقیقت کی ضیا پاشیوں سے قلب و دماغ روشن ہوئے تو آپ نے سیاسیات کو ہمیشہ کے لئے ترک کر کے چندر نگر میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ چار سال بعد آپ نے پانڈیچری سے فلسفہ اور تصوّف پر کئی معرکتہ الآرا کتابیں شائع کیں اور ان فلسفیانہ نظموں کی اشاعت کا سلسلہ بھی شروع کیا جو آپ نے بڑی دقت سے لکھی تھیں۔ کئی مرتبہ کوشش کی گئی کہ آپ انڈین نیشنل کانگریس کی صدارت قبول کر لیں لیکن آپ نے منظور نہ کیا۔ شروع میں آپ کے ساتھ صرف تین چار چیلے تھے لیکن جب ان کی تعداد زیادہ بڑھی تو پانڈیچری میں ایک وسیع آشرم قائم کیا گیا۔ جہاں بھگتوں کو تصوّف اور ویدانت کی تعلیم دی جاتی ہے

—— اربندو گھوش مادی دنیا کی مسرتوں کو سراب سمجھتے ہیں اور ان کے خیال میں حقیقی مسرتوں کا سرچشمہ محبوبِ حقیقی کا وصل ہے۔ آپ بھی مراقبہ و مرابطہ کے زیادہ قائل ہیں اور صوفیائے اسلام کے مسئلہ تصورِ شیخ و برزخ کی طرح "تصورِ جاناں" پر بہت زور دیتے ہیں۔ آپ اپنی مشہور تصنیف "تھسس آن یوگ" میں کہتے ہیں کہ "محبوب کا جلوہ ہر وقت ہماری نظروں کے سامنے رہنا چاہیئے۔ ایسی شکل ہمارے دل میں اس طرح بس جائے جس طرح مکین اپنے مکان میں رہتا ہے۔ ہمیں اپنی قسمت محبوب کے ہاتھ دے دینی چاہیئے۔ ہم اس کی رضا کے بندے ہو جائیں۔ یہ سمجھ لیں کہ ہم ایک آلہ بے جان ہیں اور ہمارا محبوب کبھی دوست کی حیثیت سے کبھی عاشق کی شکل میں اور کبھی آقا بن کر ہم سے جو کام چاہتا ہے لیتا ہے۔ ہمارے تمام افعال واقوال خیالات و تاثرات اس کی مرضی کے تابع ہیں ہم وہی کہیں جو وہ کہے اور وہی کریں جس کا وہ حکم دیں —— اگر اپنا وجود تم کو عزیز ہے تو اپنی ہستی مٹا دو۔ اگر حیاتِ ابدی کی تلاش ہے تو زندگی کو ختم کر دو سمجھو"

شری اربندو گھوش کے خیال میں محبوبِ حقیقی کا وصل بھگتی سے حاصل ہوتا ہے اور بھگتی اس وقت حاصل ہوتی ہے جب دماغ مادی دنیا کی آلائشوں سے پاک ہو فضائے قدس میں پرواز کرے۔ اور دل مجازی زنجیروں کو توڑ کر عشقِ حقیقی کی لذت سے آشنا ہو

شری اربندو گھوش کے روحانی فلسفہ سے لوگوں کو متعارف کرانے کے لئے یہ نہایت مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تحریروں سے چند اقتباسات پیش کر دیئے جائیں۔ مقصدِ فلسفۂ حیات پر اظہار خیال کرتے ہوئے پانڈیچری کا یہ سادھو لکھتا ہے کہ

"جب ہم علم کی حدود سے باہر نکل جائیں گے تب ہمیں علم حاصل ہوگا۔ استدلال ہمارے لئے ممد و معاون بھی تھا اور ہماری راہ میں حائل بھی۔

جب ہم خواہشات کی حدود سے باہر نکل جائیں گے تب ہم کو قوت حاصل ہوگی۔ خواہش ہمارے لئے ممد و معاون بھی تھی اور ہماری راہ میں حائل بھی

جب ہم مسرتوں کی حدود سے گزر جائیں گے تب ہمیں مسرت حاصل ہوگی تمنا ہمارے لئے ممد و معاون بھی تھی اور ہماری راہ میں حائل بھی ہے۔

جب ہم انسانیت کی حدود سے نکل جائیں گے تب ہم انسان بن جائیں گے انسانیت ہمارے لئے ممد و معاون بھی تھی اور ہماری راہ میں حائل بھی ہے

انسان اپنے مادی جسم کی قیود میں گرفتار ہے۔ لیکن وہ چاہتا یہ ہے کہ اس کی غیر فانی روح آزاد ہو کر فضائے قدس میں پرواز کرے۔

جو روح عشقِ حقیقی کے بادہ سے سرشار نہ ہو وہ مردہ ہے لیکن مادہ پرست مادی دنیا ایسی ہی مردہ روحوں کی قدر کرتی ہے۔ — "

انسان سکون و اطمینان تب تو پاتا ہے لیکن دل و دماغ کو ایسی چیزوں کی آماجگاہ بھی بنا تا ہے جن سے وہ اطمینان و سکون سے قبر مرنے تک بہرہ ور نہ ہو سکے۔ انسان اپنی خواہشات کا دائرہ جس قدر تنگ کریگا اسی قدر وہ اطمینان و سکون سے قریب تر ہو جائیگا۔ جتنا وہ اپنی خواہشوں کو بڑھائیگا اتنا ہی وہ اطمینان و سکون سے دور ہوتا جائیگا۔

کامیابی کی جھلک خواہ کتنی ہی قریب کیوں نہ نظر آئے اس پر اعتماد اس وقت تک نہ کرنا چاہیئے جب تک کہ وہ قبضہ میں نہ آ جائے۔

کامیابی بھی صرف اس وقت قابلِ مسرت ہے جب محنت و جد و جہد کے لئے ایک نیا میدان مل جائے ورنہ جو کامیابی مزید ترقیوں کے دروازہ کو مسدود کر دے اس کا دوسرا نام موت ہے۔

روحانی زندگی کی انتہائے کمال یہ ہے کہ طالب شوق بنے محبوب سے اس طرح مل جائے کہ پھر مفارقت کا احتمال بھی نہ رہے۔ جب تک وصل نصیب نہیں ہو جاتا یا وصل کے بعد بھی مفارقت کا احتمال باقی رہتا ہے روحانی زندگی مکمل نہیں کہی جا سکتی

پانڈیچری کے سادھو کا پیغام

تمام دنیا کو معلوم ہے اور روحانی مفکرین [illegible] سے واقف ہیں کہ [illegible] یعنی وجود [illegible] کے عالم میں قدرتاً [illegible] ہیں۔ دنیا [illegible] عشق [illegible] بڑیں کا [illegible] تجلی جلوہ [illegible] یہ تو شورِیوں سے بھری ہوئی [illegible] یہاں کی [illegible] اکثر اوقات پر عذاب ہوتی ہے اور یہاں کی زندگی [illegible] متصور ہے۔ گو [illegible] کی ذاتی نفسی اور جسمانی خوشی و مسرت کی [illegible] زوال پذیر ہوتی ہے تاہم ذاتِ نفسی [illegible] نہیں پاتی [illegible] زندگی کے [illegible] باقی ہے [illegible] کا عالم [illegible] انسان سے کہ [illegible] ہستی نہیں ہے [illegible] نہیں [illegible] کوئی وجہ نہیں [illegible] کی بدولت [illegible] لئے [illegible] ہو۔ نہ تو [illegible] اور نہ وہ [illegible] مادیت پرست [illegible] ہے کہ [illegible] تمہیں کدھر جانا چاہیئے۔ یہ ایک [illegible] ظاہر نہیں کرتی کہ دنیا [illegible] نہیں [illegible] مطلق العنان کہیں [illegible] واقعات [illegible] حرکت [illegible] ہے۔ دراصل یہ حالات و واقعات کیا ہیں [illegible] کے اقتضائے قوائے عظیم کو [illegible] ترتیب [illegible] کوشش [illegible] ہے۔ اور جس میں ہم سب خدا کے بندے [illegible] حقیقت [illegible] ہیں۔ یہ حالات

و واقعات اسی کوشش کی شرائط و قرائن ہیں۔ اس کام میں دُکھ اور رد بدعا ہر قدم پر واقع ہوتے ہیں۔ اور کس وقت کیا نوبت پیش آئے گی اس کا اندازہ غیر ممکن ہے۔ پس دو ممکنات ہیں یا تو بودھوں اور یا مایہ داردیوں کی طرح اس جنجال سے دامن چھڑا کر نرواں میں محو ہوجانا یا چونکہ ذات الٰہی بظاہر غیر ممکن الانکشاف ہے اس لئے روبہ باطن ہونا اور اسے اپنے اندر پانا۔ جو اس راہ کے راہ رو ہو گئے ہیں اور جن کا شمار قلیل تعداد میں نہیں بلکہ صدہا اور ہزارہا ہے وہ ہر زمانے میں خدا کی ہستی کی شہادت دیتے آئے ہیں اور یوگ بھی اسی شہادت کی بدولت وجود میں آیا ہے۔ معترض یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ اس کا سراغ پانے کے لئے ایک عرصہ دراز کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ کہ وہ اپنی مایا کے موٹے پردہ میں چھپا ہوا ہے۔ اور ہماری پکار کا جواب فوراً یا ابتدائی مدارج پر نہیں دیتا۔ پھر یہ کہ وہ ایک غیر یقینی اور مستعجل جھانکی دکھا کر غائب ہو جاتا ہے اور انتظار کرتا ہے کہ ہم اس کے لئے تیار ہوں۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر خدا کی کچھ بھی قدر و قیمت ہو تو کیا وہ اس قابل نہیں ہے کہ ہم اس کے پیچھے کچھ وقت گنوائیں اور محنت و تکلیف اُٹھائیں۔ کیا یہ مناسب ہے کہ تربیت یابی و جاں نثاری۔ جفاکشی و مصائب انگیزی کے بغیر ہم اسے پانے پر اصرار کریں اس قسم کا مطالبہ یقیناً غیر معقول ہے یہ لابد ہے کہ اس کی جستجو میں پردہ کے اندر جانا ہی ہوگا۔ کیونکہ تب ہی ہم اسے باہر بھی دیکھ سکیں گے اور تب ذہن کو خدا کی ہستی کے متعلق قائل کرنے کا سوال ہی نہ رہیگا کیونکہ تجربہ کی روشنی اس قدر جلوہ گر ہو جائے گی کہ ذہن کو وجود الٰہی مجبوراً قبول کرنا پڑیگا۔ جیسے کہ کوئی شخص کسی چیز کی ہستی کا منکر ہو اور اس سے دوچار ہونے کے بعد ماننے پر مجبور ہو جائے مگر پایہ تکمیل کو پہنچنے کیلئے ذرائع مقررہ کا اختیار کرنا لازمی ہے اور منصوبہ میں راسخ العزم و صابر اور ساعی رہنا ضروری ہے

پیام میکدہ

زمانہ [illegible] جنگ جو سے گرما دیا
[illegible] اڑا دیا

[illegible]
[illegible] شہنشاہ دیا

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible] ساقی
[illegible] ساقی
امریکہ و روس [illegible] جاپان و فرنگ
[illegible] ساقی

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

"بانگِ مشرق"

ساغر نظامی

عشق و جنوں کی باتیں

از نواب جعفر علی خان صاحب اثر بی۔ اے مدظلہ العالی

کھوئے ہوئے سے رہنا دن کو روتے پھرنا راتوں کو
جو ہیں عاقل وہ کیا سمجھیں عشق و جنوں کی باتوں کو

وہ جو نہ آئے بادل چھائے، گرجے، برسے کھل بھی گئے
اسکے سوا ہم ہجر کے مارے کیا جانیں برساتوں کو

بات یہ اور ہے شوق کے ہاتھوں خونِ دلِ عاشق ہو جائے
کام نہیں کچھ خونریزی سے تیرے حنائی ہاتوں کو

شرم و حیا ہے، ناز و ادا ہے، عشوہ، کرشمہ، شوخی بھی
کیا تمہیں لینے جانا کہیں ہے، دل لینے کی گھاتوں کو

کیا کیا ہم پر لطف و کرم ہے کیسی کیسی مہر و وفا
تلخ اگر سن سکتے نہیں تو کیوں چھیڑو ان باتوں کو

ہو نہ ہو سب ہے اپنی بیتی لاکھ کرو انکار اثر
نیند آنکھوں کی اڑاتے ہو کہہ کے فسانہ راتوں کو

جیل سے پنڈت جواہر لال نہرو کے خطوط

اپنی پیاری بیٹی اندرا کے نام

از محمد یونس سلیم (مئونوی)
جامعہ عثمانیہ (حیدر آباد دکن)

(۱)

نینی سینٹرل جیل۔ یو۔ پی
۲۶ر اکتوبر ۱۹۳۰ء

پیاری اندرا

تم اپنی سالگرہ کے دن متعدد تحفے اور دعائیں پانے کی عادی ہو۔ دعائیں تم کو اب بھی کافی تعداد میں ملیں گی لیکن میں حیران ہوں کہ زندانِ نینی سے تمہیں تحفے کس قسم کے بھیجوں؟ میرے تحائف مادی شکل وصورت کے تو ہو نہیں سکتے البتہ وہ عبارت ہوں گے دماغی اور روحانی دونوں سے جن کو قید خانہ کی اونچی دیواریں بھی نہیں روک سکتیں۔

جانِ پدر! تم جانتی ہو کہ میں وعظ وتلقین کو کس قدر ناپسند کرتا ہوں تاہم جو کچھ میں کہتا ہوں اس کو سنو۔ خط کے ذریعہ مشکل ہی سے گفتگو کی غرض وغایت پوری ہو سکتی ہے کیونکہ یہ تو زیادہ سے زیادہ یکطرفہ معاملہ ہے۔ پس اگر میں کوئی ایسی بات لکھ جاؤں جو نصیحت سے ملتی جلتی ہو تو اس سے بددل نہ ہونا۔ تم سمجھو کہ میں نے تمہارے غور وتدبر کے لئے ایک تجویز پیش کی ہے گویا کہ ہم سچ مچ باتیں کر رہے ہیں۔

۱۹۱۷ء ——— جس سال تم پیدا ہوئی تھیں تاریخ کا ایک مہتم بالشان سال تھا جبکہ ایک عظیم الشان قائد نے جس کا دل مفلس اور مصیبت زدہ مخلوق کے ساتھ ہمدردی اور محبت کے جذبات سے لبریز تھا۔ تاریخ عالم میں ایک ایسے زریں باب کا اضافہ کیا جس کو دنیا کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ اسی ماہ میں جس میں کہ تم پیدا ہوئیں لینن (Lenin) نے اپنی زبردست انقلابی تحریک کی داغ بیل ڈالی جس نے روس اور سائبیریا کی بساط الٹ دی اور آج ہندوستان میں بھی دوسرے زبردست رہنما نے جس کے دل میں مفلوک الحال افراد اور ان کے ہمدردوں کیلئے محبت کی لہریں موجزن ہیں ہمارے ہم وطنوں کو اعلیٰ قربانی اور عظیم الشان مہم کے لئے ابھارا ہے تاکہ وہ ایک دفعہ پھر آزاد ہو جائیں اور غریب مظلوم رعایا اپنے کاندھے سے غلامی کا جوا اتار کر پھینک دے۔ باپوجی (مہاتما گاندھی) اگرچہ قید میں ہیں لیکن ان کے پیغام کی ساحرانہ قوت ہندوستان کے کروڑوں انسانوں کے قلوب میں جگہ پیدا کر لیتی ہے اور عورتیں مرد بچے تمام کے تمام اپنے گھر بار کو چھوڑ کر بھارت کی جنگِ آزادی کے لئے سپاہی بن جاتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ ہم اپنی حیثیت کو اس زبردست تحریک میں کس طرح قائم رکھیں گے اور ہم کس قسم کی خدمت انجام دیں گے؟ میں نہیں کہہ سکتا کہ کن فرائض کی انجام دہی ہمارے سپرد کی جائے گی۔ بہرحال نوعیت کار کچھ بھی ہو ہم کو یاد رکھنا چاہئے کہ ہم کوئی ایسی بات نہ کر بیٹھیں جو ہمارے مقصد کے منافی اور ابنائے وطن کے لئے ذلت وتحقیر کا باعث ہو۔ ہندوستان کا وقار ہمارا مطمح نظر ہونا چاہئے اور یہ "وقار" ایک مقدس ایقان کا مرادف ہے۔ صحیح اور غلط کا فیصلہ کرنا آسان بات نہیں! میں تم کو ایک معمولی سا گر بتاتا ہوں جس کو تم شک وارتیاب کی حالت میں استعمال کر سکو۔ کسی کام کو خفیہ طور پر نہ کرو اور نہ کبھی اس کے چھپانے کی کوشش کرو۔ کسی بات کو چھپانے کے یہ معنی ہیں کہ تم اس سے ڈرتی ہو اور ڈرنا بزدلی ہے جو کسی طرح ہمارے شایانِ شان نہیں! تم خوب جانتی ہو کہ مہاتما گاندھی کی قیادت میں جو عظیم الشان تحریک آزادی ملک میں جاری و ساری ہے اس میں اخفا اور رازداری کی مطلق گنجائش نہیں ہم جو کچھ کرتے ہیں کھلے خزانہ کرتے ہیں اور پیاری! اگر تم اس پر عمل پیرا رہیں تو تم ہر حال میں ایک ہونہار نڈر، سلیم الطبع اور مستقل مزاج لڑکی ثابت ہوگی۔

مجھے تم سے بہت کچھ کہنا تھا۔ لیکن ایک خط اس کا متحمل کیسے ہو سکتا ہے! میں کہہ چکا ہوں کہ تم خوش قسمت ہو کیونکہ ہندوستان کی اس جنگ آزادی کو تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہو ——— میری معصوم بچی خدا حافظ! میں دعا کرتا ہوں کہ خدا تم کو ہندوستان کی خدمت کے لئے ایک جری سپاہی بنائے۔ بہت بہت دعا و پیار۔

تمہارا پاپو۔

(۲)

یکم جنوری ۱۹۳۱ء

میری پیاری اندو

تمہیں یاد ہو گا کہ دو سال قبل جبکہ تم مسوری میں تھیں تو میں نے الہ آباد سے تم کو ایک خط لکھا تھا۔ مجھے حسرت ہوتی اگر میں سلسلہ خط وکتابت منقطع کر کے تم کو اپنے حالات سے بے خبر رکھتا لیکن مراسلت کے ضمن میں مجھے ہمیشہ تامل سے کام لینا پڑا۔ دنیا کی گزشتہ تاریخ پر غور وخوض کرنا ایک دلچسپ مشغلہ ہے۔ تاریخ کا مطالعہ بڑی اچھی چیز ہے مگر تاریخ بنانے میں مدد دینا مطالعہ سے کہیں زیادہ دلچسپ اور دلفریب ہے۔ ہندوستان کا ماضی ایک داستان پارینہ ہے جس کو قدامت اور امتداد کے کہرے نے چھپا لیا ہے۔ ہمارے ملک کی تاریخ کا دامن ایسے غیر خوشگوار اور افسردہ ادوار سے لبریز ہے جن کے تصور سے ہمیں شرم آتی ہے اور دکھ ہوتا ہے۔ لیکن مجموعی حیثیت سے یہ ایک ایسا شاندار ماضی ہے جس پر ہم بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں لیکن اب اتنا وقت نہیں کہ ہم تمام گزشتہ واقعات کے متعلق کچھ سوچ سکیں۔

نینی جیل میں مجھے حسبِ دلخواہ لکھنے پڑھنے کے لئے کافی فرصت ہے لیکن جب میں یہ تصوّر کرتا ہوں کہ وہ عظیم الشان جدوجہد جو جیل کی چار دیواری سے باہر جاری ہے اُس میں لوگ کس طرح حصّہ لے رہے ہیں اور میں اگر اُن کے ساتھ ہوتا تو کیا کرتا تو میرے ذہن پر ایک انتشاری کیفیت مستولی ہو جاتی ہے۔ حال و مستقبل نے میرے دل و دماغ کو اتنا متاثر کیا ہے کہ میرے پاس ماضی کے متعلق غور و خوض کرنے کے لئے وقت نہیں ہے لیکن اصل سبب کیا میں تمہیں بتا دوں کہ میں نے اِس سلسلۂ خط و کتابت کو کیوں بند کر دیا؟ مجھے اب شک ہو چلا ہے کہ آیا میری معلومات تمہیں تعلیم دینے کے لئے کافی بھی ہیں؟

میں نہیں جانتا کہ میرے خطوط تمہارے لئے دلچسپی کا باعث ہوں گے اور تم اُن کو پڑھنا پسند بھی کرو گی یا نہیں؟ تعجب ہے کہ ہم لوگ اس قدر نزدیک ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے اس قدر دور رہیں ہم دونوں دریائے جمنا کے دونوں کناروں پر ہیں اگرچہ ایک دوسرے سے زیادہ فاصلہ پر نہیں۔ تاہم نینی جیل کی بلند چہار دیواری نے بُری طرح ہم دونوں کو جدا کر رکھا ہے دو ہفتہ میں ایک بار میں خط لکھ سکتا ہوں اور دو ہفتوں میں ایک بار میرے پاس خط آ سکتا ہے اور دو ہفتوں میں ایک بار بیس منٹ کے لئے میں لوگوں سے ملاقات کر سکتا ہوں۔ تاہم یہ پابندیاں خوب ہیں۔ اگر کوئی چیز ہمکو آسانی اور فراوانی سے دستیاب ہو سکتی ہے تو ہم اس کی بالکل قدر نہیں کرتے میں یقین کرنے لگا ہوں کہ قید کا زمانہ انسان کی تعلیم کا نہایت خوشگوار حصّہ ہے۔ اور آج ہمارے ملک کے لاکھوں آدمی یہ سبق حاصل کر رہے ہیں۔

میں یوں بھی اکثر اوقات تمہیں بہت یاد کیا کرتا ہوں۔ مگر آج تو تم مشکل ہی سے میرے تصور سے جدا ہوئی ہو، آج سے نئے سال کا آغاز ہے میں بہت سویرے بستر پر لیٹا ستاروں کو غور سے دیکھ رہا تھا کہ مجھے اس اہم سوال کا خیال آیا جو اپنی تمام اُمیدوں اور مسرتوں کے ساتھ ختم ہو گیا اور میں نے باپو گاندھی جی کا خیال کیا جنہوں نے یروداجیل میں بیٹھ کر علمی طور پر ہمارے بوڑھے ملک کی رگ و پے میں جوانی کا پُر جوش خون دوڑا دیا ہے اور میں نے دادو (پنڈت موتی لال نہرو۔ اندرا کے دادا) کا خیال کیا اور ان کے علاوہ اور بہت سے لوگوں کا بھی۔ خاص طور پر ماّمی اور تم کو بہت یاد کیا۔ دن نکلے خبر ملی کہ ماّمی گرفتار کر کے جیل بھیج دی گئیں۔ یہ سالِ نو کا نہایت خوشگوار تحفہ تھا اس کی توعرصہ سے توقع کی جا رہی تھی اور مجھے یقین ہے کہ ماّمی بھی صد درجہ مطمئن اور خوش و خرّم ہوں گی۔

البتہ تم ضرور اکیلی ہو گئیں۔ پندرہ دن میں ایک مرتبہ تم ماّمی کو دیکھ سکو گی اور پندرہ دن میں ایک مرتبہ مجھ کو اور ہمارے پیغامات ایک دوسرے کے پاس لیجاؤ گی لیکن میں قلم اور کاغذ لیکر بیٹھ جاؤں گا۔ اور تمہارا تصوّر کروں گا۔ تم آہستہ سے میرے پاس آ جاؤ گی تو پھر ہم بہت کچھ باتیں کریں گے اور ہم ماضی کا خواب دیکھیں گے اور مستقبل کو ماضی سے بھی زیادہ شاندار بنانے کے لئے تدابیر سوچیں گے۔

(تمہارا جاں نثار باپو)

(۳)

۵؍جنوری ۱۹۳۱ء

پیاری بیٹی تم کو کیا لکھوں اور کہاں سے ابتدا کروں۔ جب میں ماضی کا خیال کرتا ہوں تو میرے دماغ میں متعدد تصویریں پھر جاتی ہیں۔ نادانستہ طور پر جو واقعات آجکل رونما ہو رہے ہیں اُن کا مقابلہ میں گزشتہ واقعات سے کرتا ہوں اور اپنی رہبری کے لئے اُن سے سبق حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن انسان کا دماغ بھی کس قدر خلط ملط ہے جو غیر مسلسل خیالات اور نامرتب نقوش سے لبریز ہے جیسے کسی برآمدہ میں متعدد اقسام کی تصویریں غیر مرتب اور بلا امتیاز اِدھر اُدھر پڑی ہوں

تاریخ کے مطالعہ سے ہم کو سیکھنا چاہیئے کہ دُنیا نے کس قدر تدریجی لیکن یقینی ترقی کر لی ہے۔ زمانۂ جاہلیت سے زمانۂ شائستگی تک انسان کی ترقی تاریخ کا ایک اہم مبحث خیال کیا جاتا ہے۔ میں نے اپنے بعض خطوط میں ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ اتحادِ عمل یعنی مل کر کام کرنے کا خیال کس طرح ترقی کر گیا ہے اور کس طرح ہمارا مطمحِ نظر متحد ہو کر مفادِ عامّہ کیلئے متحدہ کوشش ہونا چاہیئے لیکن جب ہم تاریخ کی وسعت پر نظر ڈالتے ہیں تو صاف ظاہر نہیں ہوتا کہ اس مطمحِ نظر نے کچھ زیادہ ترقی کی ہے یا ہم بہت زیادہ مہذّب اور ترقی یافتہ ہیں۔ لاکھوں سال کی ترقی کے بعد بھی ہم لوگ بہت پیچھے اور نامکمل ہیں۔ خدا جانے کہ ہم لوگوں کو تربیت یافتہ اور ہوشیار لوگوں کی طرح زندگی بسر کرنے کے لئے کتنا عرصہ درکار ہوگا؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ زمانۂ ماضی میں ہمارا ملک تہذیب و تمدّن میں نمایاں حیثیت رکھتا تھا اور بہر حالت میں ہمارے حال (ــــــــ) سے بہتر تھا۔

ہماری قدیم سنسکرت ادب کی کسی کتاب میں ایک شعر ہے جس کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے کہ خاندان کے لئے افراد کو قربان ہونا چاہیئے، جماعت کے لئے خاندان کو، ملک کے لئے جماعت کو اور روحانیت کے لئے تمام دُنیا کو۔ روحانیت کیا چیز ہے؟ ہم میں سے بہت کم لوگ اس کو سمجھتے اور بیان کر سکتے ہیں اور ہر شخص اس کی ایک جُداگانہ طور پر تعریف کر سکتا ہے لیکن جو سبق کہ یہ سنسکرت کی کتاب سکھاتی ہے یہ وہی اتحادِ عمل اور وسعتِ ایثار کا سبق ہے ہندوستان میں ہم لوگوں نے اس حقیقی بزرگی کی شاہراہ کو یک لخت فراموش کر رکھا ہے لیکن اب پھر اس کی جھلک پیدا ہو رہی ہے اور سارا ملک بیدار ہو چلا ہے مردوں عورتوں لڑکوں اور لڑکیوں کا یہ نظارہ کس قدر تعجب خیز ہے کہ سب کے سب ہنستے ہوئے اپنے تن من سے بے فکر ہندوستانی مفاد کی خاطر اپنے آرام و آسائش کو بالائے طاق رکھ کر جنگِ آزادی میں شرکت کے لئے جوق جوق روانہ ہو رہے ہیں۔ ہاں یہ لوگ مطمئن اور شاد و خرّم ہو سکتے ہیں کیونکہ یہ ایک بڑے مفاد کی خدمت کر رہے ہیں اور وہ لوگ جو خوش قسمت ہیں ان کو ایثار کی نعمت بھی حاصل ہے آج ہم ہندوستان کو آزاد کرانے کی کوشش کر رہے ہیں یہ ایک اہم تجربہ ہے لیکن اس سے زیادہ اہم خود انسانیت کا مفاد ہے اور چونکہ ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہماری جدوجہد اُس عظیم الشان جدوجہد کا ایک حصّہ ہے جو نبی نوعِ انسان کی مصیبتوں کو ختم کریگی ہم فخر کر سکتے ہیں کہ ہم لامحالہ دُنیا کو ترقی کرنے میں مدد دے رہے ہیں۔

اس وقت تو حسنِ و رتم آنند بھون میں ہو ماّمی ملکا جیل میں اور میں یہاں نینی میں ہوں۔ اور ہم ایک دوسرے سے بُری طرح جدا ہو گئے ہیں لیکن اس دن کا خیال کر جب ہم لوگ پھر ایک دوسرے سے ملیں گے میں اس دلفریب خیال کو اپنے دماغ میں جگہ دوں گا اور اس سے مجھے اطمینان اور قلبی سکون حاصل ہوگا ـــــ دُعا دو بہار

(تمہارا باپو)

(۴)

۷؍جنوری ۱۹۳۱ء

نور نظر۔ تم کو دیکھ کر میرے دل کو غیر معمولی طمانیت حاصل ہوتی ہے لیکن [illegible] اور جیل ہو [illegible] مجھے بہت زیادہ [illegible] ہو۔ آج جس وقت میں تمہیں خط لکھنے بیٹھا تو [illegible] کان میں آئیں [illegible]

81

کیا چلا رہے ہیں لیکن بعد میں وہی صدائیں مجھے کچھ مانوس سی معلوم ہوئیں اور اصلیت زیادہ عرصہ تک مخفی نہ رہ سکی۔ "انقلاب زندہ باد"! "انقلاب زندہ باد"!! جیلخانہ ان پُر جوش صداؤں سے گونج اٹھا اور ہمارے دل ان نعروں کو سُن سُن کر مسرور ہو رہے تھے ہم کو یہ نہ معلوم ہو سکا کہ جیل کے باہر اس قدر نزدیک صدائیں بلند کرنے والے لوگ کون تھے؟ آیا یہ لوگ شہر سے آئے تھے یا یہیں قریب کے دیہاتی کسان تھے۔ بہر حال کوئی بھی ہوں انہوں نے ہمارے دلوں کو مسرور کر دیا اور ہم نے یہاں سے ان صداؤں کے جواب میں خاموش مبارکباد بھیجی۔ ہماری دُعائیں ان کے ساتھ گئیں۔

ہم کو "انقلاب زندہ باد" کا نعرہ کیوں بلند کرنا چاہئیے؟ ہم تغیر اور انقلاب کو کیوں پسند کرتے ہیں؟ دراصل آج ہندوستان کو ایک عظیم الشان انقلاب کی ضرورت ہے لیکن انقلاب عظیم کے بعد بھی جب ہندوستان بالکل آزاد ہو جائے گا ہم اطمینان سے نہیں بیٹھ سکتے۔ دُنیا کی کوئی ایسی جاندار ہستی نہیں ہے جو تغیرات کو قبول نہ کرتی ہو۔ کائنات کی ہر شے میں یوماً فیوماً اور لمحہ بلمحہ تغیر ہوتا رہتا ہے۔ صرف مُردے نشوونما سے محفوظ اور مطمئن ہیں لیکن اکثر اس امر کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں کہ دُنیا بدلتی رہتی ہے یہ لوگ اپنے دماغ کے دروازوں کو بند اور مقفل رکھتے ہیں کیا مجال کہ کوئی نیا خیال دماغ میں داخل تو ہو جائے اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ ان کی اس پست ذہنی کے باوجود دُنیا حرکت کرتی رہتی ہے اور چونکہ یہ اور ان کے ایسے چند دوسرے لوگ تغیرات کو بخوشی خاطر قبول نہیں کرتے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کو عظیم ترین نقصانات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

انقلاب دنیا میں ہوتے ہی رہتے ہیں۔ مثلاً آج سے ایک سو چالیس سال قبل فرانس میں "انقلاب عظیم ہوا" یا ابھی تیرہ سال قبل روس میں انقلاب ہوا۔ اس طرح ہمارے ملک میں بھی ہم لوگ آج کل انقلاب کی درمیانی . . . . حالت میں ہیں۔ یقیناً ہم آزادی چاہتے ہیں لیکن اس کے علاوہ کچھ اور بھی چاہتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ گندے نالوں کو صاف کر کے ان کی جگہ صاف اور تازہ پانی کی فراوانی ہو، ہم کو گندگی، مصائب اور افلاس سے ملک کو قطعی پاک وصاف کر دینا چاہئیے اور جہاں تک ممکن ہو ہم کو اس مکڑی کے جالے کو بھی صاف کر دینا چاہئیے جس نے اکثر لوگوں کے دماغ کو گندہ بنا رکھا ہے۔

ہم اس وقت انقلاب کی چوکھٹ پر پہنچ گئے ہیں "مستقبل" ہمارے لئے کیا لائیگا ہم نہیں کہہ سکتے لیکن "حال" نے بھی ہم کو ہماری محنتوں کا کافی معاوضہ دیا ہے۔ ہندوستان کی عورتوں کو دیکھو وہ کتنے جوش و خروش کے ساتھ اس جدّوجہد میں حصہ لے رہی ہیں "پردہ" جس نے ہماری حسین اور بہادر دیویوں کو چھپا رکھا تھا اور جو ان کے اور اُن کے ملک کیلئے ایک عذاب تھا۔ آج وہ پردہ کہاں ہے؟ کیا قرون اولیٰ کی یہ وبا ہمارے یہاں . . . . سے تیزی کے ساتھ صاف نہیں ہو رہی ہے؟ کمسن لڑکوں اور لڑکیوں کو دیکھو! ان میں اکثر کے والدین نے ان کے ساتھ قدیم غلام اور بزدل لوگوں کا سا برتاؤ کیا ہوگا لیکن کسی کو شک و شبہ کرنے کی بھی جرأت ہو سکتی ہے کہ ہماری قوم کے بچے آیندہ اس غلامی اور بزدلی کے بار کو ہرگز برداشت نہ کر سکیں گے۔

اور اب تو انقلاب کا پہیہ گھوم چکا ہے اور ہم نے اس وقت اس کو ایسا دھکا دے دیا ہے کہ اس کو اب دُنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔ "انقلاب زندہ باد"!

(تمہارا عاشق باپو)

(۵)

۸ر جنوری سنہ ۱۹۳۱ء

پیاری اندو

میں تم سے پچھلے خط میں کہہ چکا ہوں کہ کائنات کی تمام چیزیں مسلسل تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔ تاریخ دراصل کیا ہے انقلابات کا ایک رجسٹر۔

آج یورپ محفوظ اور طاقتور ہے اور اس کے باشندے خود کو دُنیا میں سب سے زیادہ مہذب اور شایستہ خیال کرتے ہیں۔ یہ لوگ ایشیا اور اُس کے باشندوں پر نظریں جمائے رکھتے ہیں۔ آتے ہیں اور جہاں کہیں سے جو چیز مل جاتی ہے اُڑا لیجاتے ہیں — زمانہ کس قدر بدل گیا ہے؟ آؤ ہم ایشیا اور یورپ پر ایک تفصیلی نظر ڈالیں۔

ایک اٹلس کھولو اور دیکھو کہ ذرا سا یورپ معظیم الشّان ایشیا سے بالکل ملا ہوا ہے اور اس کا بالکل ضمیمہ معلوم ہوتا ہے جب تم تاریخ کا مطالعہ کرو گی تو معلوم ہوگا کہ ایشیا عرصہ دراز تک ذماں روا رہا ہے، یہاں کے باشندوں نے بار بار جا کر یورپ کو فتح کیا ہے۔ انہوں نے یورپ کو تاراج کیا اور انہوں نے یورپ کو مہذّب بنایا۔ آریہ، سیتھین، ہُن، عرب منگول، ترک یہ سب قومیں دوسرے مقامات سے آئیں اور ایشیا و یورپ میں پھیل گئیں۔ ایشیا پر لوگ ٹڈی دل کی طرح چھا گئے . . . . . . یہ حقیقت ہے کہ یورپ عرصہ دراز تک ایشیا کی ایک نو آبادی کی سی حیثیت رکھتا تھا۔ اور یورپ کے اکثر باشندے ایشیا کے انہیں حملہ آوروں کی نسل سے ہیں۔

ایشیا نقشہ پر ایک ہیبت ناک دیو کی طرح چھایا ہوا ہے اور یورپ بالکل ذرا سا ہے لیکن دراصل اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایشیا جسامت میں بڑا ہونے کی وجہ سے فضیلت رکھتا ہے اور یورپ آیا وہ توجہ کا مستحق نہیں ہے جسامت کسی انسان یا ملک کی بڑائی کی سب سے زیادہ غیر یقینی جانچ ہے۔ ہم بخوبی جانتے ہیں کہ یورپ باوجودیکہ براعظموں میں سب سے چھوٹا ہے، آج ایک بلند مرتبہ رکھتا ہے، ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اس کے اکثر ممالک خاص طور پر ممتاز ہیں۔ انہوں نے بہت بڑے بڑے سائنسداں پیدا کئے ہیں جنہوں نے اپنی ایجادات و اختراعات سے انسانی تمدّن کو ترقی دے کر مردوں اور عورتوں کو زندگی بسر کرنے کے لئے بہت سی آسانیاں فراہم کر دی ہیں۔ وہاں بہت سے ادیب، حکیم، مصوّر، موسیقی داں اور عملی لوگ پیدا ہوئے ہیں۔ اگر یورپ کی بزرگی کا اعتراف نہ کیا جائے تو حماقت ہے۔ لیکن ایشیا کی بڑائی کو فراموش کر دینا بھی ویسی ہی حماقت ہے۔ ہم کسی قدر یورپ کی چمک دمک میں محو ہونے کے عادی ہو گئے ہیں۔ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہئیے کہ یہ ایشیا ہی ہے جس نے بڑے بڑے روحانی رہنما پیدا کئے اور انہوں نے جس قدر دُنیا کو متاثر کیا ہے۔ شاید ہی کسی اور نے کیا ہو۔ یہ خاص خاص مذاہب کے بانی تھے ہندو مذہب جو حال کے بڑے بڑے مذہبوں میں سب سے زیادہ قدیم ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان کی پیداوار ہے۔ اسی طرح بدھ مت ہے جو آج کل جاپان، چین برما، تبت اور سیلون میں پھیلا ہوا ہے۔ عیسائیوں اور یہودیوں کے مذاہب بھی ایشیائی ہیں، پارسیوں کا مذہب ایران میں شروع ہوا اور تم جانتی ہو کہ مذہب اسلام کے بانی محمدؐ عرب کے ایک شہر مکہ میں پیدا ہوئے تھے۔ کرشن، مہاتما بدھ، زردشت مسیح، محمدؐ، غرض ایشیا کے فلسفیوں کی فہرست سے تم صفحہ کے صفحہ رنگ سکتی ہو۔ یہی نہیں بلکہ ایشیا کے بڑے بڑے عملی رہنماؤں کے ذکر سے بھی تم متعدد صفحے بھر سکتی ہو۔ اور

میں دیگر متعدد طریقوں سے تم کو یہ بات دکھا سکتا ہوں کہ گزشتہ زمانہ میں یہ قدیم برّ اعظم کیسی عظیم الشان حیثیت رکھتا تھا۔

زمانہ کس قدر تبدیل ہو گیا ہے؟ لیکن یہ پھر ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے تبدیل ہو رہا ہے۔ آج ایشیا اپنے طول طویل خواب کے بعد بیدار ہو رہا ہے۔ تمام دُنیا کی نظریں اُسی پر لگی ہیں۔ کیونکہ ہر ایک جانتا ہے کہ مستقبل میں ایشیا ایک اہم حیثیت اختیار کرنے والا ہے ــــ پیار

(تمہارا باپو)

(۶)

۱۰ر جنوری ۱۹۳۱ء

پیاری اندو

آج تم میں سے کوئی شخص مجھ سے ملنے نہ آیا اور دن یوں ہی خالی گیا۔ مجھے بڑی مایوسی ہوئی۔ سب سے زیادہ تکلیف دہ چیز تم لوگوں کے نہ آنے کا عذر تھا جس سے مجھے مطلع کیا گیا۔ مجھے بتایا گیا کہ دادو کی طبیعت ناساز ہے اس سے زیادہ اور کچھ نہ معلوم ہو سکا۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ آج ملاقات نہ ہو سکے گی تو میں نے چرخہ پر کچھ سوت کاتا۔ سوت کاتنے اور بُننے سے مجھے بڑی تسکین ہوتی ہے۔ پس آشفتہ حالی کا بہترین علاج چرخہ ہے۔

(تمہارا چاہنے والا باپو)

(۷)

۱۳ر جنوری ۱۹۳۱ء

میری نورِ نظر بیٹی

کل تم سب سے مل کر مجھے مسرت ہوئی۔ لیکن دادو کو دیکھ کر میرے دل کو شدید صدمہ پہنچا۔ وہ بہت ہی مضمحل اور علیل نظر آتے تھے۔ ان کی اچھی طرح دیکھ بھال کرو اور اُن کو پھر صحیح و توانا بنا دو۔ میں تم سے کل بہت ہی کم بات چیت کر سکا۔ واقعہ بھی یہ ہے کہ اس قدر مختصر ملاقات میں کوئی آدمی کیا کیا کر سکتا ہے؟ میں ان خطوط کے ذریعہ تمام ملاقاتوں اور گفتگوؤں کی تلافی کی کوشش کرنا چاہتا ہوں لیکن میرے مکتوبات ان کا صحیح بدل نہیں ہو سکتے اور حیلہ سازی زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہ سکتی۔ تاہم بعض اوقات حیلہ سازی میں بڑا لُطف آتا ہے۔

(عاشق باپو)

(۸)

۲۳ر جنوری ۱۹۳۱ء

پیاری اندو ـــ

تمہارا راحت نامہ موصول ہوا اور یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی کہ ماں اور تم دونوں صحت یاب ہو رہی ہو۔ لیکن میری تمنا ہے کہ دادو کو بھی بخار اور دوسری تکالیف سے نجات مل جائے۔

تمہاری تحریر سے معلوم ہوا کہ تم گھر کی لائبریری کی بہت سی کتابوں کا مطالعہ کر چکی ہو اور اب چاہتی ہو کہ میں تمہارے لئے مزید کتابیں تجویز کروں۔ لیکن تم نے مجھے یہ نہیں بتایا کہ اب تک کیا پڑھا۔ مطالعہ ایک اچھی عادت ہے لیکن ان لوگوں سے جو نہایت تیزی کے ساتھ کتابیں پڑھ جاتے ہیں میں بدگمان ہوں۔ اگر کوئی کتاب واقعی قابل مطالعہ ہے تو وہ غور و فکر سے پڑھی جانے کے لایق ہے بہرحال مطالعہ کا شغل بدستور جاری رکھو۔ میں تم کو نینی جیل سے حتی الوسع امداد دیتا رہوں گا۔ جس رفتار کے ساتھ تم ذہنی اور جسمانی ترقی کر رہی ہو اُس پر میں اکثر غور کیا کرتا ہوں۔ سوچو کہ مجھے تمہارے ساتھ رہنا کتنا محبوب ہوگا۔

آج بسنت پنچمی ہے یعنی بہار آ گئی۔ جاڑے کا موسم ختم ہو چلا اور ہوا کی وہ غیر خوشگوار خنکی اور تیزی جاتی رہی۔ خوشنما پرندوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا ہے جن کے شیریں نغموں نے فضا کو پُرکیف بنا دیا ہے آج سے ٹھیک پندرہ سال قبل دہلی میں تمہاری ماں اور میں ایک دوسرے کے شریک زندگی بنے تھے۔

(تمہارا عاشق باپو)

(۹)

۲۴ اپریل ۱۹۳۱ء

پیاری اندو

مجھے خط لکھے ہوئے بہت عرصہ ہو گیا۔ تقریباً تین ماہ گزر گئے رنج و غم، مصیبت اور پریشانی کے تین ماہ، ہندوستان میں تغیر کے تین ماہ، اور ہمارے تمام دائرہ خاندان میں انقلاب کے تین ماہ! ہندوستان نے کچھ دنوں کے لئے "ستیہ گرہ" کو موقوف کر دیا ہے لیکن جو مسائل ہمارے سامنے درپیش ہیں اُن کا حل کرنا آسان نہیں۔ ہمارے خاندان نے اپنے عزیز ترین سرپرست کو کھو دیا ہے جس سے ہمیں ہمت اور تقویت حاصل ہوتی تھی، اور جس کے سایہ میں ہم پلے بڑھے اور بھارت ماتا کے لئے کچھ کرنا سیکھا۔

نینی جیل کا وہ دن مجھے بالکل اسی طرح یاد ہے جنوری کی ۲۶ تاریخ تھی میں حسبِ معمول تمہیں لکھنے کے لئے بیٹھ گیا یہ ہمارے واسطے ایک اہم دن تھا کہ ایک سال قبل اسی دن ہم لوگوں نے تمام ہندوستان میں کیا شہر اور کیا دیہات "یوم آزادی" منایا تھا اور ہم میں سے لاکھوں نے "عہد نامۂ آزادی" پر دستخط کئے تھے۔

اس وقت سے جو نکہ ایک سال گزر چکا تھا مصائب، تکالیف اور جدوجہد کا ایک سال اور ہندوستان پھر اُسی دن کی یادگار منانے جا رہا تھا میں نینی جیل کی بارک میں بیٹھا تھا۔ اور اُن جلسوں، جلوسوں، لٹھ بازیوں اور گرفتاریوں کا منظر جو اُس دن تمام ملک میں پیش آنے والے تھے میری نظروں میں گھوم رہا تھا۔ میں نہایت فخر، مسرت اور درد کے ساتھ اس خیال میں محو تھا کہ اچانک میری محویت ٹوٹ گئی۔ بیرونی دُنیا سے میرے پاس پیغام لایا گیا کہ دادو سخت علیل ہیں اور میں اُن کے پاس جانے کے لئے فوراً رہا کر دیا جاؤں گا۔

قبل اس کے کہ دادو ہم لوگوں سے ہمیشہ کے لئے جدا ہوں میں دس دن تک اُن کے ساتھ رہا دس دن اور دس راتوں کو ہم نے ان کی کرب و بے چینی اور رفتہ رفتہ موت کے ساتھ دلیرانہ جنگ کا مشاہدہ کیا۔ زندگی میں بہت سی لڑائیاں انہوں نے لڑیں اور بہت سی لڑائیوں میں انہوں نے فتح حاصل کی۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ موت پر کس طرح غالب آئیں یا کم از کم کس طرح اُس کا مقابلہ کریں۔ . . . .

. . میں جس وقت اُن کی اس آخری جدوجہد کو دیکھ رہا تھا اور اس بے بسی اور ناکامیابی پر سخت پیچ و تاب کھا رہا تھا کہ اپنی عزیز ترین ہستی کی امداد میں ایسے وقت کچھ نہیں۔ مجھے وہ چند سطریں یاد آ گئیں جو میں نے عرصہ ہوا ڈاکٹر اینی بیسنٹ (؟) کے ایک افسانہ میں پڑھی تھیں "انسان اپنے آپ کو آخری وقت تک دشمنوں کے سپرد نہیں

۸۳

کرنا چاہتا لیکن وہ اپنی ناتوانی اور کمزوری سے مجبور ہو جاتا ہے "

یہ ۶ فروری کا واقعہ ہے کہ علی الصباح انہوں نے ہم لوگوں کو ہمیشہ کے لئے چھوڑا ہم اُن کی لاش کو قومی جھنڈے میں جوان کو بہت عزیز تھا لپیٹ کر لکھنؤ سے آنند بھون لائے۔ چند گھنٹے بعد اُن کا جسم مٹھی بھر خاک میں تبدیل ہو گیا تھا اور گنگا اس نایاب بوجھ کو اپنے کاندھوں پر اُٹھا کر سمندر تک لے گئی۔

کروڑوں آدمیوں نے اُن کا ماتم کیا۔ لیکن ہمیں کیا جو کہ ان کے بچے ہیں ان کے گوشت کا گوشت اور ان کی ہڈی کی ہڈی ہیں! ہم اُن کا غم مناتے ہیں اور قدم قدم پر اُن کا ماتم کرتے ہیں۔ اور جوں جوں دن گزرتے ہیں اُن کا رنج نہیں گھٹتا اور ان کی جدائی قابل برداشت نہیں ہوتی۔ لیکن پھر بھی میں خیال کرتا ہوں کہ ان کی روح ہم کو اس حالت میں دیکھنے کی توقع نہیں رکھتی۔ وہ نہیں پسند کرتی کہ ہم ان کا ماتم کریں بلکہ ہم سے وہ چاہتی ہے کہ مصیبتوں کا مقابلہ کریں۔ جیسے کہ انہوں نے کیا اور اُن پر فتح پائیں۔ ان کی مرضی یہ ہوگی کہ جس کام کو انہوں نے نامکمل چھوڑا ہے ہم لوگ اس کو جاری رکھیں۔

ہم چین سے بیٹھ کر سوگ کیسے منا سکتے ہیں۔ جبکہ کام ہم کو بلا رہا ہے اور ہندوستان کا مفاد ہماری خدمات کو طلب کر رہا ہے۔ اسی مفاد کی خاطر مرحوم نے جان دی اسی مفاد کی خاطر ہم لوگ زندہ رہیں گے جد و جہد کریں گے اور اگر ضرورت ہوئی تو جان بھی دیں گے

(تمہارا عاشق بابو)

(۱۰)

بریلی ڈسٹرکٹ جیل
۲۶ مارچ سنہ ۱۹۳۲ء

میری پیاری اندو

چودہ مہینہ ہوئے کہ میں نے تم کو نینی جیل سے خط لکھا تھا لیکن ان دنوں ہندوستان کی تمام شاہراہیں نزدیک و دور ایک ہی منزل پر ختم ہوتی ہیں۔ تمام سفروں کی ایک ہی منزل مقصود ہے اور وہ جیلخانہ ہے! اب میں پھر اپنی قدیم رفیق چہار دیواری میں واپس آ گیا ہوں اور میرے پاس غور و خوض کرنے اور تمہیں لکھنے کے لئے کافی وقت ہے۔ لڑائی پھر شروع ہو گئی ہے۔ اور ہمارے بھائی جنگ آزادی میں شریک ہو رہے ہیں۔ تاکہ ملک کو افلاس و نکبت کے پنجہ سے چھڑائیں۔ لیکن آزادی ایک ایسی دیوی ہے جس کا حاصل کرنا دشوار ہے وہ قدیم دستور کے مطابق اپنے خواہشمندوں سے قربانیاں چاہتی ہے۔

میں آج تین مہینہ پورے کر رہا ہوں۔ تین ماہ قبل اسی دن (۲۶ دسمبر کو) میں چھٹی بار گرفتار کیا گیا تھا۔ میں نے ان خطوں کے سلسلے میں تمہارا بہت وقت لے لیا۔ مجھے جیل میں یکسوئی حاصل کرنے اور بیرونی واقعات کی فکروں کو فراموش کرتے تھوڑا وقت لگ جاتا ہے۔ اب میں تمہیں پابندی سے لکھنے کی کوشش کروں گا۔ لیکن اب میں دوسری جیل میں ہوں اور یہ تبدیلی میرے مزاج کے ناموافق ہے جس سے میرے کام میں تھوڑا سا حرج ہوتا ہے۔ یہاں میرا دائرۂ افق (   ) ہمیشہ سے بلند ہے۔ یہ دیواریں جو میرے سامنے ہیں اُن کا تعلق کم از کم گرمی کی حد تک دیوار چین سے ضرور ہے یہ بلندی تقریباً ۲۵ فیٹ ہے اور سورج کو ہر صبح ہمارے پاس آنے سے قبل ڈیڑھ گھنٹہ اس چڑھائی کو طے کرنے میں صرف کرنا پڑتا ہے۔

ہمارا دائرۂ افق کچھ دیر کے لئے محدود ہو سکتا ہے۔ مگر نیلے عمیق سمندر، پہاڑ اور ریگستانوں کا تصور جو ہم نے، تم نے اور ماں نے دس ماہ قبل سفر سیلون (جو اب مشکل سے اصلیت پر مبنی معلوم ہوتا ہے) کے سلسلے میں طے کئے تھے۔ بہت زیادہ خوشگوار ہوتا ہے۔

(تمہارا عاشق بابو)

(ایشیا دامریکہ)

گُل ہائے جعفری

وہ عہدِ نشاط و عیش کوشی گزرا
وہ دورِ سرور و بادہ نوشی گزرا
ہنگامِ خلوص و گرمجوشی گزرا
جب دل میں خیالِ حق فروشی گزرا

پرداخت نہ ہونے پہ بھی جو لہکا ہے
دب دب کے جو اخگر کی طرح دہکا ہے

کیا پھول ضمیر ہے معاصی نے جسے
جتنا کچلا اُسی قدر مہکا ہے

نواب
جعفر علی خاں اثر بی اے لکھنوی

بے تاج کا بادشاہ

اے جواہر! اے بہارِ گلستانِ آریہ
ہے ترے پیکر میں کیا روحِ درونا چاریہ

اے کہ تو ہے گوہرِ جیب و گریبانِ وطن
نور سے تیرے منوّر ہے شبستانِ وطن

بازوئے ارجن کی شکتی بھیم کی طاقت ہے تو
ابھمنیو کے دلِ خوددار کی غیرت ہے تو

سانکی کی طرح تو ہے مردِ میدانِ وفا
تو نے رکھ لی ابھمنیو کی طرح شانِ وفا

سینۂ ہندی میں پھر تجدیدِ ساز و سوز ہے
سوم دت کیا تیرے پیکر میں حیات افروز ہے

جس طرح سہدیو نے پشپک بجایا تھا کبھی
جس طرح ارجن وغا میں گڑگڑایا تھا کبھی

تو بھی ہے ہندوستاں میں نغمہ خوانِ حریّت
زندہ باد اے شانِ آزادی و جانِ حریّت

بحر و بر لرزے میں ہیں کون و مکاں لرزے میں ہیں
تیرے نغموں سے دلوں کے آسماں لرزے میں ہیں

تیرے نغمے گرم کرتے ہیں محبت کا لہو
روپ میں انساں کے گوپال کی بنسی ہے تو

شاہکارِ صنعتِ بتخانۂ آذر ہے تو
جذبۂ ایثار و قربانی کا اک پیکر ہے تو

جس کے دم سے ہے بہارِ وادیٔ شباب رنگ و بو
ہند میں وہ عندلیبِ باغِ آزادی ہے تو

تیرے ہاتھوں میں کوئی دیدے جو ارجن کی کماں
زندہ ہو جائے مہابھارت کی خونیں داستاں

پھر مدھوسودھن سا ہادی ہو ہدایت کیلئے
پھر زمانہ ہو کمربستہ شہادت کے لئے

اے سراسر جوشِ آزادی مجسم انقلاب
زندگی تیری ہے اک سنگیں بغاوت کا شباب

سانس لیتا ہے ترے پیکر میں طوفاں کا شباب
آندھیوں کی نوجوانی زلزلوں کا پیچ و تاب

بے حقیقت ہے تری دنیا میں غم کا ماجرا
موت ہے موجِ تبسم زندگی اک قہقہا

قید و بند ظاہری ہے تیری فطرت تیری خو
خود اسیری جس کی مجنوں ہے وہ زندانی ہے تو

آئینہ میرے تصوّر میں ہے مستقبل ترا
لے اڑے گا تجھ کو آخر جذبۂ کامل ترا

کیف موسم سے فضائے گلستاں موجوں پہ ہے
جذبۂ آزادیٔ ہندوستاں موجوں پہ ہے

تیری ہستی اک نئے احساس کی تمہید ہے
یاس کے عالم میں تو اک مرکزِ امید ہے

جس قدر قطرے ہیں ان قطروں کو پھر دریا کریں
آ کہ میخانے میں پھر ماحول تو پیدا کریں

ساغر نظامی

پریم کی بھینٹ

(مقدمہ از سید فرید جعفری مچھلی شہری مدیر "ایشیا" و "نیرنگ خیال" کے قلم سے)

اردو ادب کے چمنستان میں کچھ ہی دن ہوئے ایک ننھی چھوٹی سی کلی دیکھی پھر اس کلی نے ایک صبح شگفتگی کی آغوش میں خوشبودار نور کی زندگی پائی سب نے محسوس کیا تمام باغ اور اس سے ملحق تمام فضائیں خوشبو سے مہکی جا رہی ہیں سب چونکے اس باغ سے اُس باغ اور پھر تمام کائنات رنگ و بو میں اس کلی کا چرچا ہونے لگا سب نے سنا یہ کلی اپنے نام کی "فرید" تھی اور کوئی پھول اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ فرید اور اس کا قلب و دماغ اب نئی نئی خوشبوؤں سے مہک رہا تھا جوانی کی مہک تھی طاقت کی مہک تھی شہرت و عزت کی مہک تھی باغبانِ فطرت نے کہا اس کی پتیوں کو لالہ کا رنگ دیں۔ یہ فیصلہ کیا اور فرید کے دل کو داغوں سے مجسم چمن بنا دیا۔ اب کیا تھا ہر داغ بجائے خود آفتاب تھا جس نے فرید کی روح کو غم کی روشنی سے منور کر دیا تھا۔

فرید کا قلم اول اول کبھی ٹیگور کی خوشہ چینی کرتا تھا کبھی اس کی کبھی اس کی مگر فطرت کو یہ کب منظور تھا "فرید" کو "فرید" رکھنا تھا اس لئے "پریم کی بھینٹ" دینے کے لئے اسے مجبور کیا۔ تکمیل کے لئے فطرت کا یہ قرض تھا فرید پر جس کی ادائیگی کے بعد وہ امیر زندگی بن گیا اور اب فطرت نے بھی اس پر اپنے خزانوں کے منہ کھول دئے یہ گویا اس کا کارنامہ تھا کہ فرید کا وہ موتی جس کی چمک "آفاقی" تھی اس سے چھین لیا گیا اور فرید کو فرید بنا دیا گیا۔

اب اس فرید ادب کے قلم میں وہ قوت تھی کہ کروٹ ہو رہا تھا تاثرات اور بیان۔ کھنچے جا رہے تھے۔ اس نے مدنیت اور شہرت کی غلیظ فضاؤں سے منہ پھیر لیا اور ٹہلتا ٹہلتا گاؤں میں پہنچا جہاں کی بولی جانتا تھا جس کے طور طریقوں سے واقف تھا "غم" نے موزونی اور شعور کی معراج کرا دی تھی اس لئے اسے وہ بھی آ گیا تھا جو نہیں آتا تھا۔

یہ افسانہ اور اس کے چند تازہ افسانے پڑھتا ہوں اور روتا ہوں روتا ہوں اور حیرت کرتا ہوں کہ اردو کے افسانہ نگاروں سے اور اس لذت و تاثیر سے کیا تعلق جو ذہنی فلسفہ بگھارنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں وہ زندگی اور اس کی حقیقت کو کیا سمجھ سکتے ہیں۔ پریم کی بھینٹ اس فضا کی کہانی ہے جہاں "اپ ٹو ڈیٹ" فرید نظر نہیں آ سکتا لیکن غم نے اس کو حقیقت کا راستہ بتا دیا اور اس کی جستجو کامیاب رہی یقیناً دنیائے ادب میں اب وہ کلی نہیں بلکہ گل سرسبد ہے اور سب کی نگاہیں اس پر جم کر رہ گئی ہیں۔ خدا اس پھول کی خوشبو رہتی دنیا تک قائم رکھے کہ اس سے تمام چمن اور اہل چمن کی امیدیں وابستہ ہیں۔

ساغر نظامی

برسات کے دنوں میں گاؤں میں جگہ جگہ پر نالے بہنے لگتے ہیں، چھوٹے چھوٹے لڑکے اور ننھی ننھی لڑکیاں ان میں کاغذ کی کشتیاں بہاتی ہیں "چپکو ریاں" مارتی ہیں، معصوم قہقہے بلند ہوتے ہیں اور گاؤں کی برساتی فضائیں پھیل جاتے ہیں۔ "بھدونہ" ایک عجیب طرز کی بستی ہے۔ مچھلی شہر کا ایک آباد اور زرخیز گاؤں تو ہے ہی لیکن خصوصیت یہ ہے کہ برسات کے ایام میں جزیرہ سا بن جاتا ہے، جدھر دیکھو پانی ہی پانی نظر آتا ہے۔ بڑی بہار کے دن ہوتے ہیں۔ بچوں کی خوشی کا تو ٹھکانا نہیں ہوتا۔ بچے اور بچیاں ساتھ ہوتے ہیں اور مزے کے کھیل کھیلتے ہیں۔ کاغذ کی کشتیاں بنتی ہیں۔ انہیں پانی میں بہاتے ہیں۔ نالے کے پاس مٹی کے گھروندے ہوتے ہیں، جن میں وہ "میاں بیوی" کے کھیل کھیلتے ہیں۔ ایک لڑکا شوہر بن بیٹھا اور ایک لڑکی بیوی ہو بیٹھی۔ کچھ بچے اور مل گئے۔ پھر کیا ہے گھر گرہستی کی تصویر معلوم ہونے لگتی ہے۔ بڑے پیار کے دن ہوتے ہیں۔ جوان لڑکیوں کے ہنگامی جذبات بھی دیکھنے کے قابل ہوتے ہیں۔ ساون کے موہ لینے والے گانے گائے جاتے ہیں، ٹولیاں بنتی ہیں، "چہلیں" ہوتی ہیں، جھولے پڑتے ہیں، پکوان پکتے ہیں عجیب پر لطف دن ہوتے ہیں

سنہ ۱۹۰۳ء کی برسات بھری پوری برسات تھی بڑے بوڑھے بتاتے ہیں کہ "بھدونہ" بچوں کی کان ہو رہا تھا۔ بڑے پیارے بھولے بھالے بچے تھے۔ رنجیت سنگھ ٹھاکر گاؤں بھر کا دادا تھا۔ اُس کی لڑکی موہنا کو سب ہی پیار کرتے تھے۔ بلدیو "چھپرے" کو سب ہی جانتے ہیں کالڑ کا پرتاپ ہر ایک کی گود میں نظر آتا۔ گاؤں کا مکھیا رام ہرک بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اُس کا لڑکا موہن گاؤں بھر کا لاڈلا تھا۔ ایسے تو گاؤں کے سارے بچے ہی بے چارے تھا مگر ان تینوں میں دانت کاٹی روٹی تھی۔ موہنا کو پرتاب اور موہن کے بغیر چین نہیں، اور پرتاب اور موہن کو موہنا کے بنا سکھ نہیں۔

ایک دن یہ تینوں حسب معمول دلچسپ کھیل کھیل رہے تھے انہوں نے نالے کے پاس ایک مٹی کا مکان بنایا تھا اور گرہستی کے نمونے دکھا رہے تھے۔ کبھی پرتاب مالک مکان بنتا اور کبھی موہن۔ جو مالک مکان ہوتا اُس کی بیوی ہو کر موہنا مکان کی مالکہ بنتی۔ پرتاب ہٹا کٹا ہاتھ پاؤں کا مضبوط تھا۔ موہن دُبلا پتلا اور نازوں کا پالا تھا اور موہنا گلاب کی کلی تھی اور دردمند دل رکھتی تھی، بچوں کو آپس میں محبت تھی اس لئے جب کبھی پرتاب موہن سے اس کے بارے میں لڑتا اور طاقتور ہونے کے باعث اُس کا حق چھین لیتا تو وہ رونے لگتی۔ موہن بھی "ہتھیا" کی موسلا دھار بارش کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا۔ چوٹ کھایا ہوا غصہ آنسوؤں میں بہہ جایا کرتا ہے۔

دن جاتے دیر نہیں لگتی اور زمانہ کی تبدیلی میں رکاوٹیں نہیں ہوتیں۔ بچے بڑھے اور

بڑھکر جوان ہوگئے۔ کلیاں چٹکیں و چہک کر پھول ہوگئیں۔ موہنا کو بچپن ہی سے دونوں دوستوں سے دلی محبت تھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ پرتاب کے مچلتے جذبات اُسے زیادہ متاثر کرتے ہوں اور موہن کے خاموش خیالات اُسے زیادہ گرویدہ نہ بناتے ہوں۔

بڑھتی محبت رنگ لائی، چڑھتی آندھی کا انجام معلوم ہوا۔ پرتاب اور موہنا کا بیاہ رچا، تمنائیں پوری ہوئیں، آرزوئیں بر آئیں۔ بچپن کے خواب کی تعبیر نکلی اور خوب نکلی۔ موہن چونکا لیکن شرافت کے ساتھ۔ دھکا کھایا، گرا لیکن فوراً ہی سنبھل گیا۔ خوب سنبھلا، محبت میں فرق نہ آنے دیا، بچپن کے طور بدلنے نہ دئے۔ پرتاب سے وہی پہلے کا سا [illegible] رہا۔ البتہ موہنا اب "بھابی" ہوگئی تھیں۔ پھر تو چھپے کی سی دلچسپیاں رہنے لگیں اور وہی ہنسی مذاق کی باتیں دہرائی جانے لگیں۔

موہنا کے "پہلوٹی" کا لڑکا ہوا۔ بڑی دھوم دھام ہوئی۔ سب نے شہر والوں کی تقلید میں "مجیب" کے پوتے کو مالامال کر دیا۔ مگر موہن بچے کے گالوں پر دو بوسے ہی دیکر رہ گیا۔ یہ البتہ دیکھا گیا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس کے بعد کسی نے موہن کو نہیں دیکھا۔ جذبات ہی تو تھے، روکا مگر نہیں رکے، تھاما مگر نہیں تھمے، محسوس مگر نہیں ٹھہرے۔

تھوڑے دن پرتاب اور دلہن نے موہن کی یاد کی، پھر رفتہ رفتہ گھر گرہستی کے آئے دن کے "الجھیڑوں" نے بھلا ہی دیا۔

سالوں کے اضافے کے ساتھ ہندوستان کے بچوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا ہے اور انہی دنوں بیکاری کی مہک بڑھ جاتی ہے اور زندگی کے "موسم" کی لو آن کی آن میں خشک کر دیتی ہے۔ یہی غریب پرتاب کے ساتھ ہوا۔ بچے ہوئے تو یکے بعد دیگرے چار اور یقین مانو چار سال میں ساتھ ہی قحط پڑا اور ایک قحط نے دیکھا دیکھی پیداوار بھی برائے نام ہی ہوئی۔ غریب بھوکے مرنے لگے۔ وہ تو کہئے زمیندار کی آبائی ریاست اور شریف پیدائش کام آئی ورنہ غریبوں کو کفن بھی میسر نہ ہوتا۔ مولوی سید علی نہیں تھے، مدبر اور [illegible] باپ "ثقے" مدد کی اور سب کی مدد کی اور خوب کی لیکن کب تک۔ قحط سے چھٹکارا دلایا اور اچھی طرح دلا دیا۔ مگر پیداوار کی کمی کو وہ غریب زمیندار کیا کرتا۔ کسی زمانہ کی تو بات نہ کہ کہا جاتا کہ [illegible]۔ گاؤں والے کام کی تلاش میں کلکتہ، بمبئی کی سیر کرنے لگے۔ انہی کے ساتھ پرتاب نے قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا۔ بیچاری موہنا کی تو مرضی نہ تھی کہ اس کا پریم پیارا نظروں سے اوجھل ہو۔ دیس کی مزدوری پردیس کی حکومت سے [illegible] بہتر ہے مگر پرتاب بچوں کو دیہاتی "بیٹ" نہیں بنانا چاہتا تھا۔ اس نے زمیندار کے لڑکوں [illegible] میں [illegible] میاں کے بچوں سے ان کا اثر لیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اُسی کی طرح اس کے بچے بھی بابو بن جائیں۔ کھیتی باڑی مدت ہوئی ترک کر بیٹھا تھا۔ کھیتی اختیار کی تھی، اچھا شغل تھا۔ ہندوستان زراعتی ملک ہے اس لئے یہ کہنا جھوٹ نہیں کہ یہاں کی بہترین عزت کاشتکاری میں ہے۔ پرتاب کو یہ راز معلوم تھا مگر وہ ترقی کا خواہاں تھا۔ اور اسکا متلاشی۔ وہ [illegible] بتایا گیا تھا کہ "ترقی یافتہ کاشتکاری" میں ہے اور یہ "ترقی یافتہ کاشتکاری" وہ نہیں اس کے بچے سیکھ سکتے تھے مگر گھر بیٹھے نہیں۔ اس کے لئے الہ آباد جانا ہوتا، کانپور کی خاک چھاننی ہوتی اور پھر اس ڈگری حاصل کرنے کے لئے کوسوں سات سمندر پار جانا ہوتا۔ مگر یوں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر خیالی پلاؤ پکانے سے تو کچھ حاصل ہوتا نہیں۔ روپیہ بغیر اس انگریزی راج میں کوئی آرزو پوری نہیں ہو سکتی۔ پیسہ دیس کے باہر ہی ملتا ہے۔ پرتاب نے سوچا [illegible] چار برس اسی کے ساتھ چلا جاؤں [illegible] کما کر واپس آئے تو بچے [illegible] پیسہ [illegible] بچوں کو "اعلیٰ ترقی" [illegible]

مشکل سے رضامند ہوئی اور پرتاب دیوی کو سسکتی چھوڑ ایک شام چلا ہی گیا۔ موہنا بڑی دیر تک روتی رہی۔ بات بات وقت گود کے بیمار بچے کے بالوں کی لٹ کاٹ کر دیدی کہ یاد رہے اور بھول نہ جائے۔

پرتاب سنگھ پہنچا تو [illegible] "ٹرینیڈاڈ" بھیجا جا رہا ہے، جہاں دولت کی کان ہے، وہاں سونے چاندی نہیں ہیرے اور موتی کے تھیلے ساتھ ہونگے۔ بیوی کو اطلاع نہ دی کہ گھبرا جائے گی اور رو کر [illegible] سیدھا بھاگا اور احمق اس قدر کہ دو حرف بھی لکھ کر نہ بھیجے۔ دن گئے، ہفتے گئے، مہینے ختم ہوئے، برس گزرے۔ آخر جو ہونا تھا وہی ہوا۔ موہنا کو سارا سال خط کے انتظار میں گزرا۔ پہلے ایک دو مہینے تشویش سی رہی۔ پھر تو جب دیکھئے روتے ہی دیکھی گئی۔ چاند گہن سا گیا تھا۔ حسن ماند پڑ رہا تھا۔ سرخی زردی سے بدل رہی تھی۔ پھولے پھولے گال بیٹھ گئے تھے، جوانی سوکھ رہی تھی۔ اچھی خاصی بہار پر خزاں کی آگ برس رہی تھی۔ ایک سال کتنا [illegible] کٹ گیا۔ پھر تو بڑی مصیبت کے دن آئے۔ سرتاج کی نشانی معصوم دودھ پیتے کی موت، افلاس کا بار [illegible] نہ سنبھال سکی [illegible] کہ سنبھال [illegible] موہن کا موہن پردیس سے بڑی دولت لیکر واپس ہوا تھا۔ آتے ہی موہنا کی ملاقات کو آیا [illegible] اور حلقہ بناتے مل گئے۔ جذبات کی آندھی چڑھی، خیالات کا طوفان بلند ہوا [illegible] مصیبت کی بجلی چمکی، رحمت کی بارش ہوئی اور خوب ہوئی [illegible] چپ سی لگ لی۔ دیور کو بھابی کی [illegible] بھابی نے دیور کے سامنے جذبات بیان کرنے کی بے بسی، موہن کو جیسے ہی [illegible] کا علم ہوا، جلدی جلدی موہنا کے زخمی دل پر مرہم پٹی کی [illegible] بچوں کو اپنے بچے بنایا، مدرسے بھیجا اور [illegible] اپنے گھر بٹھا [illegible] پرتاب واپس آئے تو بدلہ دیدیگا جس سے موہنا کی الجھن [illegible]

خود موہن نے پرتاب کی تلاش [illegible] خاک چلتا۔ دن گزرتے گئے اور موہنا کے دل میں موہن سے ہمدردی بڑھتی گئی [illegible] کے دل میں موہنا کی [illegible] کا خیال جمتا گیا۔ پرتاب لوٹ، پانچ سال ہوگئے [illegible] کی اطلاع نہ آئی [illegible] ضرور [illegible] کا تو یہاں تک [illegible] اپنی آنکھوں سے [illegible] ضرور پیدا ہوا [illegible] وہ ہندوستانی [illegible] اور پرتاب کی یاد [illegible] سے نہیں گئی۔

[illegible]

87

بس رنجیدہ ہوچکیں اب رنجیدہ نہ ہو ـــــ آنسو کا ایک قطرہ بس' اس سے زیادہ نہیں ـــــ وہ مرنے کے لئے ہی پیدا ہوا تھا اپنی جان ہلکان نہ کرو ـــــ نہیں نہیں ـــــ تو پھر روؤ خوب روؤ' بھر کر رو' میں تمہارے آنسوؤں کا شمار کروں گا اور ان میں کا ہر ایک قطرہ تمہارے لئے آئندہ سالوں میں برکت کا باعث ہوگا۔ انہوں نے تمہاری آنکھوں میں سورج کی کرن سے زیادہ چمک پیدا کر دی ہے۔ پھر بھی پیاری تمہارا سرگوشیاں کرتا ہوا حزن اور ملال بدستور قائم ہے۔ جس طرح تمام چیزیں تھوڑی دیر کے لئے غم کرتی ہیں' اُسی طرح پیاری ہمیں بھی کرنا چاہئے ـــــ آؤ اب رنج و غم' دکھ درد کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہدیں' بھول جائیں ....

موہنا سر کے بل موہن کی گود میں گری اور بیہوش ہوگئی موہن سے کچھ نہ ہو سکا منہ سے منہ لگا دیا ہوش آگیا۔ ایک بار پھر رونا تھا۔ رو دئے۔ پھر ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے کے ہوگئے موہن نے کہا۔ "موہنا! میں نے ابتک جو خدمت کی بیتاب کی محبت کے ساتھ تھی اور اب جو خدمت ہوگی وہ اپنی محبت سے ہوگی"۔

موہنا نیچی نگاہ کرکے بولی۔ "مالک! محبت تو میں ایک سے کر چکی۔ ہاں اُس کے صدقے خود کو آپ کے ہاتھوں میں دیتی ہوں" دونوں ایک دوسرے سے بغلگیر ہوگئے دوسرے دن بڑی دھوم دھام سے دونوں کا بیاہ رچا۔

(۲)

بیتاب "آئینڈاد" کے لئے روانہ ہوا تو عجب نحس ساعت میں۔ جہاز راستہ میں ایک چٹان سے ٹکرایا اور پاش پاش ہوگیا۔ بیتاب ایک تختہ کے سہارے ایک جزیرہ کے کنارے جا پہنچا وہاں اُس نے بڑی بڑی مصیبت اُٹھائی۔ سخت بیمار ہوگیا' افکار اور موہنا کی یاد نے اسے گھلا دیا' اُسے حرارت رہنے لگی۔ پانچ سال بعد کچھ شکاری آئے تو اُن کے ساتھ گھر واپس لوٹا یکایک موہنا کے سامنے نہیں جانا چاہتا تھا۔ ایک بڑھیا کے یہاں قیام کیا جو اُس کے پتا ماتا کے مرنے کے بعد اُس کے لئے ماتا کی طرح مہربان تھی۔ بڑھیا نے موقع دیکھکر موہنا کی سرگزشت سنائی' بیچارہ سُن نہ سکا۔ اور سنتا بھی کس دل سے "شکستِ آرزو" ہوکر بیٹھ گیا' دل کا درپن چوٹ کھاتے ہی چور چور ہوگیا۔

وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور موہن کے مکان کی طرف چلا' چُپ چاپ سے وہ پیچھے کی دیوار پر چڑھ گیا اور آنگن میں جھانکا' بانس کے کھمبوں میں جھولا پڑا تھا' موہن کی گود میں موہنا جھول رہی تھی اور گاتی جاتی تھی "دن آئے بھینجن کے" ایک کونے میں اس کے اپنے بچے کھیل رہے تھے اور ان کے قریب ایک نئی صورت کا چھوٹا بچہ پلنگ پر تھا۔ وہ بیہوش ہوکر گرا اور صبح کوؤں کی کائیں کائیں' اور گدھوں کے غول نے گھر والوں کو "پریم کی بھینٹ" کی خبر دی۔

فرشتوں کی محبت

(ترجمہ براؤننگ)

(۱)

وہ دن جب تو کلی تھی اور کلی بھی ناشگفتہ تھی
وہ دن جب تو نوا تھی اور نوا بھی لب بیں خفتہ تھی
وہ دن جب تو گہر تھی عقد معصومی میں سفتہ تھی

وہ دن جب برق تھی اور برق بھی ناواقف حاصل
وہ دن بھی آہ! وہ اٹھر پنے کے دن بھی کیا دن تھے!

(۲)

وہ دن جب تھی نہ الفت کے شرارے کی تپش دل میں
وہ دن جب تھی نہ رنج و غم کے کانٹے کی خلش دل میں
وہ دن جب تھی نہ بیباکانہ جلووں کی کشش دل میں

وہ دن جب عشق کی رنگینیوں سے بے خبر تھا دل
وہ دن بھی آہ! وہ اٹھر پنے کے دن بھی کیا دن تھے!

(۳)

وہ دن جب نکہتوں سے ناشناسا تیرا گلشن تھا
وہ دن جب برق غم کی زد سے باہر میرا خرمن تھا
وہ دن جب تیرا بچپن تھا وہ دن جب میرا بچپن تھا

تو اپنے حسن سے غافل میں اپنے عشق سے غافل
وہ دن بھی آہ! وہ اٹھر پنے کے دن بھی کیا دن تھے

صابر

جاپان کے مقاصد

(از احتشام رضوی ماہلی بی اے)

ایشیائی ممالک کے عروج و زوال کی داستانیں جتنی رنگین ہیں اتنی ہی عبرت خیز بھی ہیں جب یورپ کے یہاں تہذیب کا مفہوم بھی پیدا نہ ہوا تھا، اس وقت ایشیا اپنی عظمت کا سکہ بٹھا چکا تھا۔ بابل و نینوا کی حیرت انگیز ترقی کے آثار آج ویرانوں میں ملتے ہیں چین کا بے نظیر تمدن کتب تواریخ میں نظر آتا ہے ہندوستان کا فلسفہ سیات ویدوں اور گیتاؤں میں تلاش کیا جاتا ہے، ایران کی تنعم پرستی اور رنگینی فردوسی کے لازوال نغموں میں تلاش کی جاسکتی ہے۔

ان ممالک نے ترقی کی منزلیں ختم کرلیں اور پھر تباہی سے ہم آغوش ہوگئے۔ ان کے مٹنے کے بعد بھی یورپ ایک مدت تک گہری نیند سوتا رہا۔ ایشیا نے کبھی بلندی پر سر رکھا اور کبھی پستی کا منہ دیکھا لیکن یورپ نے جب ترقی کی جانب قدم اٹھائے تو پھر اس نے مڑ کر پیچھے کبھی نہ دیکھا۔ بلکہ آئے دن نئی شاہراہیں تلاش کرتا رہا۔۔۔ اس تغیر کے نفسیاتی اور جغرافیائی اسباب پر غور کرنے کا وقت نہیں ہے۔ دیکھنا صرف یہ ہے کہ آج جب کہ یورپ نے علوم معقول و منقول میں انتہائی کمال تک پہنچ جانیکا دعوی پیش کیا ہے ایشیا کس منزل پر ہے، اس وقت ہم صرف جاپان کی حالت پر تبصرہ کریں گے۔

جاپان نے جو متحیر کن ترقی ۱۸۵۸ء کے بعد سے کی ہے اُسے دیکھتے ہوئے فطرتاً ہماری نگاہ اُسی پر پڑتی ہے اور ایشیا کی قسمت کا کوئی نہ کوئی راز اُس سے ضرور وابستہ نظر آتا ہے۔ یہ نہیں کہ گزشتہ صدی کے قبل ہم تاریخ میں جاپان کا نام ہی نہیں دیکھتے بلکہ اس کی تعجب خیز رفتار ترقی نے اُسے عدم گمنامی سے نکال کر ایشیا میں بیداری کی روح کا ذمہ دار قرار دیدیا اس وقت یورپ کی ترقی کا اگر کوئی جواب ایشیا کی طرف سے پیش کیا جاسکتا ہے تو وہ جاپان ہی ہے۔

جاپان جغرافیائی حیثیت سے براعظم ایشیا کے دوسرے ممالک سے تقریباً الگ تھلگ رہا۔ اُس کے ابتدائی حالات میں صرف پتہ چلتا ہے کہ ۱۲۹۵ء میں مارکو پولو نے جب مشرقی ممالک کی سیاحت کی تو جاپان میں بھی پہونچا۔ وہ یہاں کے لوگوں کو بہادر اور باہمت کہہ کے پکارتا ہے۔ انہوں نے ایشیا کی تاریخ کی تشکیل میں کوئی نمایاں حصہ نہیں لیا سب سے بڑی وجہ تو یہی ہے کہ ان کی مذہبی تعلیم انہیں رہبانیت کی جانب مائل کرتی تھی اور بدھ مذہب کا اثر اتنا شدید تھا کہ ان کی حیات کے تمام دوسرے شعبے بھی اسی کے ماتحت تھے، تاریخوں کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس عہد رہبانیت کا سب سے زیادہ نمایاں زمانہ تقریباً ۱۶۳۶ء سے ۱۸۵۸ء تک رہا۔ لیکن اسے یوں سمجھنا چاہیئے کہ جس طرح طوفان کے پہلے کچھ عرصہ تک سطح آب پر ایک جمود اور سکون ساطاری ہوجاتا ہے اُسی طرح یہ زمانہ اپنے مستقبل میں ایک ایسے زمانہ کا پتہ دیرہا تھا جو طوفان درآغوش ہوگا کیونکہ اس کے بعد سے جاپان نے ہمیشہ ترقی ہی کے میدان میں قدم رکھا اور ہماری جستجو کا تعلق اسی عہد بیداری سے ہے جس میں جاپانی سیاست کا تجزیہ کرنے کے بعد ہم اُس کے مقاصد تلاش کریں گے۔

جاپان ایک مختصر سا مجموعۃ الجزائر ہے جس کی آبادی تقریباً نوکرور ہے۔ رقبہ کو دیکھتے ہوئے یہ آبادی بہت زیادہ ہے پھر اُس پر ستم یہ ہے کہ ہر سال نولاکھ سے زیادہ اضافہ ہوتا رہتا ہے، وہاں ضبط تولید کے اصولوں پر عملدرآمد نہیں اس میں وہی قومی بیداری اور توسیع کا جذبہ کارفرما ہے جس نے اٹلی میں مسولینی اور جرمنی میں ہرہٹلر کو اس رواج کے بند کرنے پر قانونی طور پر مجبور کیا، آبادی میں یہ اضافہ سیاسی اقتصادی اور بین الاقوامی نقطۂ نظر سے نظرانداز کیا نہیں جاسکتا اور جاپان کی زندگی میں اسی وجہ سے انقلابات ہوتے رہتے ہیں۔ اس آبادی پر نگاہ ڈالنے کے ساتھ ہی فطرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کے لئے کیا ہونا چاہیئے صرف رہنے ہی کا سوال نہیں بلکہ ان کے باکار رہنے کا خیال پہلے پیدا ہوتا ہے، چھوٹی سی حکومت میں سرکاری یا غیر سرکاری ملازمتیں بھی بہت کم ہوں گی، اس لئے زیادہ تر لوگ تجارت، صنعت و حرفت ہی کو اپنی آمدنی کا ذریعہ بنائیں گے جب ملک کے بہت سے لوگ تجارتی اشیا بنانے میں لگ جائیں گے تو چیزیں قوم کی ضرورت سے سوا تیار ہوں گی۔ ان تمام باتوں کو مدنظر رکھنے کے بعد جو منطقی نتیجہ برآمد ہوتا ہے وہ یہ کہ آبادی میں اضافہ کی وجہ سے جاپان کو نوآبادیات کی ضرورت ہے اور بازار کے بغیر چیزوں کا تیار ہونا ہی بیکار ہوجائے گا۔ اس طرح ایک آبادی کے سوال نے اتنے بڑے بڑے مسئلے پیش کردئے جس میں جاپانی تجارت، سیاست اور اقتصادیات سب کا راز مضمر ہے۔ یہ یقینی ہے کہ جاپان کبھی اپنی مردم شماری کو گھٹانے کی کوشش نہ کرے گا اور اگر آبادی یونہی بڑھتی رہی تو اوپر لکھے ہوئے مسائل کا پیدا ہونا لازمی صورت قرار پائے گی۔ جاپان کی تیز ترقی اور بیداری اس ضرورت کا نتیجہ ہے جو ہر آزاد ملک کے ساتھ پیش آنا ضروری ہے۔

جاپان کو اپنے لوگوں کے لئے اور تجارتی مال کی نکاس کے لئے نئے ممالک کی ضرورت ہے۔ اس حقیقت سے انکار موجودہ سیاست کی ایک ابلہ فریبی ہوگی کہ جاپان کا ہر اقدام اس مقصد کو کسی نہ کسی شکل میں اپنے اندر ضرور پوشیدہ رکھتا ہے۔ جب تجارت کو ترقی ہوگی، جب نوآبادیات کی تلاش ہوگی تو دوسرے ممالک سے تعلقات کا پیدا ہونا ایک امر ضروری ہے جس کے لئے دلائل و براہین کا پیش کرنا ہی سب سے بڑی دلیل ہوگی جن ممالک میں بیداری کی لہر پہلے دوڑ چکی ہے انہوں نے نیم مہذب، غیر متمدن اور متفرق ممالک کو اپنی ترقی کی جولانگاہ بنالیا ہے۔ اور بعد میں آنے والوں کے لئے ہر طرف اونچی دیواریں حائل کردیں جو بعد میں داخل ہوئے اُنہیں بزم میں جگہ کہاں مل سکتی ہے۔ لیکن

ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ظاہر ہے کہ بعد میں داخل ہونے والوں کو جگہ ملنی ضروری ہے ورنہ مختلف عیش میں سکون و اطمینان کے بدلے شور و شغب، بے اطمینانی اور نزاع کی کارفرمائی ہو گی جو پیچھے آئے ہیں وہ جگہ تلاش کریں گے۔ اس طرح جاپان کو مختلف ترقی یافتہ ممالک سے صلح و جنگ کے ذریعہ سے تعلقات قائم کرنے پڑے۔

ایک نظر دنیا کے نقشہ پر ڈالیے اور کوئی ایسی جگہ تلاش کیجیے جس میں جاپان کی فاضل آبادی کھپ جائے تو ایسا کوئی حصہ آسانی سے نہ مل سکے گا۔ کچھ تو اس وجہ سے بھی کہ اب زیادہ تر حصے آباد ہو چکے ہیں اور کچھ اس لئے کہ قابل آبادی خطہ ہائے ارض کے مالک انہیں اچھی نظر سے نہیں دیکھ سکتے۔ امریکہ نے باہر سے آنے والوں کو آباد کرنے کی تعداد قانون کے ذریعہ سے محدود کر دی ہے۔ انگلستان کے تمام مقبوضات جو قابل آبادی ہیں۔ خود اُس کے اضافہ ہائے آبادی سے بسائے جاتے ہیں۔ روس نے جاپان پر ہمیشہ ایک رقیب کی حیثیت سے نظر ڈالی، چین خود ہی دنیا کے آباد ترین ممالک میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہی وہ ممالک ہیں جن سے جاپان کے تعلقات پیدا ہو سکتے تھے۔ اس کے وجوہ اور نتائج پر ذرا تفصیلی نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔

امریکہ اور جاپان

امریکہ اگر ایک طرف بحرِ اطلانٹک سے ہم آغوش ہے تو دوسری طرف مغرب میں بحر الکاہل سے ہم کنار ہوتا ہے، امریکہ اور جاپان کی بحری رقابت اسی سمندر میں جنم لیتی ہے۔ فلپائن اور ہوائی کے جزیرے اسی میں واقع ہیں، کچھ عرصہ تک بین الاقوامی انتظامات کی بنا پر فلپائن کے جزیرے امریکہ کے تحفظ میں دے دئے گئے ہیں اور امریکہ نے ان جزیروں کی ترقی کی ایک مکمل اسکیم پیش کی تھی، جس کے بعد وہ خود اپنے کو سنبھالنے کے قابل ہو جائیں گے امریکہ کو یہ خوف ہے کہ جاپان کی حوصلہ مندی کہیں انہیں اپنا شکار نہ بنا لے۔ امریکہ جب اپنا ہاتھ ہٹائے گا تو جاپان کی ریشہ دوانیاں شروع ہو جائیں گی، اگر جاپان اپنا اقتدار فلپائن میں قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا تو اس کی قوتیں بحر الکاہل میں بہت بڑھ جائیں گی۔ اطلانٹک میں یورپ کا زور و شور ہے اور امریکہ بحر الکاہل کو اپنے اثر میں رکھنا ضروری خیال کرتا ہے، بیسویں صدی میں جاپان کی روز افزوں ترقی نے امریکہ کے اس خیال کو اور زیادہ مضبوط بنا دیا ہے۔ ان سب سے زیادہ اہم سوال تجارت ہے، امریکہ کا مغربی کنارہ بحر الکاہل کے بر اعظم ایشیائی تجارت کے لئے اچھے بازار بن سکتے ہیں۔ اگرچہ جاپانی ارباب سیاست اور امریکن ارباب حل و عقد بظاہر دوستی اور محبت کا دم بھرتے ہیں اور دلوں کی صفائی کے ثبوت میں اپنے مضامین اور بیانات میں جذبۂ ہمدردی پیش کرتے ہیں، مگر دونوں کے نصب العین میں جو اختلاف ہے اُسے دیکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ موجودہ دور سیاست میں کسی طرح ایک مرکز پر جمع نہیں ہو سکتے۔

روس اور جاپان

جاپان کے اہم سیاسی مقاصد میں روس اور چین کو الگ الگ رکھنا پیش از پیش ہے، وہ چین کو اپنی بازیگاہ بنانا چاہتا ہے اور ان دو قوتوں کے اتحاد میں اپنے تباہی کے سامان دیکھتا ہے۔ اس اختلاف کی وجہ یہ بھی کہی جاتی ہے کہ روس اپنے خصائل اور عادات و اطوار کے لحاظ سے بہ نسبت ایشیا کے یورپ سے زیادہ ہم آہنگ ہے، یورپ کے کسی ملک کا اقتدار ایشیائی ممالک میں جاپان کے نظریۂ سیاست میں ایشیا کی توہین ہے لیکن اس سے بڑی اور ظاہر وجہ یہ ہے کہ جس طرح روس چین کی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کا متمنی ہے اسی طرح جاپان بھی چین کو اپنے زیر اثر رکھنا چاہتا ہے۔ کچھ عرصہ سے جاپان کا زاویہ نگاہ اسی مرکز پر جم کر رہ گیا ہے اور چین کے متعلق ہر سوال میں جاپان سب سے آگے نظر آتا ہے جاپان کے سیاسی مفکرین کا خیال ہے کہ چین کی بہبودی صرف جاپان سے اتحاد رکھنے میں مضمر ہے اور جب چین کسی اور طرف جھکتا نظر آتا ہے تو جاپانی اُسے اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔ ترغیب و تشدد کے تمام حربے استعمال کر کے اُسے اِس اقدام سے روکتے ہیں ورنہ جنگ کر کے دوسری قوتوں کا اثر زائل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

۱۸۹۵ء کے قریب میں چین نے روس سے خفیہ طور پر ایک معاہدہ کر لیا جس میں اور باتوں کے علاوہ روس کو ایک ریلوے لائن بنانے کی اجازت منچوریا میں دی گئی تھی، تاریخ اور سیاست کے پڑھنے والے ریلوے کی اہمیت کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں منچوریا اپنے محل و قوع کے اعتبار سے سائبیریا سے بالکل قریب ہی واقع ہوا ہے اور اگر روسی وہ مجوزہ ریلوے بنانے میں پوری طرح کامیاب ہو جاتے تو آج چین کا نقشہ بدلا ہوا ہوتا۔ Chinese Eastern Railway چائنز ایسٹرن ریلوے کی تعمیر کی اجازت روس کو مل گئی اور روس نے چین سے ہر طرح کی امکانی امداد کا وعدہ کر لیا۔ یہ ظاہر ہے کہ جاپان کی مخالفت کا سامان مہیا ہو رہا تھا۔ جاپان اسے پسندیدگی کی نظر سے دیکھ ہی نہ سکتا تھا۔ چنانچہ آہستہ آہستہ نزاع شروع ہو گیا۔ اور ۱۹۰۴ء میں جاپان نے روس کو اس اقدام سے باز رکھنے کے سلسلے میں ہتھیار سنبھال لئے ایک خونریز لڑائی کے بعد جس میں یورپین اقوام بھی شامل تھیں جاپان کو فتح نصیب ہوئی لیکن صرف جنوبی منچوریا سے روس کا اثر زائل ہو سکا یہ بھی بہت تھا کیونکہ اس جنگ کے بعد سے جاپان کا شمار بڑی طاقتوں میں ہونے لگا اور روس نے اس کی قوت کا اندازہ لگا لیا جاپان یورپ کی سیاست میں بھی حصہ لینے لگا، یہ جنگ جاپانی عظمت کا سنگ اساس کہی جا سکتی ہے۔ اس طرف متعدد بار اشارہ کیا جا چکا ہے کہ جاپان اپنی بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے جگہ چاہتا ہے سائبیریا کا بہت سا حصہ غیر آباد ہے جاپان کی نظر اس پر بھی ہے اس طرح روس اور جاپان کے اختلافات بڑھتے گئے۔ جاپان نے منچوکو پر قبضہ کر کے وہ کڑی ہی کاٹ دی جس کے ذریعہ سے روس چین میں ترقی کر رہا تھا۔ روس کی رنگی کو اس سے سخت دھکا لگا اور وہ ساری اسکیم جو اُس نے چین کے سلسلے میں تیار کی ہمیشہ کے لیے برباد ہو گئی۔

روس[1] کا وہ جمہوری نظام جو ساری دنیا کے لئے ایک خطرہ ہے اور تہذیب انسانی کے لئے تباہ کن جراثیم پوشیدہ رکھتا ہے تمام ممالک سے اس کی ہمدردی اٹھا چکا ہے۔ لینن اور ٹراٹسکی وغیرہ کی اسکیموں میں نہ صرف روس کا انقلاب شامل تھا بلکہ ایک عالمگیر اجتماعی پروگرام کے ذریعہ سے ساری دنیا کو اسی نظام کا شکار بنا دینے کا ارادہ تھا۔ جاپان کا طریقہ حملہ

[1] روس کے جمہوری نظام کے متعلق جو کچھ احتشام صاحب نے تحریر کیا وہ امر قطعی کی حیثیت نہیں رکھتا انسان کی مدنی زندگی کے آغاز سے تا ایں دم جس قدر نظام ہائے سلطنت اور معاشی و مادی نظریئے و فلسفے انسان نے خلق کئے ان پر ایک معین مقدار زمانہ تک عمل کیا گیا لیکن موجودہ زمانہ میں اقتصادی کشاکش اور سرمایہ داری کی لعنت نے ہم کو یہ باور کرا دیا ہے کہ مغرب کے موجودہ مہذب تصور میں انسان کی راحت و تسکین کا کوئی آرام نہیں ہے لینن اور ٹراٹسکی کی اسکیموں کی عالمگیر مخالفت محض عقیدہ کے اختلاف کی وجہ سے ہوئی اور اس لئے کہ یورپ کی سرمایہ دار سلطنتیں اپنے وقار کے لئے اشتمالیت کو ایک خطرِ عظیم خیال کرتی تھیں لیکن بہرحال ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ بالشویزم مستقبل میں بنی نوع انسان کا سیاسی و اجتماعی مذہب ہو گا کیونکہ وہ بچا باقی دور سے گزر رہا ہے جس میں مزدور اور انسان کی نسلیں انتڑیوں اور عریاں جسموں سے شدید ترین اندیشہ ہے۔ (ساغر)

اس سے بالکل مختلف ہے وہ روس کے اس نظریۂ حکومت کو امن وامان کے لئے مضر خیال کرتا ہے اس طرح جاپان کا مطمح نظر روس کی مخالفت ہوگیا ہے جس میں سیاسی معاشرتی اور تجارتی تمام مسائل پہلو بہ پہلو موجود ہیں۔

انگلستان اور جاپان

انگلستان کی وسیع حکومت زمین کے گوشے گوشے اور چپے چپے میں پھیلی ہوئی ہے اور یہ بالکل صحیح ہے کہ اس کی حکومت میں آفتاب غروب نہیں ہوتا۔ چین کے مشرقی ساحل پر نہ صرف انگلستان کے چھوٹے چھوٹے مقبوضات موجود ہیں بلکہ تجارت کا ایک مکمل سلسلہ قائم ہے۔ یانگ ٹسی کیانگ کی وادی میں اور بحرالکاہل کے ساحل پر انگریزی تجارت نہایت منافع بخش ثابت ہوئی ہے ان کے بڑے بڑے جہاز "فولاد"، روئی اور اون لیکر آتے ہیں اور جاپان کی تجارت سے مقابلہ کرکے چین کے بازاروں پر قبضہ جماتے ہیں۔ انگلستان باوجود اتنی وسیع حکومت کے تجارت ہی کو اپنا خاص پیشہ بنائے ہوئے ہے نپولین نے ایک موقع پر انہیں "دوکانداروں کی قوم" کہا تھا اور یہ کسی طرح غلط نہیں جس طرح جاپان اپنی تجارت پر حرف آتے نہیں دیکھ سکتا اسی طرح انگلستان بھی تجارت کے معاملہ میں کسی طرح پیچھے رہنا نہیں چاہتا۔ انگلستان جس طرح اپنا اثر قائم کرچکا ہے اسی طرح جاپان بھی مشرقی اقوام کا سردار بننا چاہتا ہے وہ کم سے کم کسی یوروپین طاقت کو ابھرتا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔ ایشیا کا بیشتر حصہ اس کی نظروں میں سمایا ہوا ہے اور جب انگلستان اسے اپنے زیر اثر لانا چاہتا ہے تو جاپان اپنی جگہ تڑپ جاتا ہے۔ انگلستان نے بحر اطلانٹک میں بحری قوت اچھی طرح مضبوط کرلی ہے اس کے جنگی اور تجارتی جہاز بحرالکاہل کے سینے پر دوڑتے پھرتے ہیں۔ جاپان کے لئے یہ ایسی بات نہیں ہے کہ یونہی نظر انداز کردی جائے۔

چین اور جاپان

چین اور جاپان کے تعلقات کی ابتدا بہت پہلے سے ہوئی ہے۔ عادات واطوار کے لحاظ سے شکل وشمائل کی یکسانیت کی وجہ سے یہ دونوں ملک زیادہ مختلف نہیں ہیں۔ مذہبی اور نسلی اتحاد بھی دونوں کو ایک کرنے کے لئے موجود ہے۔ عہد رہبانیت میں بھی چین اور جاپان کے تعلقات دوستانہ تھے اور ان کا سلسلہ جاری رہتا اگر چین نے کوریا پر قبضہ کرنے کی دھمکی جاپان کو نہ دی ہوتی کشیدگی بڑھتی گئی اور سنہ ۱۸۹۴ء میں ایک مختصر سی جنگ ہوئی جس کے بعد تعلقات اور خراب ہوگئے اور چین نے روس سے معاہدہ کرلیا جس کا تذکرہ اوپر ہوچکا ہے۔ سنہ ۱۹۱۲ء تک ایک دوسرے کے رویے میں کوئی فرق نہ آیا اور ایک نے دوسرے کا نقصان مدنظر رکھا۔ سنہ ۱۹۱۲ء چین کی تاریخ میں انقلاب کا سال ہے منچو خاندان کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا اور شہنشاہی کی برباد راکھ پر جمہوریت کا محل تیار ہوا۔ سن یات سن جو انقلابی جماعت کا راہنما تھا صدر کے معزز عہدہ پر پہونچ گیا۔ اس کی انتظامی قابلیت نے چین کی ترقی کے ذرائع سوچنے شروع کئے اس نے دیکھا کہ چین اور جاپان کی دشمنی چین کے لئے نفع بخش نہ ہوگی۔ وہ جاپان کی دوستی کو کسی قیمت پر خریدنا چاہتا تھا چنانچہ اس نے منچوریا کا علاقہ دیکر جاپان کو راضی رکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس کے انتقال کے بعد اس کے جانشینوں نے ایک نئی پالیسی اختیار کی جس میں جاپان سے اختلاف مدنظر تھا۔ اور یوں چین پھر جاپان سے دست وگریباں ہوگیا۔

سنہ ۱۹۳۱ء میں منچوریا کا سوال پیدا ہوا جس میں جاپان نے اپنے مقصد کی کچھ نہ کچھ تکمیل کرلی۔ دوسری طاقتوں کی دھمکیوں اور بین الاقوامی لیگ کی استدعا کا بھی کوئی اثر جاپان پر نہ ہوسکا۔ منچوریا کا ایک اچھا حصہ جاپان کے قبضہ میں آگیا۔ روس کی قوت کو چین میں دوسری دفعہ دھکا لگا۔ اور جاپان نے اپنی قوت آزمائی، یورپ کی دیگر اقوام نے بھی جاپان کی ترقی کا اندازہ لگالیا، جہاں تک ظاہری واقعات کا تعلق ہے اب چین اور جاپان دونوں خاموش ہیں لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ پس پردہ بھی سکون ہے یا نہیں، چین کا ایک ہفتہ وار اخبار "چائینز ویکلی ریویو" ہر ہفتے ایسے مواد ضرور پیش کرتا ہے جس سے دونوں کے اختلافات کا اظہار ہوتا ہے، ممکن ہے کہ وہ کسی ایک جماعت کا اخبار ہو مگر ساتھ ہی یہ بھی صحیح ہے کہ دونوں کے دل ایک دوسرے کی طرف سے صاف نہیں ہیں۔

یہاں تک تو جاپان کے سیاسی نظریات کا تذکرہ تھا جو وہ مختلف ممالک کے مقابلہ میں پیش کرتا ہے، اب ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ جاپان کا فلسفۂ حکومت کیا ہے اور جاپان کیا چاہتا ہے۔ ایشیا کا پورا براعظم جاپان کے سامنے ہے اور وہ ایشیا کی قوتوں کا سردار بن کر رہنا چاہتا ہے۔ اس کی ایشیائی پالیسی کا مقصد ہی یہ ہے کہ وہ سارے ایشیا کو اگر فتح نہ کرے تو اپنے اثر کے اندر تو ضرور رکھے۔ مشرقی اقوام کو متحد کرکے وہ ان کی رہنمائی کرنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ چین سب سے زیادہ قریب میں واقع ہے، جاپان کی حریص نگاہیں اس پر سے ہٹنا نہیں جانتیں۔ جب کوئی دوسری طاقت چین کے معاملہ میں دخل انداز ہونا چاہتی ہے تو جاپان کے مقاصد سے تصادم ہوتا ہے، جاپان کے سرکاری حلقوں کے ذمہ دار ارباب حل و عقد کے بیانات جو چین اور جاپان کی آویزش کے زمانہ میں کبھی کبھی نظر سے گزرتے رہے ان سے یہ بات صاف طور پر ظاہر ہوگئی کہ جاپان چین میں کسی اور کی ترقی نہیں دیکھنا چاہتا وہ چین کی قسمت کا فیصلہ اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتا ہے۔

موجودہ سیاست کے ہتھکنڈے کبھی اسے یونہی نہیں چھوڑ سکتے تھے چنانچہ نو طاقتوں کا معاہدہ Niue-Powsr Treaty میں یورپ کی مشہور حکومتوں کے علاوہ امریکہ بھی شریک تھا جس میں جاپان نے چین کے معاملہ میں علیحدگی کا وعدہ کیا تھا۔ وعدہ کرنے کو تو جاپان نے وعدہ کرلیا مگر اتنے ممالک کے مقابلہ میں اپنی ضد پر قائم نہ رہ سکا اور جب تحریری وعدہ سے گزر کر عمل کا موقع آیا تو جاپان نے بے زبان الفاظ کو کوئی وقعت نہ دی۔ یہی وجہ تھی کہ تمام بڑی بڑی طاقتوں نے مجبوری طور پر جاپان کے اس اقدامات اظہار بیزاری کیا اور چین کی ہمدردی کے پردے میں جاپان کو بڑھنے سے روک دیا۔ ایک کمیشن کے ذریعہ سے جاپان کو دھمکیاں دی گئیں اور "نو قوتوں کے معاہدہ" کی یاد دلا کر اپیلیں کی گئیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر صرف چین اور جاپان ہی کا معاملہ ہوتا تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ جاپان آج کہاں ہوتا لیکن اب تو چھوٹی سے چھوٹی بات بھی بین الاقوامی اہمیت اختیار کرلیتی ہے اگر ایسا نہ ہو تو دنیا کا گوشہ گوشہ میدان کارزار بنا رہے۔

بحری معاہدہ بھی جس میں جاپان، انگلستان اور امریکہ شامل ہیں جاپانی نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت رکھتا ہے، جہازوں کی تعداد اور قوت ایک کانفرنس کے ذریعہ سے محدود کی گئی جس میں تین، پانچ اور پانچ (۳: ۵: ۵) کا تناسب ہے، جاپان اپنے لئے تین سے زیادہ چاہتا ہے، وہ کہتا ہے کہ جاپان نہ تو انگلستان پر حملہ کرسکتا ہے اور نہ امریکہ پر چڑھائی کرنے کا خواب دیکھ سکتا ہے، اسے اپنی ہی حفاظت کی ضرورت ہے، اس کو اپنی تجارت کا تحفظ لازم ہے اور یہ بغیر زیادہ بڑی بحری قوت کے ناممکن ہے۔ جاپانی زاویۂ نگاہ سے درست ہو۔ لیکن انگلستان یا امریکہ اسے صحیح نہیں سمجھتے، وہ اس میں تھوڑی سی زیادتی بھی بین الاقوامی امن کے لئے ایک خطرہ سمجھتے ہیں، جاپانی اخبارات اور سرکاری حلقوں میں ہمیشہ اس تناسب

صدائے احتجاج بلند کی گئی کانفرنس میں جاپان کے نمایندے نے اپنی ساری قوت اپنے حقوق کی حفاظت اور تناسب کے بڑھائے جانے پر صرف کردی لیکن ۳ : ۵ : ۵ سے آگے بڑھا نہ سکا۔

اب ضرورت یہ ہے کہ ان تمام گزشتہ صفحات سے آسانی کے لئے وہ باتیں نکالی جائیں جن سے حقیقتاً جاپانی نصب العین کا پتہ چلتا ہے۔ جاپان ایشیا میں سرداری اور سرفرازی چاہتا ہے۔ جاپان چین میں اپنا اور صرف اپنا اثر چاہتا ہے۔ جاپان کوئی نو آبادی تلاش کر رہا ہے جہاں اس کی بڑھتی ہوئی آبادی پناہ لے سکے۔ جاپان اپنی تجارت کا تحفظ چاہتا ہے، جاپان اپنی طاقت مزید بڑھانا چاہتا ہے۔ جاپان نے خود اپنی طاقت کا اندازہ لگا لیا ہے اور وہ اپنے دست و بازو کو زور آزمائی کے لئے موزوں پاتا ہے۔ علم و فن سیاست تدبر تجارت و صنعت دولت اور قوت کے لحاظ سے جاپان کسی سے کم نہیں اُس کے حوصلے روز بروز بڑھتے ہی جاتے ہیں اور نہیں کہا جا سکتا کہ کہاں دم لیں گے۔

جاپان کو یہ سبق کہاں ملا کہ اپنے خوابوں کی تعبیر تلاش کرنے کے لئے وہ قوت کو کام میں لائے۔ جب ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں تو ہماری نظر مغرب ہی پر پڑتی ہے جہاں ایسے واقعات کی کمی نہیں سب سے زیادہ بڑی مثال تو انگلستان اور روس کے اُس معاہدہ کی ہے جب انہوں نے ۱۹۰۸ء میں ایران کو برابر برابر تقسیم کر لینے کا ارادہ کیا۔ ایران کمزوری کی حالت میں تھا اُس کی بے بسی اور بے طاقتی سے فائدہ اُٹھانے کا جو سب سے بہتر موقع ہو سکتا تھا وہ کام میں لایا گیا۔ جاپان کے سامنے یہ واقعہ موجود تھا جب اُس نے چین کے ایک حصہ پر حملہ کر کے جاپان کی حکومت میں مدغم کر لینے کی کوشش کی وہ یورپ کی مثالوں اور مغرب کی سیاست کا نازک نگاہ نقاد ہے اور ہر معاملہ میں اُنہیں سامنے رکھتا ہے آج بھی اس کے لئے بہانہ موجود ہے اٹلی نے ابی سینیا کی کمزوری کو اپنے لئے ایک عطیۂ قدرت سمجھا اور جاپان جانتا ہے کہ اُسے بھی جب موقع ملے گا وہ اسی حکمت عملی کو بروئے کار لائے گا۔ اٹلی کا یہ اقدام نہ صرف امن عالم پر ایک کاری ضرب ہے بلکہ کمزور اقوام کے لیے پیام فنا کی گھنٹی۔ مغرب ہی نے مثالیں قائم کر کے جاپان کو اس کا موقع دیا ہے اور مغرب ہی جاپان کی حوصلہ مندیوں کا گلا گھونٹ دینا چاہتا ہے۔ جنیوا لیگ کتنی ہی امن پسندی چاہے اور جس قدر بھی اپنے شریف اور اعلیٰ خیالات کا واسطہ دے لیکن جنہیں اپنی ترقی کی فکر ہے وہ اس طرح باز نہیں آتے، جاپان نے لیگ کو لرزہ براندام کر دیا اور مغرب میں ایک ہلچل سی پیدا کر دی وہ جن مقاصد کا علمبردار ہے اُن کو حاصل کرنے کے لئے وہ رستہ کے نشیب و فراز کو صرف اسی حد تک جگہ دے گا جہاں اُس کی طاقت جواب دیدے گی لیکن اپنی مالی حالت درست کرنے کے بعد جاپان آخری مشکل بھی حل کر لے گا۔ اور ہم نہیں کہہ سکتے کہ مستقبل قریب میں جاپان اپنے نصب العین کو عملی جامہ پہنانے کے لئے کونسی راہ اختیار کرے گا۔

الہامِ میکدہ

دنیا اک تیرہ سیاست ساقی
مذہب تخلیقِ آدمیت ساقی
الہام ہوا یہ میکدہ میں مجھ کو
تو ہے ذی روح اک حقیقت ساقی

(بادۂ مشرق)

جگ مگ کرتا ہوا یہ ایوانِ حیات
پھولوں سے سجا ہوا گلستانِ حیات
سب لوٹ کا مال ہے ترے سر کی قسم
یہ قصر یہ کوٹھیاں یہ سامانِ حیات

(ساغر نظامی)

۱۹۳

نورِ ایشیا

گوتم بدھ

ذرّے ذرّے پر کپل وستو کے چھائی تھی بہار — عیش کی تجدید کے پیغام لائی تھی بہار
جام مے رنگینیوں سے تھا شراب اندر شراب — پھول تھے لالہ بہ لالہ اور گلاب اندر گلاب
حُسنِ کافر رقص میں تھا خم بہ سر مینا بدوش — عشقِ مسکیں تھا گریباں چاک مستِ نا و نوش
زندگی رقصاں تھی پیہم پردہ ہائے ساز پر — بج رہا تھا سازِ ہستی حُسن کی آواز پر
عشرتیں تھیں بیخودی تھی ٹھمکیاں تھیں رقص تھا — چاک کر ڈالا تھا مستی نے گریباں ہوش کا
روح پر چھائی ہوئی تھی مادیت عیش کی — غرق تھی طوفانِ بیہوشی میں غم کی زندگی
گرمیِ عشرت سے ٹھنڈا تھا چراغِ احساس کا — پیکرِ انساں میں یخ تھا روح کا آتشکدا

دب گئی تھی عیش سے روحانیت انسان کی
پڑ چکی تھیں سرد سی چنگاریاں ایمان کی

یک بیک تیری نظر سے ہٹ گئے پردے تمام — اب نہ ساقی تھا نہ پیمانہ نہ ساغر تھا نہ جام
رنگ محلوں سے "جسودا"[1] کا کنہیا چل دیا — چاندنی میں منزلِ عرفان کا جویا چل دیا
خشک لب حیراں نگاہیں خاک آلودہ جبیں — تشنۂ عین الیقیں دیوانہ حق الیقیں
زندگی تیری نظر میں صفحۂ سادہ ہوئی — روح تیری خانقاہِ غم کا سجّادہ ہوئی
عشق کا ساغر بنا اُلفت کا پیمانہ بنا — دلِ تراکیبِ تلاشِ حق کا میخانہ بنا
ساغرستانِ حقیقت خُمستانِ عشق کی — اوّلیں تعمیر انوما[2] کے کناروں پر ہوئی
طالبِ حق آم کے باغوں میں ٹھیرا سات دن — ہفتخوانِ زندگانی تھے یہ گویا سات دن

اور ویلوا[3] کی فضائیں حق کا گہوارہ بنیں
بندھیاں کی چوٹیاں طورِ حقیقت ہو گئیں

اے صداقت کے چمن پروردۂ موجِ شمیم — یاد ہے اب تک زمانے کو ترا "عزمِ عظیم"[4]

[1] [illegible]
[2] [illegible]
[3] [illegible]
[4] [illegible]

سرد و گرمِ شاہراہِ حق کا لذت چش ہے تو
جو بھڑکتا ہی رہا وہ شعلۂ آتش ہے تو
کامیابِ امتحانِ زندگی کرتا ہوا
کامرانِ زندگی و عاشقی کرتا ہوا
عشق سے آیا نہ رغبت زر کے سائل پر تجھے
قدرتیں حاصل ہوئیں پھر روح اور دل پر تجھے
چھڑ گیا رگ رگ میں تیری اک نیا سازِ حیات
مانتے ہیں سب یہی کہ تجھ کو مل گیا رازِ حیات

حق نہیں ملتا کہ حق کا راستا ملتا نہیں
"ڈھونڈھنے پر آدمی آئے تو کیا ملتا نہیں"

اے محبت کے پیامی رحمت کے پیامبر!
تو نے پہنچائی زمانے کو حقیقت کی خبر
زندگی کا رازِ اصلی تجھ پر عریاں ہو گیا
شانِ حق اور حق کا حاصل تجھ کو عرفاں ہو گیا
راگ گونجا، روشن ہوا تیری تجلیات سے
نیستانِ دل آواز گونج اٹھا نغمات سے
دیوتاؤں کے بتوں کو پارہ پارہ کر دیا
تو نے حلِ تخلیقِ آدم کا معمہ کر دیا
تیری طاقت سے ہوا کم اقتدارِ برہمن
ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے حسن و وقارِ برہمن
سلطنت تیرے لیے اک تودۂ خاشاک تھی
مادیت تیرے نورانی قدم کی خاک تھی
جزوِ اعظم تیرے دینِ عاشقی افروز کا
اعتقادِ نیک فعلِ نیک و قولِ نیک تھا
نیتِ نیک و خیالِ نیک و ذوقِ بیخودی
زندگیِ نیک و سعیِ نیک تیرا دین تھی
تیرے ساغر میں شرابِ عشق عالمگیر تھی
تیرے میخانہ کی ادنیٰ خاک بھی اکسیر تھی

سر بسجدہ ہو گئی دنیا حضورِ ایشیا
چھپ گیا تاریکیِ عالم پہ نورِ ایشیا

اے مرے پیارے وطن کے راہبرِ عالی مقام
آج بھی کلمہ ترا پڑھتی ہے دنیا صبح و شام
تیرا اک اک لفظ ہے اک کلیۂ اخلاق کا
کر دیا تو نے مدوّن فلسفہ اخلاق کا
امن سرنامہ ترے قانونِ خدائی کا ہے
رحم اک عنوان تری تعلیمِ روحانی کا ہے
تیری تعلیمات پر ہندوستاں کو ناز ہے
ہند کو کیا ناز ہے سارے جہاں کو ناز ہے
عقلِ مغرب جہل کی بے ہوشی میں جب نابود تھا
سارا مشرق تیری تعلیمات سے آسودہ تھا
جاگ خوابِ ناز سے اور امن کا اک گیت گا
پھر ترا مسکن نشانہ ہے ستم اور ظلم کا
فتنۂ تہذیبِ نو نے اک قیامت ڈھائی ہے
تیرے ہندوستان پہ تازہ مصیبت آئی ہے
جس زمیں سے تو نے آواز دلائی تھی بلند
جس زمیں سے تو نے کی بانگِ درائی تھی بلند
وہ زمیں اغیار کے ہاتھوں سے پھر برباد ہے
ظلم و باطل اور نفاق و کذب سے آباد ہے
کونا کونا گوشہ گوشہ ذرہ ذرہ ہے غلام
اے مرے گوتم تری آزاد دنیا ہے غلام

کر غلامی سے رہا ہم کو پجاری مانگتے ہیں یہی
آج ہندوستان میں مفہومِ نرواں ہے یہی

ساغر نظامی

قدیم ہندوستان کا بابل

(از مارگیرٹ نوبل عرف بہن نویے دیتہ۔ مترجمہ سید محمد یحییٰ میرٹھی)

"مارگیرٹ نوبل ہندوستانی تہذیب و تمدن کی بہت دلدادہ تھیں۔ آپ نے ہندوستان آکر قدیم ہندوستان کا گہرا مطالعہ کیا۔ اور اس موضوع پر چند کتابیں بھی تصنیف فرمائیں۔ رام کرشن وویکانند مشن کی آپ خاص رکن تھیں۔ صوبہ بہار جو گوتم بدھ کی تبلیغی جد و جہد کا گہوارہ تھا۔ قدیم ہندوستان کے بعض عدیم المثال آثار کا اب تک مخزن ہے۔ ذیل کا مضمون اسی صوبہ کے قدیم ترین شہر راج گیر سے تعلق رکھتا ہے۔ اور اس میں مصنفہ نے اپنے تاثرات کو نہایت لطیف انداز میں ظاہر کیا ہے۔ قارئین کی خدمت میں اس کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔"

ہماری رہائش کا مکان جو چند ہفتوں کے لئے ہمیں مستعار دیدیا گیا تھا۔ ایک پہاڑی گوشہ میں کسی قدر بلندی پر واقع تھا۔ پہاڑی خط مستقیم کی طرح سیدھی بلند ہوتی چلی گئی تھی۔ اور جائے قیام تک پہونچنے کے لئے ہمیں سیڑھیوں کے طویل اور بظاہر لامتناہی سلسلہ کو طے کرنا پڑتا تھا کوئی شخص اس بلند مسافت کو طے کرنے کے بعد جب اس عمارت تک پہونچے تو اس کو شاید یہ خیال پیدا ہوگا کہ اس جگہ چھوٹے چھوٹے خودمختار راجاؤں کا مسکن ہوگا جو بسر دل کی زندگی بسر کرتے ہوں گے۔ لیکن درحقیقت یہ راجگان انوا کا قلعہ تھا۔ عمارت کے دو حصے تھے۔ اندرونی حصہ کو بیرونی حملوں سے بچانے کے لئے مستحکم دیواروں سے محصور کردیا گیا تھا اور اس کے اوپر وسیع اور ہموار چھتیں بنائی گئی تھیں۔ باہر کی جانب چند کمرے تھے۔ جو ایک کھلے ہوئے صحن کے دونوں جانب تعمیر کیے گئے تھے۔ عمارت کے طرزِ تعمیر سے ظاہر ہوتا تھا کہ زمانۂ وسطیٰ میں اس کو بنایا گیا ہے لیکن سب سے زیادہ دلفریب بات یہ تخیل تھا کہ یہ مقام پچیس[1] یا بیس[2] صدیوں سے متواتر انسانی بود و باش کا مسکن چلا آتا ہے۔ وہ طویل زینہ جس کو طے کرنے کے بعد ہم پہاڑی کے دامن تک پہونچتے ہیں یقیناً قدیم راج گیر کی فصیلوں کی بنیادوں پر تعمیر کیا گیا ہوگا۔ اس پہاڑی زینہ کے دامن میں پُر پیچ رستہ ندی سے مل کر خندق کی شکل بناتا ہے۔ سامنے کی طرف راجگیر کے گرم چشمے اور مندر دکھائی دیتے ہیں جن کو ایک ٹیڑھا زینہ چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے اور جو اب تک ہندوؤں کا تیرتھ ہے۔

ہماری پشت کی جانب دو فرلانگ کے فاصلہ پر یہ پہاڑی دائرہ بناتے ہوئے ایک جانب کو مڑتی ہے یہی وہ مقام ہے جہاں راجاؤں کے اس قدیم شہر کے کھنڈر موجود ہیں کھنڈروں کے آثار اس قدر صاف اور ہر ایک حصہ اس قدر نمایاں ہے کہ تلاش کرنے والی آنکھ آسانی کے ساتھ بازاروں کے خطوط دیکھ سکتی ہے۔ گلی کوچوں اور شاہراہوں کے نشانات صاف نظر آتے ہیں اور بلاخوف تردد کہا جا سکتا ہے کہ زمانہ کے انقلاب نے ان کے محل وقوع میں کوئی تبدیلی نہیں کی ہے۔ راجگیر جہاں آجکل روزانہ سینکڑوں گائیں، بھینسیں، مینڈھے اور بکریاں کھنڈروں میں سے آتی جاتی رہتی ہیں اس کی بہت سی شاہراہیں اب تک بجنسہ ویسی ہی ہیں جیسا کہ زمانۂ بعید میں ہوں گی بطور مثال ایک وسیع سڑک سیدھی چلی گئی ہے۔ جس کے وسط میں قدیم محل کی دیواروں، بلند دروازوں اور برجوں کے نشانات ملتے ہیں۔ محل کے باہر شاہی باغات کے آثار موجود ہیں جن کے حیرت انگیز چشمے اس وقت تک اپنی اصلی صورت میں پائے جاتے ہیں۔ اس تمام کوہساری حصے اور اس درہ میں جو اس تک پہنچاتا ہے آب رسانی کی غیر معمولی کاریگری ظاہر ہوتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس قدرتی قلعہ کو راجاؤں کا مسکن بنانے کا سب سے بڑا موجب یہی گرم چشمے تھے۔ ہم جس قلعہ میں مقیم ہیں اس کے نیچے ایک خشک تالاب موجود ہے کسی زمانہ میں اس تالاب کے اندر کنول کے پھول شگفتہ ہوتے ہوں گے آب رسانی کی سائنس کا اندازہ سنٹرل انڈیا کی ایک اور عمارت سے بھی ہوتا ہے جو اس قدیم راجگیرت دو ڈھائی سو برس بعد تعمیر کی گئی تھی۔ اگر ہندو اپنے آباؤ اجداد پر فخر کریں تو بیجا نہ ہوگا کیونکہ جب شان و شوکت سے یہ لوگ اتنے قدیم زمانہ میں زندگی بسر کرتے تھے اس کی مثال نہیں ملتی یہ وہ زمانہ تھا جبکہ شمالی اور مغربی یورپ کے باشندے پتوں سے اپنے جسم کو ڈھانپا کرتے تھے۔

دُنیا میں چند ہی مقامات اتنے قدیم ہوں گے جتنا کہ شہر راج گیر ہے اور جس کے متعلق اس قدر مصدقہ واقعات کا علم ہم تک پہونچا ہے۔

گوتم بدھ راج گیر میں

غالباً ۵۹۰ سنہ قبل مسیح کا وہ مبارک سال تھا جب سامنے والی وادی میں ہوتا ہوا اس شہر میں وہ شخص داخل ہوا جس کا دل احساس اور خیالات سے بھرا ہوا تھا اور جو عام دُنیا سے بلند ہو کر تاریخی بیداری عالم میں پیدا کر گیا۔

صبح کے سُہانے وقت میں غالباً گوتم نے اپنا قدم اس شہر میں رکھا ہوگا۔ وہ کس انداز سے آیا؟ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ایک لنگڑا میمنہ اس کے کاندھے پر سوار تھا۔ اور سینکڑوں بھیڑوں کے سُموں کی آواز اس کے پیچھے پیچھے تھی۔ اس کا دل خدا ترسی اور رحم کے جذبات سے بھرا ہوا تھا۔ بکریوں کے اس گلہ نے جو شاہی مذبح میں جا رہے تھے۔ گوتم کے دل میں جذبات کا طوفان برپا کر دیا۔ ان معذور و مجبور چوپایوں کو دُکھ اور درد، شادی اور خوشی، زندگی اور موت کے جال میں اسی طرح قدرت نے مقید کر دیا ہے جس طرح انسان کو۔ محبت اور غم ان کو بھی انسان کی طرح متاثر کرتا رہتا ہے۔ لیکن ان کی بیزبانی نہ تو

ان کی پریشان حالی کو ظاہر کرنے دیتی ہے اور نہ وہ اپنی رہائی کی تدبیر سوچ سکتے ہیں۔ یقیناً ان بے زبان معصوم چوپایوں نے اس کو چاروں طرف سے گھیر لیا ہوگا۔ کیونکہ حیوانات کی عقل حیوانی اس خاموش محبت کو فوراً پرکھ لیتی ہے جو ان کی زندگی اور آزادی کو چھیننا نہیں چاہتی۔

راج گیر کے آثار

ایک بلند دروازہ کے کھنڈر اب تک موجود ہیں۔ غالباً گوتم بدھ اس میں سے ہو کر شہر میں داخل ہوئے ہوں گے۔ شہر کو دو ندیاں گھیرے ہوئے ہیں۔ بائیں جانب کی ندی پر ایک باغ تھا جس کی سیرت انجیل کی مریم مگڈالن سے ملتی جلتی ہے۔ ایک راستہ دریا تک جاتا ہے۔ کنارے پر اشنان کا قدیم گھاٹ ہے۔ پہاڑ کے وسطی حصہ میں ایک غار ہے جو سنار بھنڈار کہلاتا ہے۔ اس میں ایک بہت قدیم استوپا اب تک موجود ہے۔ شہر کے بیچ میں ایک منار ہے جس کو فاہیان نے ۴۰۴ء میں دیکھا تھا۔ غار قدیم راجگیر کا شاہی مندر رہا ہوگا۔ غار کے باہر ایک چبوترا ہے اس میں شاہی مہمانوں کو کھانا کھلایا جاتا تھا۔

گوتم نے جب دنیا کو ترک کیا تو اس وقت مگدھ سلطنت کا راجا بمبسار تھا۔ اور گوتم کے انتقال کے وقت اجات شترو گدی پر بیٹھ چکا تھا۔ شہر کی قدامت کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ اجات شترو سے تقریباً ۵۰۰ سال قبل تک یہ شہر قدیم راجگیر کی بنیادوں پر قائم رہ چکا تھا۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ خود بدھ کے زمانہ میں شہر راجگیر قدامت کی تعریف میں آ چکا تھا۔ راجہ اجات شترو جو اپنے باپ بمبسار کا قاتل بھی تھا قدیم راجگیر کو ترک کر کے نئے راجگیر میں چلا گیا۔

راجہ اشوک نے اپنے زمانہ میں نئے راج گیری میں ایک اشوکا تعمیر کیا اور ایک ستون قائم کیا جس پر کچھ کتبے کندہ تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اشوک کے زمانہ میں راجگیری کی آبادی بہت گنجان تھی۔ کیونکہ کتبوں کے ذریعہ جو شاہی اعلانات کئے جاتے تھے وہ صرف ان شہروں کے لئے مخصوص ہوتے تھے جہاں کی آبادی کثیر ہوتی تھی قدیم راجگیری کے کھنڈروں میں گوتم بدھ کی غیر فانی آواز کی بازگشت اب تک سنائی دیتی ہے۔ گوتم راج گیری میں کیوں آیا؟ کیا وہ ان ودوان پنڈتوں سے ملاقات کرنے کی غرض سے آیا تھا جو کسی راجدھانی کے ارد گرد آباد ہو جاتے ہیں؟ کیا زمانہ مابعد کی مشہور نالندہ یونیورسٹی اُس وقت بھی یونیورسٹی بنی تھی اور گوتم وہاں گیان حاصل کرنے گیا تھا؟ نہیں! اس شہر میں آنے سے قبل ہی اس کا دل عرفانِ حقیقت سے منور ہو چکا تھا۔

ساقی سے خطاب

ساقی
یہ قہقہۂ پرِ ضیا کا عالم ساقی
اللہ اللہ یہ زلفِ برہم ساقی
ساماں جو یہ ہیں تو ایک دن دنیا پر
لہرائے گا میکدہ کا پرچم ساقی

(بادۂ مشرق)

ہے پیکرِ عیش و کامرانی ساقی
تجھ میں ہنستی ہے زندگانی ساقی
جام و ساغر پہ تیرے دم سے ہے شباب
تو ہے میخانے کی جوانی ساقی

ساغر نظامی



از
ساغر نظامی
۷ اکتوبر ۱۹۳۵ء

شاعر دم توڑ رہا ہے اور زندگی و موت میں آویزش ہو رہی ہے۔
شاعر زندگی سے کہتا ہے:۔

"زندگی! تو کیوں ایک ایسے شخص کے لئے لڑ جھگڑ رہی ہو جس کا عدم و وجود برابر ہے۔ اگر میں اس وقت تک زندہ رہا تو میں نے ملک و قوم اور اپنی کون سی عجیب و غریب خدمات انجام دیں جن کی بنا پر مجھے مزید زندہ رہنا چاہئے کیونکہ خدمت ہی ایسی چیز ہے جس کی بنا پر کسی انسان کو دنیا میں زندہ رہنے کا حق حاصل ہو سکتا ہے۔ اور اگر میں مرجاؤں گا تو دنیا کی مشینری میں سے کون سا کل پرزہ کم ہو جائے گا۔ میں تو بالکل ایک بیکار شے ہوں۔ سن تو سہی اے نازنین پیکر زندگی! کیا تو نہیں جانتی کہ میں تیرا نوجوان فرزند ہوں اور باوجود اس نوجوانی کے جس کی خامکاریاں ہی پختہ عمری کی دلیل ہوا کرتی ہیں۔ میں نے تیری پرستش میں کوئی کمی نہیں اٹھا رکھی اگر انکار کر سکتی ہے تو انکار کردے کہ میں نے تجھے اپنے سریلے اور بے تاب نغموں کے جنت نما مہد میں پرورش نہیں کیا ہے؟ اور ان نغموں کے ساتھ بہنے والے جوان تبسم کے سیلاب میں میں تیری کشتی کو اپنے پرشباب بازوؤں سے کھینچتا ہوا عمر کی اس بندرگاہ تک نہیں لایا ہوں جہاں موت کی مہیب دیوی اپنے نیزہ کی نوک سے چھید کر ایک نامعلوم ابدیت کی طرف مجھے اٹھا لیجانا چاہتی ہے جانے دے مجھے اس ابدیت کی طرف بھی جانے دے جس کے قصے مجھے اخلاقی کتابوں کے اوراق اور بزرگوں کے خواب سناتے رہتے ہیں۔ جہاں کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ ایک جاوداں محشر حیات ہے ابدی زندگی کی ایک قیامت ہے جہاں غالب سا شاعر بیٹھا ہوا اپنے شعر سنا رہا ہے۔ تان سین سا مغنی اپنے نغمات سے اس ابدیت کے چاروں طرف نغمات کا ایک طلسم بنائے ہوئے ہے۔ جہاں حسن بھی ازلی و دائمی ہے۔ ابدی ہے۔ اور ساری کائنات ایک استقلالِ حیات کا نمونہ بنی ہوئی ہے۔ جہاں اگر زندگی ہے تو جاوداں زندگی، موت ہے تو ——— ابدی موت۔ دونوں حالتیں دلچسپی سے خالی نہیں ہیں اے میری پیاری زندگی مجھے اس ابدیت میں بیٹھ کر بھی ایک ابدی نظم کہہ لینے دے ——— جب یہ ممکن ہے کہ میں اپنی بیاض جو میرے دماغ میں محفوظ ہے ساتھ لے جاؤں گا اور خاطر جمع ہے کہ میرے استقبال میں ایک آدھ "عظیم الشان ادبی اجتماع" وہاں ضرور ہوگا تو یہ کیوں ممکن نہیں کہ ایک دن جب دنیا کے تمام نفوس ایک گہری نیند کے بعد فانی مٹی میں جسم ارزاں کر گئے ہوں میں اس تالاب کے کنارے جس کے کنول میری نگاہوں کے شوق کا احتساب کرتے رہتے ہیں کسی دن تمنا کے نغمۂ عبودیت کے ساتھ اڑتا ہوا تجھ سے آ ملوں اور تجھے وہ ابدی نظم جھوم جھوم کر اس مہ پارہ کے سامنے سناؤں جس کے لطیف نقوشِ پا اور گاگر کے ہلکے نشانات سے تالاب کے کنارے کنول زار بنے ہوئے ہیں۔"

زندگی نے ایک سرد آہ بھری اور بولی:۔

"بیوفائی" اور "انسان"! شاید مترادف الفاظ ہیں۔ میری گود میں تیری طفلی، نوجوانی اور جوانی نے اپنے وہ تمام مدارج طے کئے جن کا جزواً جزواً بیان بجائے خود ایک تصویری سلسلہ ہے۔ تیرے تبسم کو میں نے سمندروں کی آخری تہ میں پڑے ہوئے موتیوں سے ضو حاصل کر کے جلا دی اور اس کو وہ شیرینی عطا کی جس کو [illegible] چکھ سکتی ہیں۔ داؤدؑ کے مقبرے میں صرف تیری خاطر فرشتوں کی ایک جماعت کے ساتھ گئی اور جب داؤدؑ کا لحن ایک سرمدی نغمے کی طرح ابدی نیند سوتے ہوئے ہزاروں زمزموں کے ساتھ جھول رہا تھا میں نے اس کو چرا لیا اور تمام موجودات کی آنکھیں بچا کر چپکے چپکے میں تیرے سرہانے آئی اس وقت تو اپنے [illegible] کی آغوش میں امواجِ حسن کی گود میں مسکراتا ہوا ایک خوبصورت نیند لے رہا تھا میں نے ایک بوسے کے ذریعہ تیرے حلقوم میں اس لحن کو ڈال دیا۔ میں تیرے لئے غلمان کا شباب لائی، اور فرشتوں کی بزرگی۔ آہ میں نے تیرے لئے کیا کیا نہیں کیا۔ میں تیرے لئے قابلِ رشک ماحول لائی، وہ ماحول جس میں حسن اپنے لچکیلے رقص کے ساتھ گنگناتا ہے اور معصوم عشق اپنے تیرہ دامان ٹوٹے ہوئے سائل کے قدموں میں آنسو بہاتا ہے، جہاں ہر نفس نغمہ ہے اور ہر نغمہ گیتوں کی دنیا ——— میں نے تیرے دل کو ابدی اضطراب بخشا اور دل سے جلوہ گاہِ حق تک ایک استوار راہ نکالی اور اس راہ میں ہزاروں پیچ پیدا کردیئے تاکہ تو ذرا اس بھول بھلیاں کا لطف بھی اٹھائے اور پھر تجھ کو وہ قوت بخشی کہ ان راہوں پر مردانہ وار سفر کرے۔ قطع منازل کے بعد تجھے اس جلوہ گاہ میں بھی پہنچایا جو شہرت اور عزت کی جلوہ گاہ ہے، کامیابی اور کامرانی کی جلوہ گاہ ہے۔ اے میرے معصوم شاعر! مگر تو نے میری قدر نہ کی اور مجھے چھوڑ کر موت سے ہم آغوش ہونا چاہتا ہے، مجھ سے بیوفائی کرنا چاہتا ہے کاش تجھے معلوم ہو سکتا کہ میں تیرے لئے اور تو میرے لئے ہے۔

شاعر نے زندگی کو جواب دیا:۔

نہیں میں تجھ سے بیوفائی نہیں کرنی چاہتا۔ تیری عنایات کا بیحد شکریہ لیکن یہ تو بتا کہ تو نے جو بے بہا عطیے عنایت فرمائے کیا وہ بجائے خود ایک ظلم نہیں ہیں۔ تو نے جو صدفی تبسم مجھے بخشا اس سے آج تک مجھے کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔

اس کا کوئی جوہری آج تک تو پیدا ہوا نہیں۔ اے زندگی! اسے عطا کرتے وقت تو ایک شے "دینی بھول گئی۔ اور داودؑ کے مقبرے میں جاکر جو یہ تو چرا کر لائی پھر میرے حلقوم تک پگھلا دیا وہ میرے لئے ایک مستقل عذاب ہے، اسے اپنے لذیذ اور مسکراہٹ کے ساتھ دیتے ہوئے بھی تو ایک چیز فراموش کر گئی۔

غلمان کا شباب لائی، جو جاڑوں کی چاندنی کے مترادف تھا، فرشتوں کی نرگی لائی جو شیطان کی رذالت سے بھی گری ہوئی ثابت ہوئی کیونکہ تو اپنے ساتھ اک شے لانی بھول گئی تھی۔

قابلِ رشک، ہول! کسی کو بھی اس پر رشک نہیں ہے جسے تو قابلِ رشک کہہ رہی ہے اور جسے ہم اس کے بیوقوف ہونے میں کم از کم مجھے شک نہیں حسن میرے خیالوں میں ناچتا گاتا ہے، میری آغوش میں نہیں، وہ عشق جس کو تو معصوم کہہ رہی ہے اس کی سیہ کاریاں مجھ سے پوچھ اس کمبخت نے تمام تیر اور پوری کمان صرف میرے دل میں پیوست کر دی اور اب بیکار پڑا ہوا میرے ٹوٹے ہوئے مونڈھے پر خراٹے لیتا رہتا ہے میں تو چلا تو اسے سنبھال ری غارت گر! اور وہ تیری جلوہ گاہِ حق! معاذ اللہ وہ تو افیونی کی کوٹھری سے بھی بدتر ثابت ہوئی، وہاں کٹوری میں ایک جرعہ تو مل جاتا ہے یہاں تو کچھ بھی نہیں۔ نہ تلخی ہے نہ شیرینی۔ اور شہرت، اور عزت!! توبہ توبہ تو نے تو بڑی خطیبہ! یہ شہرت جو اخبارات و رسائل میں تصاویر اور تذکرہ شائع ہونے اور بے روح مجلسی تحسین و ستائش تک محدود ہے، افسوس تو کبھی صبح سویرے میرے کمرہ پر نہیں آئی جب لالہ جی تقاضے کے لئے آتے ہیں اور خدا معلوم تو اس وقت رضا شاہ کا تاج یا میرے لئے مصطفیٰ کمال کی تلوار چرانے چلی گئی تھی یا ایران سے تخت طاؤس اڑانے کی فکر میں تھی جب میرے نام دو ہزار روپے کی ڈگری آئی خدا معلوم تو خیام و حافظ سے میرے لئے سارٹیفکٹ لینے جاتی ہے یا کیٹس اور شیلے کی روحوں کے پاس اعتراف نامے لکھوانے کے لئے جب میں صبح سے شام تک قرضداروں سے وعدے کرتا ہوں وہ سب از سرتا پا غلط ہوتے ہیں۔

کامیابی! کامرانی! ؟ ——— ان الفاظ کی تعبیر کیا ہے؟ روحانی اور مادی طور پر مستقل ایک جہنم میں پھنستے رہنا اور تیری وجہ سے سرزد ہو چکنے والے جرائم کی بنا پر کامیاب و کامراں لوگوں کو خوش کرنا۔ وہ جو احمق ہیں پست ہیں اور درندوں سے زیادہ خطرناک ہیں ان کے بیہودہ اور بےحس خندہ ہائے خوفناک!

تُف میرا ہاتھ چھوڑ دے بد خود غلط عورت! تو نے مجھے کچھ نہیں دیا اپنے جہنم میں جھونک دیا۔

اے زندگی! زندگی!! اچھا یہ بتا کہ بہ فرض محال تو نے عجیب و غریب نعمتیں مجھے عطا کیں مگر تو میرے لئے مہاجن کی قسمت کیوں نہیں لائی۔ جیتی اگر تو کل صبح تک میری قسمت کسی مہاجن کی قسمت سے بدل کر لا دے تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ کبھی موت کے ساتھ نہیں جاؤں گا۔ اور یہ تیرے تحفے ادبی۔ ال[illegible] کو تو واپس لے لے اور مجھے "دلیپنیہ" کی آواز قسمت [illegible] سے ساہو[illegible] عنایت کر دے

تو جیتا اسی وقت منظور۔ تجھکو معلوم ہے کہ میں یا مہاجن بننا چاہتا ہوں یا پیغمبر تو نے باوجود اس کے کہ مجھے داؤد علیہ السلام کا لحن پرا کر دیا مگر میں پیغمبر نہیں بن سکا، پھر کیا تجھ داؤد علیہ السلام کے مقبرے میں داخل ہو سکتی ہے جہاں پہرہ دار فرشتوں کی ایک فوج متعین ہوگی، وہ بہادر عورت "امپیریل بینک" میں نہیں جا سکتی جہاں صرف ایک پرانی شکاری بندوق اور ایک زنگ آلود بلم لگا ہوتا

زندگی ہنسی اور شاعر کے بازو میں چٹکی لیکر بولی!۔

حماقت میں نے تجھکو اسی لئے دی تھی اور اپنے گہوارۂ ادب میں کامل ۲۸ سال تربیت کا بھی یہی صلہ ملنا چاہئے تھا کہ تو میرے ساتھ استہزا کرتا ہے کمبخت تجھے خود اندازہ نہیں کہ تو کتنی بڑی شخصیت ہے۔ آہ آدمی اپنا عرفان نہیں کر سکتا۔

شاعر نے کہا!۔

خصوصاً جب وہ قرضدار ہو۔ اور موت، وفرض دو چیزیں نہیں یہ جو تیری بہن سیاہ لبادہ پہنے ہوئے پریشاں مو و تشنہ لب میرے سرہانے کھڑی دونوں شانوں سے مجھے اٹھا لینا چاہتی ہے مجھے اس کے آنے سے اتنا خوف معلوم نہیں ہوتا جس قدر قرضخواہ کے شیریں تبسم اور التجائے منفعل سے۔ کیا حرج ہے بجائے اس کے کہ دیوالیہ ثابت ہوں آسان ترین تدبیر اس سے بہتر اور کیا ہو سکتی ہے کہ تیری سیاہ رو بہن کے رتھ میں بیٹھ کر نامعلوم ابدیت کی طرف اڑ جاؤں پھر دیکھوں کہ عدالت عالیہ کے کون سے جج صاحب میرا تعاقب کر سکتے ہیں، سب دیکھتے رہ جائیں گے ——— یہی نہیں بہت سی علتوں سے آزادی ممکن ہے۔ منفکر دماغ و دل کے ساتھ ہر ڈاک میں لفافوں پر "حضرت" "مولانا" "مصورِ قدرت" "شاعرِ انقلاب" "مدیرِ اعلیٰ" اور کم از کم "مدظلہ العالی" کی دشخراش لعنت سے تو آزادی حاصل ہو جائے گی روح اس کرب سے تو محفوظ ہو جائے گی جو اس طرح گھلائے دیتا ہے گویا میں موم کی ہو

زندگی بولی!۔ خاموش ہو جاؤ۔

موت نے کہا! چپ رہو شاعر اس کے لئے تیار ہے کہ وہ ابدی سکون اور ہزار والی شانتی میرے گداز و نرم شہپروں میں حاصل کرے تدبیر تدبیر زندگی اسکتی تھیں اس میں کوئی گنجائش باقی نہیں رہی ہے۔ فرشتے جو اس سکون کی مے ارغواں کے رنگین و خنک جام کشتیوں میں لئے کھڑے آئے ہیں۔

زندگی!۔ ٹھہرو! اگر ان میں سے ایک بھی میرے شاعر کی طرف بڑھا تو میں ان بدھوں کو گرادوں گی خواہ قدرت اس گستاخی کی عوض میرا خاتمہ کیوں نہ کر دے ———

——— یہ دیکھ ملک کیا چیز رہا ہے یہ خبارات روزانہ ہیں یہ ہفتہ وار ہیں ——— یہ ماہنامے ہیں ——— یہ ذاتی نسخہ ہائے ہیں۔

موت!۔ بتاؤ اس انبار کو یہ سب دنیا سازی ہیں [illegible] اور تم کیا سنا چاہتی ہو کیا اشعار کی ضرورت [illegible] ہو کیا افراد کی حاجت صرف تمہیں او تمہاری [illegible] دنیا کی ندیمہ ہو ——— [illegible] کی ضرورت ہے جو [illegible] [illegible]

جنہیں زیادہ تر ضعیف العمر، ضعیف القویٰ ہیں سنتے سنتے عاجز آگئی ہیں۔

زندگی۔ خوب! میرے شاعر کے ترنم میں نغمہ کی تمام ترکیبات نہیں پائی جاتیں۔ وہ شاعر ہے مغنی نہیں! اس ضرورت کے لئے آپ ہندوستان کے دوسرے شعراء کی طرف بھی تو توجہ کیجئے! یہ یہیں اٹک کے کیوں رہ گئیں ہیں!؟

موت۔ بہن تمہاری تجویز درست ہے میں جانتی ہوں لیکن تمہارے شاعر کے علاوہ ترنم سے پڑھنے والے جتنے شعراء ہیں اُن میں بدقسمتی سے بعض ایسے نقائص ہیں جن کی وجہ سے میں اُن کی طرف توجہ نہیں کر سکتی۔ معاملہ حوروں اور شہزادیوں کا ہے

زندگی۔ جی ———— مثلاً

موت۔ سب ضرورت سے زیادہ خوبصورت ہیں۔

زندگی۔ تو پھر کیا ضرورت ہے کہ تم ہندوستان پر اپنے منحوس فنپروں کا سایہ ڈال کر ایک ایسے نوجوان کا خاتمہ کرنا چاہتی ہو جس سے مستقبل کی امیدیں وابستہ ہیں ترکی میں چلی جاؤ، وہاں حسین و غنائی شاعر مل جائیں گے۔ یورپ میں چلی جاؤ، وہ تمہاری طرح کالے گورے کے فرق و امتیاز میں مشہور ہے۔

موت۔ میرے ہاتھ جام سکون کے ابدی وزن سے تھرائے جاتے ہیں اور تم اپنی لڑائی ختم نہیں کرتیں اگر تم سے ازلی بہناپا نہ ہوتا تو میں ایک لمحہ میں شاعر کے تھراتے ہوئے لبوں اور درد سے کراہتے ہوئے ہونٹوں سے اس جام کو قریب کر دیتی جس کے پینے کے بعد وہ تمہارے فریب اور جھوٹے فلسفے سے آزاد ہو جاتا! کمبخت تو ازل سے اس کوشش میں ہے کہ لوگوں کو روکے مگر ازل سے اس وقت تک اور اس وقت سے ابد تک تو میرے مقابلے میں ناکام رہے گی۔ جاؤ! اے نوجوان فرشتو! ملکی نفیری جس میں وداع کے لطیف ترین نغموں کی لے پُرسکون رقص کرتا ہو، میں اب اپنا کام کرتی ہوں ~~~~~~~

زندگی۔ (موت کا ہاتھ روک کر) نہیں، نہیں، ڈائن بہن، صبر کرو، تم کو رحم نہیں آتا، قوم پر رحم نہ کرو، مستقبل پر رحم نہ کرو، اس کے خاندان پر رحم نہ کرو، اعزا اور احباب پر رحم نہ کرو لیکن اس کی جوانی پر تو رحم کرو!

موت۔ کبھی ایسا ہوا ہے کہ میں نے ان میں سے کسی پر بھی رحم کیا ہو، خصوصاً جب مجھے ایک ضرورت کے سلسلہ میں تمہارے شاعر کی روح سلب کرنی ہے ذرا غور سے سنو ہم نے اپنی "ابدیت" میں "انٹرنیشنلزم" کے اصول کو جاری کیا ہے اسی لحاظ سے رسم الخط اور زبان میں بھی انقلاب کیا ہے ظاہر ہے کہ ہماری ابدیت کی آبادی دنیا سے گئے ہوئے انسانوں ہی کی بستی ہے، لہٰذا اس میں "عالمگیریت" خود بخود پیدا ہو گئی ہے لیکن زبان کا جہاں تک تعلق ہے لاکھوں برس کے بعد صرف ہندوستانی (اردو) زبان نے ہماری مشکلات کو حل کیا ہے کیونکہ ہم پر واضح ہو گیا ہے کہ یہی وہ زبان ہے جس میں دنیا بھر کی زبانوں کے الفاظ پائے جاتے ہیں، اسی لئے ہم نے اس کو وہاں رائج کر دیا، چنانچہ نئے اصلاحات کے نفاذ کے فوراً بعد ہی تمہارے شاعر کے لئے "شاعر ابدیت" بنانے کا فیصلہ کیا گیا کیونکہ ہندوستانی زبان کا شاعر ہی خصوصاً ہر قوم کے افراد کی تسکین شعری کا باعث ہو سکتا ہے، پھر تمہارا شاعر تو ہندی زبان کا بھی شاعر ہے اور اس کی نظموں کو ہندوستان کی وہ راجکماریاں جو اپنے شوہروں کے ساتھ ستی ہو گئی ہیں اور جن کو ہماری ابدی دنیا نے بہت بڑے مدارج عطا کئے ہیں، بیحد پسند کریں گی، دیکھو بہن ممکن ہے کہ وہ اپنی صبح و شام کی پوجا میں ان کو شریک کر لیں یہاں دنیا میں کون ایسی دوشیزہ ہو سکتی ہے جو ٹوٹے ہوئے اک تارہ ہی پر تمہارے شاعر کی کوئی غزل گنگنائے، خصوصاً اس زمانے میں جبکہ مشرق کی کنواریاں مغرب زدگی کے جال میں پھنس کر زرکار ساڑیوں کے پلو اور بٹوں پر تیرتی ہوئی شاندار موٹر کاروں میں چکر لگانے اور حسن کی نمائش میں اپنے لطیف ترین حسِ عصمت کو تباہ کر چکی ہیں۔

شاعر۔ زندہ باد، موت! میں تو تیرے ہی ساتھ چلوں گا، لا یہ جام میرے لب زندگی کے رس سے خشک ہو گئے "زندگی تو زندگی موت بھی" "مغرب زدگی" پر نکتہ چیں ہے! حُسن و نسوانیت کی توہین اس سے بھی برداشت نہیں ہوئی۔ سُن تو سہی میری پیاری موت! آخر اس کا کیا سبب ہے کہ موجودہ زمانے میں "حُسن" و "نسوانیت" "حقیقی محبت" کے مقابلہ میں مادیت سے زیادہ متاثر دیکھی جاتی ہیں۔

موت۔ محض اقتصادی بدحالی، اور اخلاقی پستی: تمہاری بیوی کو میں نے سرہانے نہیں دیکھا!

شاعر۔ محض اقتصادی بدحالی، اور اخلاقی پستی! اور بات یہ ہے کہ اس کا ہیولیٰ ابھی معرضِ تخلیق میں ہے۔

موت۔ تو تمہیں دو کلائیاں بھی نصیب نہیں جن میں پڑی ہوئی چوڑیوں کے ٹوٹنے کی آواز تمہارے نفسِ واپسیں سے ہم آہنگ ہو کر بیوگی کا نغمہ بلند کر سکے!

شاعر۔ تم بڑی بیوقوف سی ہو، کیا آجکل لڑکیوں کی موت کا سلسلہ بند ہے؟

موت۔ نہیں تو۔

شاعر۔ تو کیا تم نے دیکھا نہیں کہ چوڑیاں اب کم پہنی جاتی ہیں، اور ٹوٹتی ہے تو وہ گھڑی ٹوٹتی ہے جس میں ملاقاتوں کے وقت دم توڑتے رہتے ہیں۔

موت۔ (گھبرا کر) بیوی نہیں تو محبوبہ بھی نہیں؟! تمہاری بالیں پر میں کسی لڑکی کو نہیں دیکھتی تم کیسے شاعر ہو؟ اور تمہاری شاعری میری دنیا میں کیونکر مقبول ہو سکتی ہے؟ جو مطلق رومان ہے اور ہاؤ ہوئے محبت کے علاوہ کچھ نہیں!

شاعر۔ ہاں! میں نے بیماری کے حملے سے پہلے ایک "شادی ایجنسی" کو آرڈر دیا تھا کہ وہ ایک ایسی لڑکی تلاش کر کے مجھے "پارسل" کر دے جو روحانی طور پر مشرقی ہو اور مادی طور پر مغربی: مگر اس آرڈر کے پہنچتے پہنچتے اس ایجنسی میں آگ لگ گئی۔ اتنے ہی میں آپ کی سواری آگئی "یوں نہ اس پیام کو آپ قبول کر لیں۔!؟"

زندگی۔ جو شخص اس درجہ ستھری ہو لے موت کیا تمہاری ابدیت اس کی بیگانگی اور آزادی برداشت کر سکتی ہے؟

موت۔ (عالمِ تحیر میں) یہ شخص تو حوروں کا ناک میں دم کر دیگا، اور شہزادیوں کی نازک طبیعت اس کی شاعرانہ الوہیت کیونکر برداشت کر سکے گی!!)

شاعر۔ موت! یہ تو بتاؤ کہ تمہاری دنیا میں فیڈرل حکومت ہے، یا شخصی، یا ڈکٹیٹرشپ کا رواج ہے! سلطنت مذہب کے ماتحت ہے یا مذہب ریاست کے زیر اثر اور سلطنت میں "شاعر" کا کیا درجہ ہے؟ کیا یہی کہ باوجود راز دانِ قدرت ہونے کے اس کو دیویلینی اور مطلوب بلند خیال نہ کیا جائے، تم کبھی موسیولینی کے پاس بھی گئی ہو؟ ذرا دیکھ تو ایک پاؤں تمہارا اطالوی سمالی لینڈ اور عدیس ابابا ہی میں رہتا ہو گا!؟

موت۔ تم پر نزع کی حالت طاری ہے اور تم جبرئیل کے جاتے ہوئے شاعر! جہاں تم کو لیجایا جا رہا ہے اس مقدس مکان جاوداں کو فیڈریشن اور تخصیت اور ڈکٹیٹرشپ سے کوئی تعلق نہیں وہ دنیا جہاں کے لئے تم تیار ہو رہے ہو مذہبی تصوری کا نتیجہ ہے اس لئے سب کچھ وہاں مذہب کے ماتحت ہے سلطنت میں شاعر کا کیا درجہ ہو سکتا ہے ———— یہی کہ اچھے شعر کہے اور ترنم کے ساتھ ارکان سلطنت کو سنائے افلاطون نے بھی تو یہی کہا ہے کہ سلطنت میں شاعر کا کوئی درجہ نہیں؟

شاعر۔ (بات کاٹ کر) افلاطون تو دیوانہ تھا مگر کیا تمہاری ابدی دنیا میں بھی شاعر کا یہی درجہ ہے جو اس مادی اور سفلی دنیا میں ہے؟ کیا شاعر کا کام موردوں اور شہزادیوں کے مجمعوں کو خوش کرنا ہے؟ موت تم کو میری نظم سنانے کی فیس کا علم ہے!؟

موت۔ (اب میرا کام مکمل ہو جانا چاہئے دماغ بھی متاثر ہو چکا) فیس! کیسی فیس تم میری مانند ہو اور نہیں تم کو اپنے "دارالقضا" میں اتار کر بچوں کی بھیڑ تم کو ایک نامعلوم طاقت کی عظیم مرضی کے ماتحت زندگی بسر کرنی ہوگی مگر آزادی کے ساتھ یعنی نہ دو موت ہوگی، نہ زندگی ایک عجیب ہی عالم ہوگا۔

شاعر۔ پھر اس کا مطلب؟ پھر اس کا انجام؟ ! تو وہاں بھی گورنمنٹ ضرور ہوگی طاقت اور دوسرے کی مرضی یہ میرا پیچھا نہیں چھوڑے گی موت تمہاری ابدی دنیا میں تم جیسی تو لاکھوں دادیاں ہونگی اے موت میری سب سے بڑی آرزو یہ ہے کہ میں خود بھی ریاست کا اعلیٰ حضرت بن جاؤں اور پھر دنیا سے ایک شاعر کو تمہارے ذریعہ قصیدہ خوانی کے لئے طلب کروں اور تم کو ہدایت کروں کہ شاعر سر لایا جائے۔

موت۔ یہ بھی ممکن ہے مگر یہ تمہارے عمل پر منحصر ہے اگر تم نے نیکی کی ہوگی اور حاجتمندوں کو خیرات دی ہوگی تو تم کو ایک ہی عوض "ستر ہزار" میں ملے گا اور رہا دنیا سے شعرائے بلانے کا سوال تو وہ سلسلہ بالکل تیزی سے جاری ہے کیونکہ عالم بالا پر روحوں کے لئے اسی توازن سے کام نہیں ہے جس توازن سے دنیا میں بیکاری بڑھتی جاتی ہے اور اس وقت ان سے زرین شغل یہی خیال کیا گیا ہے کہ شعر سے دل بہلایا جائے۔

شاعر یہ جو فرمائیے عالم بالا کی روحوں کا مزاج بھی سرمایہ دارانہ ہے اور شعراء کا مصرف آپ کی بدبختی کی آبادی کے نزدیک نیست ہی بدتر ہے، موت تم کو علم ہے کہ میں بالشویک عقائد رکھتا ہوں، اور اگر ضرورت پڑی تو عالم بالا میں اس کے پروپیگنڈے سے باز نہ آؤں گا۔ میری پہلی شرط یہ ہے کہ میں کسی جگمارتی اور شہزادی کو سوائے میرآں بائی، زیب النساء اور نورجہاں کے شعر نہیں سناؤں گا۔ اور نہ کسی سے ملونگا اس کے علاوہ جہانگیر کی موجودگی میں نورجہاں سے میری ملاقات ممکن نہ ہوگی۔

موت تمہاری ساری گفتگو سے میں اس نتیجہ پر پہنچی ہوں کہ زندگی اور تم میں کوئی فرق نہیں، بلکہ میرے لئے تم زندگی سے بدتر ثابت ہوئے، دوسرے یہ کہ تم مجھے بحیثیت شاعر اپنی "ابدیت" میں لیجانا چاہتی ہو، ذرا سی بات سے میں گھبراتا ہوں، دنیا کی مشکلات کا علاج تو تم ہو جاؤ گی، مگر تمہارا علاج؟ علاج دیکھو تم اک لاعلاج مرض، اور ابدی غم بن جاؤ گی! ابدی دنیا میں شاعرانہ حیثیت تب پہنچنے، یعنی یہ کہ میں ہمیشہ شاعر رہوں گا اور بقول تمہارے ابدیت کی پبلک کو خوش کرنا میرا کام ہوگا، تو پھر اس حیثیت میں جانے کیلئے آمادہ نہیں۔ البتہ اگر تم ابدیت کا "وزیر مال" مجھے بنا دو اور ایک ہزار سال کی تنخواہ پیشگی اسی وقت دیدو تو حاضر ہوں!

دوسری شرط یہ ہے کہ اپنے عقائد کی آزادی اور اشاعت میں میں کسی کا مقید نہیں رہوں گا، مثلاً دوزخ کے دوستوں کو اپنے محل میں گاہے بگاہے بلاؤں، حضرت عیسیٰ سے ان کے فلسفہ اخلاق اور جنگ ابی سینیا و حبش پر گفتگو وغیرہ۔ بولو راضی ہو۔

موت یعنی!؟

زندگی۔ یعنی اگر تم اپنی دنیا کے لئے ایک خوفناک باغی لیجانا چاہتی ہو جو سوسائٹی کے تمام نظم مرلود رہم و برہم کر دے اور بغاوت کے جراثیم خود تمہارے خلاف پیدا کرے تو اپنا جام اٹھاؤ اور اس کے لبوں سے لگا دو۔

موت۔ خیالات ضرور خطرناک ہیں مگر کیا مجھ سے زیادہ اس کا پاکی کا کوئی نظریہ میرے ٹل خنجر کے سامنے چل سکتا ہے میں ایک امر قطعی ہوں، میرے بعد تاریکی ہے نہ روشنی ———— میں اس کے حلقوم کو جو ابھی تک نفس کی آمد و شد سے تر اور گرم ہے خشک اور سرد کر سکتی ہوں، یہ تو نے کیا کہا اے زندگی! اس کی مادیت اور اس کی شوخی کا رنگ میرے ایک جھٹکے میں پھیلا پڑ جائیگا، ہمرکاب فرشتو اپنا کام کرو!

عمال مرگ۔ اے موت! آغاز کار میں تو کوئی دیر نہیں ہے لیکن جان بخشی ہو تو کچھ عرض کریں

موت۔ کیا کہنا چاہتے ہو کہو!

عمال مرگ۔ دارالقضا سے چلتے وقت یہ یاد نہیں رہا کہ ہم جس شاعر کے مکان پر سلب روح کے لئے جا رہے ہیں اس کا نام "س" سے ہے یا "ص" سے۔

موت۔ شدید غلطی! اب ممکن نہیں کہ ہم اس شاعر کو اپنی ابدی دنیا کی رونق و حیات کے لئے لے جا سکیں۔

یہ سنکر زندگی نے اپنے شہپر سے جام مرگ زمین پر گرا دیا
موت نے مڑ کر دیکھا اور اپنے بال نوچ کر بولی:۔

موت۔ یہ کیا؟

زندگی۔ غلطی۔ شکست۔ فتح ———— نکل جاؤ اس خوابگاہ سے جس کے ذرہ ذرہ میں دوبارہ میں نے حیات دوڑا دی ہے اور رونق ہو گئی ہے۔ میرے تازہ الفاظ نے ایک نئی زندگی کی روح دوڑا دی ہے قدرت کا رازداں اور روح القدس کا مشیر اب ایک تھکے ہوئے فرشتے کی طرح میرے پھولوں کے بستر پر آنکھ بند کر لینا چاہتا ہے، اٹھاؤ اپنے جام کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے اور اپنے پلیوں سے واپس ایوان مقدس کو جھاڑتی ہوئی اس ویرانہ جنگل کی طرف جلد جلد چل جاؤ جہاں ایک تیز براق تمہارا انتظار کر رہا ہے۔ راستہ جنگل سے شروع کر کے یہی ہے تمہاری معلوم ابدیت کا راستہ۔

شاعر نے آنکھ کھول کر کہا! زندگی! تو نے میری نئی نظم ————

زندگی۔ (بات کاٹ کر) خبطی

فہم کی فریب کاریاں

(فکر تازہ از سید محمد عسکری طباطبائی بی اے)

عسکری صاحب کی ایک تازہ غزل مع مکتوب نواب جعفر علی خاں صاحب آثر لکھنوی مشترک نمبر کی زینت کی جاتی ہے، غزل حقیقی قلبی تاثرات پر مبنی ہے۔ اگر خیال و بیان پر مجھے قدرت ہوتی تو میں اس غزل کے اُن اشعار پر ضرور سر دُھنتا جو تحسین و ستائش سے بلند ہیں، اور اُن کو صرف وہ نفوس سمجھ سکتے ہیں جن کے دل پر بیتی ہے اور جو زندگی کی نہایتوں کو بھی چھوڑ کر دور نکل آئے ہیں ؎

شوق کی صبر آزما وادی میں تھک کر رہ گئے — انجم و پرویں کو اپنا ہم سفر سمجھا تھا میں

مجھ کو حیرت ہے کہ عسکری لکھنویت سے کس قدر بلند اور بے نیاز ہے ؎

خونِ ذوقِ پائمالی ہے چمن اندر چمن — تختۂ گل کو کسی کی رہگذر سمجھا تھا میں

اور گو اس شعر میں ہلکا سا شائبہ رنگ لکھنؤ کا پایا جاتا ہے مگر جذبات کا رنگ اور چہک لکھنوی نہیں ہے، بجائے تصنع کے شعر دلی تاثر کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے ؎

آنکھ کھلتے ہی اسیرِ حسرتِ پرواز تھا — دام کے حلقے تھے جن کو بال و پر سمجھا تھا میں

اسکے علاوہ بھی کئی شعر اس غزل میں ایسے ہیں جنہیں بے تحاشا گنگنانے کو جی چاہتا ہے۔

اس غزل کے ساتھ ہی جناب آثر لکھنوی کا مکتوب گرامی بھی عسکری صاحب نے ارسال فرمایا ہے جو بجائے خود ایک "شعر منثور" ہے اور جس کے لفظ لفظ سے ناظر کے عمیق ذوقِ مطالعہ اور نبّاضِ فطرت ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔

ساغر نظامی

مکتوب آثر

"غزل دیکھی بہت پسند آئی۔ خدا کرے یوماً فیوماً ترقی کرو۔ دراصل اصلاح کی ضرورت نہ تھی، کہیں کہیں ترمیم تجویز کر دی ہے۔

آج کل پہاڑی مقامات کا دورہ کر رہا ہوں، مناظر کی رعنائی اور تنوع حدِ بیان سے باہر ہے۔ مبہوت کرنیوالے، مسحور کرنیوالے ہیں۔ ہر پھول خدا کا ایک حسین معبد ہے، اعضا و جوارح کیلئے نہیں بلکہ روح کیلئے۔ جبین اور ہونٹوں کیلئے نہیں بلکہ دل اور نظر کے لئے۔ اُس وقت ہر سانس میں نماز اور ہر نگاہ میں سجدہ ادا ہوتا ہے۔ انسان خدا سے نزدیک اور رابد سے ہم آغوش ہو جاتا ہے۔ دل کو وہ سکون و سرور محسوس ہوتا ہے جو کسی متوالی کرنے والی چیز میں نہیں، شراب ہو کہ ماورائے شراب۔ روح کی کثافتیں دھل جاتی ہیں، گناہوں کا زنگ دور ہو جاتا ہے، فانی و باقی کا امتیاز مٹ جاتا ہے۔ آنکھ اُٹھی اور اشارے ہونے لگے، ہاتھ پھیلائے اور کوئی ہمکنار تھا۔ ان مقامات پر دُعا مانگنا گناہ ہے، آرزو جرم ہے، ان کا خیال ہی نہیں گزرتا، پرچھائیں بھی نظر نہیں آتی۔ نظارے کا جواب نظارے سے ملتا ہے، چھوٹ پر چھوٹ پڑتی ہے، تجلی تجلی میں جذب ہو جاتی ہے۔ انسان اپنے کو نہ عظیم سمجھتا ہے نہ حقیر، بلکہ ہستی محدود کا جزو بن جاتا ہے جو ہر قید سے بالاہے"

افسوس اُن کیفیات کا اعادہ ناممکن ہے جو دل پر طاری ہوتی ہیں۔

مجھے اُن شاعروں پر ہنسی آتی ہے جن کا دعویٰ ہے کہ ہم مناظرِ قدرت نظم کرتے ہیں، جھوٹ، بالکل جھوٹ، فطرت کی گہرائیوں تک پہنچنا تو درکنار اُسکے ظاہری حسن و جمال کا ایک شمہ نہیں بیان کر سکتے۔"

خیرطلب ۔ آثر

حلقہائے رنگ تھے، گلہائے تر سمجھا تھا میں دامِ نظّارہ کو فردوسِ نظر سمجھا تھا میں

راہ میں تیری، خرد کو باخبر سمجھا تھا میں آپ تھا گمراہ جس کو راہبر سمجھا تھا میں

دامنِ تر دامنِ گلچیں کو شرمانے لگا چشمِ خونابہ فشاں کو بے ہنر سمجھا تھا میں

وائے ناکامی کہ یاں تک بھی نہ پہنچا کامِ دل جاں بقدرِ التفاتِ یک نظر سمجھا تھا میں

بعدِ آشوبِ شبِ غم، مہرِ عالمتاب کو صبح کے رخسار پر اک اشکِ تر سمجھا تھا میں

ایک حشرِ شور افزا، ایک طوفانِ ابد زندگی کو داستانِ مختصر سمجھا تھا میں

شاہدانِ رنگ رنگ و نوبہارانِ جمال غنچہ و گل کو حجاباتِ نظر سمجھا تھا میں

میکدہ انداز تھی، نوروزِ گلشن کی ہوا ہر کلی کو ساقیِ زریں کمر سمجھا تھا میں

آنکھ کھلتے ہی اسیرِ حسرتِ پرواز تھا دام کے حلقے تھے جن کو بال و پر سمجھا تھا میں

پرتوِ خورشید سے روشن ہے شبنم کا ضمیر دل کے آئینے میں تجھ کو جلوہ گر سمجھا تھا میں

خونِ ذوقِ پائمالی ہے چمن اندر چمن تختۂ گل کو کسی کی رہگذر سمجھا تھا میں

جلوہائے مہر و ماہ و چشمکِ برق و شرار ہو بہو تیرے اشاراتِ نظر سمجھا تھا میں

اُف شبِ مہتابِ ہجراں کی جنوں افزائیاں چودھویں کے چاند کو داغِ جگر سمجھا تھا میں

شوق کی صبر آزما وادی میں تھک کر رہ گئے انجم و پرویں کو اپنا ہمسفر سمجھا تھا میں

آبدوز کشتی کی ایجاد

بنا بعد یہ خواہ کتنی ہی ترقی کیوں نہ کرے لیکن اولیت کا سہرا موجد اوّل ہی کے سر رہتا ہے اور زندہ جاوید اُسی کا نام رہتا ہے۔

آبدوز کشتیوں کی ایجاد کے بارے میں بھی متذکرہ بالا کلیہ اسی طرح صحیح ہے جیسے اور ایجادات عالم کے لئے حالانکہ جس طرح غبارہ اور ہوائی جہاز میں مناسبت اور اختلاف ہے اسی طرح بلحاظ ساخت کی تکمیل اور پیچیدگیوں کے ابتدائی آبدوز کشتیوں کے بہ نسبت آجکل کے آبدوز جہازات باوجود اصولی اور بنیادی مناسبت کے بالکل جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں۔ اس ذیل میں بورن (Bourne)، ڈریبل (Drebbel) اور بشنل (Bushnell) کے ناموں کو تاریخ ہمیشہ یاد رکھے گی۔

۱۵۷۸ء میں ایک انگریز 'بورن' نامی نے ایسے جہاز کا تذکرہ لکھا ہے جس میں چمڑے کا استر لگا ہوا تھا۔ اور اس میں کچھ ایسا انتظام کیا گیا تھا کہ جب جہاز کے اوپر کے پیچوں کو کس دیا جاتا تو جہاز میں پانی بھر جاتا یہاں تک کہ وہ غرق ہو جاتا۔ پھر جب جہاز کو سطح آب پر لینا منظور ہوتا تو وہ پیچ ڈھیلے کر دئے جاتے۔ اس طرح جہاز کا سب پانی نکل جاتا اور جہاز سطح آب پر تیرنے لگتا۔ لیکن یہ جہاز آگے نہیں چلایا جا سکتا تھا۔ اس لئے یہ محض ایک ڈوبنے والے ڈول کی طرح تھا۔ اور زیادہ گہرائی میں نہیں جا سکتا تھا، کیونکہ سطح آب سے جو نالیاں تازہ ہوا جہاز کے آدمیوں کے لئے لانے میں استعمال ہوتی تھیں اُن نالیوں کی لانبائی پر اس جہاز کی غوطہ زنی منحصر تھی یعنی جس قدر نالی لانبی ہوتی اتنا ہی گہرا غوطہ جہاز لگا سکتا تھا۔

۱۶۲۳ء میں یعنی تقریباً پچاس سال بعد ایک ڈچ حکیم نے دو آبدوز کشتیاں ایسی تیار کیں جن کے جوڑوں پر چمڑہ لگا ہوا تھا اور بارہ عدد پتواروں سے چلائی جاتی تھیں۔ البتہ یہ وزنی زیادہ تھیں۔

رابرٹ بوایل (Robert Boyle) لکھتا ہے کہ "ان آبدوز کشتیوں میں جو لوگ ہوتے تھے وہ باوجود کشتی کے پانی میں غرق ہونے کے بخوبی طور پر سانس لے سکتے تھے کیونکہ کیمیاوی ترکیب سے چمڑے کی بوتلوں میں اُن لوگوں کے سونگھنے اور زندہ رکھنے کے لئے ہوا بھری رہتی تھی۔"

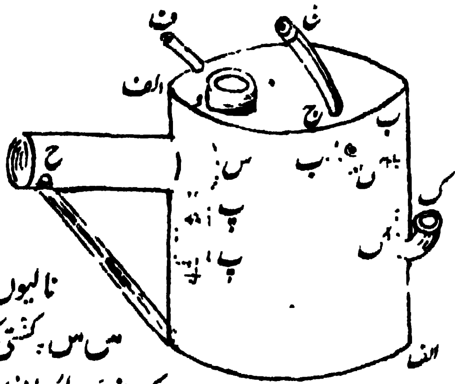
اس کے بعد ۱۶۵۳ء میں ڈی سون De Son نے راٹرڈیم Rotterdam میں ایک نئی وضع کی کشتی بنائی۔ اس میں یہ ترکیب رکھی کہ پانی جب اس میں اندر بھر لیا جائے تو کشتی غرقاب ہو جائے اور صرف بالائی حصہ کشتی کا یعنی جھنڈی وغیرہ نمایاں رہے۔



راٹرڈیم میں ۱۶۵۳ء میں جو آبدوز کشتی تیار کی گئی یہ نقشہ جو اس کے موجد کے بنائے ہوئے کشتی کی شکل ہے اس کے وسط میں ایک پہیہ ہے اور ملاحوں کے چلنے پھرنے کے لئے ایک کٹہرا بنا ہوا ہے اور وہ پہیہ جس سے کشتی آگے پیچھے حرکت کرتی تھی صاف معلوم ہوتا ہے۔

پہیہ جو گھڑی کی سی چال پر چلتا تھا وہ اپنی حرکت سے کشتی کو آگے چلاتا رہتا تھا لیکن باوجودیکہ یہ کشتی پانی پر اچھی طرح چلتی تھی۔ اندرون سمندر بوجہ کمی طاقت محرکہ کے اتنی اچھی طرح نہ چل سکی۔

۱۶۸۹ء میں شہزادہ چارلس والی ہیسی کیسل کے لئے ایک نئی طرز کی کشتی تیار ہوئی مگر یہ محض ایک غوطہ زن کشتی تھی۔



۱۶۸۹ء میں شہزادہ چارلس آف ہیسی کیسل کے لئے یہ آبدوز کشتی تیار ہوئی تھی۔
حرف الف = لکڑی کا ٹب۔
ب ب = پنکھا جس سے ہوا ج ج نالیوں کے ذریعہ اندر جاتی۔ د د = دروازہ۔
س س = کشتی کو پانی میں غوطہ دینے یا غرقاب کرنے کے لئے پانی کا وزن بھرنے کی نالی۔ ح = وہ سوراخ جس کے ذریعہ دوسرے جہازوں پر گولے پھینکے جاتے۔ پ پ = پچکاری یا پمپ۔
ف ف = فاضل ہوا کے اخراج کے لئے نالی۔ ک ک = بیرومیٹر۔

۱۷۴۷ء میں مسٹر سائمنس (Simons) نے ایسی آبدوز کشتی تیار کی جس میں چمڑے کی بہت سی منہ مشکیں تھیں اور کشتی کا نیچے کا حصہ کھلا ہوا تھا جب مشکوں کے منہ کھول دیے جاتے تو پانی ان میں بھر جاتا اور کشتی ڈوب جاتی۔ اب پتواروں کے ذریعہ کشتی کو سمندر کے اندر چلایا جاتا تھا پھر جب سطح آب پر آنا منظور ہوتا تو مشکوں کو ہاتھوں سے دبا دبا کر اُن کا سب پانی نکال دیا جاتا۔



۱۷۴۷ء میں یہ غوطہ زن کشتی تیار ہوئی اس میں حرف ج ق نچلدار سروں کے پتوار ہیں اور حروف د چمڑے کی سربند مشکیں ہیں۔

امریکہ کی جنگ آزادی کے دوران میں بشنل (Bushnell) نامی ایک امریکن نے ایسی ایک کشتی بنائی جو ایک جنگی جہاز کو اُڑانے میں قریب قریب کامیاب ہو گئی تھی اس میں یہ ترکیب رکھی تھی کہ پیچ کھول دینے پر اس میں پانی بھر جاتا تھا اور یہ غرقاب ہو جاتی تھی۔ جب اوپر آنا ہوتا تو اس میں پہلے سے رکھا ہوا کچھ وزن ہوتا تھا وہ کشتی میں سے نکال دیا جاتا تھا اور کشتی ہلکی ہوتے ہی اوپر پانی کے آجاتی۔ اس کشتی نے ایک انگریزی جہاز کے نیچے آکر



اُسے اڑانا چاہا۔ مگر بخوبی اُڑا نہ سکی۔ اس ناکامی نے زبردست کامیابی کو دعوت دی نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۶۲۰ء میں ڈربیل (Drebbel) نے جن اصولوں پر کشتی تیار کی تھی انہیں پر غور کیا گیا۔ اور پورے تین سو سال بعد مکینکل طریقوں سے کامیاب آبدوزی کا طریقہ دریافت ہوا۔

ڈربیل اپنی زندگی بھر "پاگل" کے لقب سے یاد کیا گیا۔ مگر تین سو برس بعد اُس کا نام زندہ ہوا۔ اور اس کی قدر ہوئی اور آج اُسی ڈربیل کے نام کا احترام تمام بحری حلقوں میں بڑی عزت سے کیا جاتا ہے۔ آبدوز کشتیوں کا کام جو گزشتہ جنگ کے موقعہ پر ہوا وہ بری اور بحری افواج کے کارہائے نمایاں سے کسی طرح کم نہ تھا۔

سیّد عنایت علی بی۔ اے (علیگ)

سازِ محبّت

دیوانہ بنادے کبھی فرزانہ بنادے
ہنس ہنس کے مجھے عشق کا ہر راز بتادے

تو اپنی نگاہیں جو ندامت سے جھکادے
خاکِ دلِ مرحوم کا ہر ذرّہ دُعا دے

ہو جاؤں پشیمانِ شکایاتِ محبّت
ہاں پھر اُسی انداز سے سر اپنا جھکادے

خود حُسن کی فطرت میں ہے دردِ نگہِ شوق
میں دیکھ لوں اس کو تو ہر اک جلوہ دُعا دے

ہے گم شدگی لازمۂ رہبریٔ شوق
کھونا ہو جسے وہ تری محفل کا پتا دے

اِک اشکِ وفا ہوں سرِ دامانِ محبّت
ہے کوئی جو دُنیا سے مرا نام مٹادے

نازک ہے بہت رُوح کی پرواز کا لمحہ
اِس وقت وہ للّٰہ نہ دامن کی ہوا دے

دزدیدہ نگاہی سے مجھے دیکھ رہے ہو
ایسا نہ ہو دِل مجھ کو گنہگار بنادے

اللہ رے اُس جلوہ گہِ ناز کے آئیں
سو پردے گریں عشق جو اِک پردہ اُٹھادے

ہوتا ہوں یونہی بارگہِ حُسن میں داخل
اِس بیخودیٔ شوق میں اک کون صدا دے

ہے میکدہ دوڑا اور فضا مستِ محبّت
ساغر سے نہیں آج تو ہونٹوں سے پلادے

ذوقِ طلبِ دل ہے غرض ہی نہیں کچھ اور
دُنیا اُسے دیدوں جو مجھے دِل کا پتا دے

اب قیدِ مراتب نہ رہی عشق میں باقی
وہ چاہے جہاں بزم میں ساغر کو بٹھادے

(بادۂ مشرق)

ساغر نظامی

مشرق کا ایک ڈرامہ نگار

آغا محمد شاہ حشر کاشمیری

از غلام علی خاں مانی ـــــــــ بی، اے، بی، ٹی (علیگ)

اپنے مرحوم دوست آغا محمد حشر کاشمیری کے متعلق میں نے وعدہ کیا تھا کہ میں ایک مضمون لکھونگا اس دوران میں غلام محمد خاں صاحب مانی (علیگ) کا مندرجۂ ذیل مضمون سید عنایت علی صاحب کے توسط سے موصول ہوا جس کے لئے میں عنایت صاحب کا شکر گزار ہوں جامعیت اور صحیح ذوق تنقید کے لحاظ سے بڑی حد تک خوب ہی۔ لیکن اکثر جگہ مجھے مانی صاحب سے اختلاف ہے۔ مانی صاحب آغا صاحب کا مولد امرتسر کو قرار دیتے ہیں اور دوسرے لوگ بنارس، اوائل عمر میں مانی صاحب آغا صاحب کے متعلق تحریر فرماتے ہیں کہ انہوں نے ایکٹری کو اختیار کیا حالانکہ میں نے آغا صاحب کی زبانی اُن کے سوانح حیات سنے جو نہایت آزاد بیانی پر مبنی تھے ان میں کہیں آغا صاحب نے یہ نہیں فرمایا کہ وہ اوّل اوّل ایکٹروں کی حیثیت سے آئے جرکھاری میں انہوں نے کبھی کمپنی نہیں بنائی البتہ میڈن کمپنی کلکتہ کو جرکھاری نے ضرور خریدا تھا اور میڈن کمپنی سے آغا صاحب کی علیحدگی کی وجہ خود مہاراجہ صاحب جرکھاری کا معاہدہ تھا جس کی ایک شرط آغا صاحب کی لازمی علیحدگی بھی تھی کلکتہ میں جب وہ اپنے بھائی آغا محمود کو کمپنی دیکر پہنچے اُس وقت وہ کافی مستغنی تھے اور انھوں نے ملازمت کو پسند نہیں کیا اور میڈن کمپنی مو نہیے جانیو اسے ڈرامے ناطق فلموں میں تبدیل کئے اور اس کا کافی معاوضہ لیا۔

آغا صاحب سے مجھے قربت کا فخر حاصل تھا اور اُن کے متعلق میرا مطالعہ ہے کہ وہ نہایت غیور انسان تھے یہ میرے علم میں ہے کہ کئی رولنگ چیف ان کو اپنی ریاستوں میں دعوت دیتے تھے لیکن وہ اپنی آزادی کے مقابلے میں ٹھکراتے رہے۔ مانی صاحب کا یہ کہنا کہ یہ طبقہ ان کا مربی نہیں ہوا۔ درخور اعتنا نہیں۔

جس رات کو کسی شہر میں آغا کا کوئی ڈرامہ کھیلا جاتا تھا۔ ہاؤس معزز ترین شہریوں سے پُر ہوتا تھا۔ اس مقبولیت کی بنا پر میڈن کمپنی ان کو ایک ہزار روپیہ تنخواہ دیتی تھی۔ مانی صاحب نے آگے چل کر آغا صاحب کا مقابلہ گالز وردی اور برنارڈ شا سے کیا ہے۔ بلکہ اُن کے مقابلہ میں آغا صاحب کو ترجیح دی ہے۔ میرے خیال سے یہ گالز وردی اور برنارڈ شا کے ساتھ زیادتی نہیں بلکہ آغا صاحب کے ساتھ عقیدت مندانہ زیادتی ہے۔

آغا صاحب پر تنقید فرماتے ہوئے اقبال کے فلسفہ پر بھی اُنھوں نے نظر ڈالی ہے اور اُن کے اس شعر کا حوالہ دیتے ہوئے اقبال کو ویدانتی اور حشر کو نظریۂ جہد کا ناشر بنادیا ہے حالانکہ اقبال کی شاعری جہدی ہے اور جس نظم سے انہوں نے مضمون میں بحث کی ہے وہ اقبال کی وہ نظم ہے جو نتیجہ تھی رام تیرتھ کی صحبتوں کا۔

شکریۂ یورپ کے متعلق مانی صاحب نے تحریر فرمایا ہو کہ مختصر نظم ہے حالانکہ وہ ایک مکمل و جامع نظم ہے اور یہی وہ نظم ہے جس نے آغا حشر کو حشر بنایا اور شاعرانہ حیثیت قائم کی۔

(ساغر نظامی)

لٹریچر دراصل ایک ذخیرہ ہے۔ بہترین دماغوں کے بہترین نتائج کا۔ لٹریچر بحیثیت عمومی حیثیت سے ہماری زندگی کے مختلف پہلوؤں کے زرّین و اہم لمحات کا انکشاف ہے جس پر ہم اپنے ماضی کی داستانیں، حال کے آئینے اور مستقبل کے خواب دیکھتے ہیں اور اسی پر ہماری آئندہ قومی، ملکی اور تمدنی نشو و نما کا بڑی حد تک دار و مدار ہے آج ہمارے سامنے یورپ بالخصوص انگلینڈ کی حیرت انگیز ترقیاں موجود ہیں۔ اس کا راز آپ کو معلوم ہوگا کس حد تک وہاں کے لٹریچر میں مضمر ہے۔ انگلستان اپنی انگریزی زبان کی حفاظت و ارتقا میں ہر ممکن صورت سے کوشاں تھا اور کوشاں ہے۔ اس نے علوم قدیمہ کو انگریزی کا جامہ پہنایا۔ دوسرے ممالک کے ادب کا اپنے ادب میں خیر مقدم کیا اور اس طرح مملو کیا کہ دوسروں کی تمام خوبیاں داخل ادب کر کے ترقی کے ہزار ہا راستے کھول دیے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزی ادب وسیع تر جامع، عام فہم اور لچکدار ہوتا گیا۔ اور اب اس کا پہلو اتنا فراخ کر دیا ہے کہ اس میں ہر غیر زبان کے نئے الفاظ اور خیالات کی گنجائش ہے چنانچہ آج انگریزی زبان آسان مختصر اور حاوی ہونے کی وجہ سے تمام مہذب و نیم مہذب دنیا میں بولی اور سمجھی جاتی ہے ظاہر ہے کہ جب غیر ملکی زبان ہم پر اس قدر چھا جائے تو اس ملک کے افکار و خیالات تمدن و معاشرت، مذہب و اخلاق الغرض جسمانی اور روحانی زندگی کا ہم پر بڑا اثر پڑے گا، ہم اپنے ملکی و قومی Culture کلچر، ادب، زبان، تمدن اور خیالات سب کو تبدیل کر دیں گے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمارے میدان ترقی میں بہت سے روڑے ہمارے سد راہ بنیں گے۔ ہندوستان کی یہی حالت ہے۔ ہندوستان اپنے لوگوں کی قدر نہیں کرتا اور اس طرح آئندہ نسل کے لئے درخت بو کر آبپاشی نہیں کرتا کہ جو وقت پر ایسا بار آور ہو کہ دنیا اس کے گیت گائے۔ یہاں ہمت افزائی نہیں ہوتی بلکہ ترقی کرنے والوں کے راستہ میں رکاوٹیں ڈالی جاتی ہیں۔ آپ کے یہاں کتنے (Literary Giants





سید اقتدارالرسول بار ایٹ لاء



سید صاحب علی بی اے رضوی (علیگ)



سید محمد علی (میئر)



سید ابن الحسن فکر ایم - اے

ادبی جنات، کتنے شاعر، کتنے ڈرامہ نویس اور کتنے انشا پرداز ایسے ہیں کہ جن کی آپ نے کماحقہٗ قدر کی ہو، کتنوں کو آپ نے اُبھارا، کتنوں کی آپ نے ستائش کی۔ کونسی ایسی بلند پایہ ہستیاں ہیں کہ جن کو اپنے ذوقِ سلیم سے چمکا کر دُنیا کی آنکھوں کو خیرہ کیا؟ ذرا ٹھنڈے دل سے سوچئے تو آپ دیکھیں گے کہ خود آپ کا دل آپ پر ملامت کر رہا ہے وہ قوم جو اپنے ادب و تمدن کے تحفظ و احتیاط کا خیال نہ کرے وہ کیسے اُمید کر سکتی ہے کہ اس کو تہذیب کی صفِ اوّل میں جگہ مل جائے۔ انگلینڈ کو دیکھئے۔ دوسری سربرآوردہ ہستیوں کو جانے دیجئے صرف شیکسپیئر (Shakespeare) کو لیجئے۔ وہ بھی ایک انسان تھا جو اسٹراٹ فورڈ آن ایون (Stratford-on-Avon) میں پیدا ہوا اور جس نے وہاں کے گرامر اسکول میں معمولی تعلیم حاصل کی . . . . ممکن تھا کہ اس کے خداداد کمالات اور جوہرِ قابل کی وہ صورت کہ جو ہمارے سامنے اس وقت موجود ہے پیدا نہ ہوتی اور وہ خاموش و غیر معلوم ہستی کی طرح دُنیا سے چلا جاتا۔ مگر وہ بوداحمض ملک و قوم کی قدر دانی کی بدولت کہ جو جذبہ ادب نوازی پر بڑی حد تک مبنی تھی ایسا ابھرا، ان چڑھا کہ آج اس کا نام آسمانِ شہرت پر آفتاب ہو کر چمک رہا ہے۔

ہر سال یومِ شیکسپیئر منایا جاتا ہے جسمیں تمام ممالک غیر کے انگریزی سے دلچسپی رکھنے والے حضرات شریک ہوتے ہیں اور شریک ہونا باعثِ فخر سمجھتے ہیں یہ جلسہ بڑی شان سے ہوتا ہے شیکسپیئر کے کلام اور ڈراموں سے انتخاب کر کے چھوٹی چھوٹی خوبصورت اور مفید کتابیں تقسیم کی جاتی ہیں تاکہ اس کی شہرت اور منزلت میں مزید توسیع ہو، اس کی زندگی سے ہر ایک سے روشناس کرایا جاتا ہے، اس کی خوبیاں مختلف نقطۂ نظر سے موثر پیرایہ میں بیان کی جاتی ہیں اس کا مکان اور اس کا اسکول کہ جہاں اس نے . . . . تھوڑی لاطینی اور قدرے یونانی زبان حاصل کی بھی آراستہ کیے جاتے ہیں لوگ اس کا اسکول ورود جگہ جہاں وہ بیٹھ کر پڑھتا تھا ایک مخصوص عقیدت کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ اس کے نام سے جگہ جگہ انجمنیں قائم کی جاتی ہیں جو دن رات ادبی خدمات میں مصروف رہتی ہیں یہ سب کچھ اس لیے ہوتا ہے محض اس لئے کہ انگلینڈ والوں میں بیداری ہے، قوتِ عمل ہے اور اپنی زبان و ادب کی محبت ان کے سینوں میں موجزن ہے وہ اس کی بقاء و ترقی کو اپنی زندگی کا ایک عنصرِ عظیم سمجھتے ہیں مگر ہم ان سے کوسوں دور ہیں۔

ہم میں وہ جذبہ نہیں، وہ احساس نہیں کہ لٹریچر کی بقاء و ترقی کو اپنی زندگی کا ایک عنصرِ عظیم سمجھتے۔ ہمارے سامنے کئی مقتدر ہستیاں پیدا ہوتی ہیں اور گزر جاتی ہیں۔ مگر سب طاقِ نسیاں کی زیبائش سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں۔ اسی طرح آغا حشر پیدا ہوئے اپنا راگ تمام ہندوستان کو سنایا۔ ڈراموں کے ذریعہ ملکی اصلاح کا خیال لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ اعلیٰ لٹریچر اور فنِ ڈرامہ میں ایک زرّیں باب کھول دیا۔ مگر آپ کی بے توجہی کا شکار ہوئے اور آخر کار تھیٹر کے مالکوں کے رحم و کرم پر مجبور زندگی گزارتے ہوئے چل بسے۔ افسوس کہ زندگی میں ہم نے ان کی قدر نہیں کی مگر دیکھنا یہ ہے کہ اب مرنے کے بعد ہندوستان کس طرح اور کہاں تک اُن کے نام کے گُن گاتا ہے۔

آغا حشر ایک فاضل ادیب، نیک خیال شاعر، باا ثر مقرر اور مایہ ناز تمثیل نگار تھے جس کا بدل ہندوستان مشکل سے پیش کر سکتا ہے آپ نے ہندوستان کی سیاحت کی اور اس کے مختلف صوبوں کے باشندگان کے عادات و اطوار رسم و رواج سے خوب واقفیت حاصل کی چنانچہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ ہندوستان کی ذہنیت اور تہذیب کو اچھی طرح سمجھتے تھے آپ

علاوہ فارسی اردو عربی کے ہندی، بنگالی، گجراتی اور مرہٹی صرف جانتے ہی نہ تھے بلکہ ان زبانوں میں ناقدانہ قابلیت بھی رکھتے تھے آپ کی فارسی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے خواہش کی ہے کہ کاش وہ حشر کی سی فارسی جانتے۔ آپ نے تفسیر قرآن، حدیث اور فقہ بھی پڑھی تھی، آپ کے بیشتر ڈرامے ملک و قوم کی اخلاقی اور معاشرتی اصلاح کے لئے ہیں آپ مذہبی تفرقہ بازی سے پاک تھے آپ نے ہندو مذہب کی تاریخ و تہذیب کے احیاء میں بھی چند ڈرامے سینا بنواس (सीता बनबास) مدھر مرلی (मधुर मुरली) وغیرہ لکھے ہیں جس کے فلسفیانہ خیالات اور مذہبی پختگی کو دیکھ کر بنارس اور الہ آباد کے پنڈتوں نے ان کا لوہا مانا ہے۔ آپ کے سوشل ڈراموں میں ترکی حور، غریب کی دُنیا، آنکھ کا نشہ، بھلا پیار اور سماج کا شکار زیادہ مشہور ہیں آپ نے تم تاریخی ڈرامے بھی قلمبند کئے ہیں جن میں یہودی کی لڑکی، شہیدِ ناز، اکبر اور عشق و فرض بہت مقبول ہیں عشق و فرض آخری ہندی ڈراموں میں بہترین شاہکار مانا جاتا ہے جو اپنی نوعیت اور اثر کے اعتبار سے اعلیٰ ترین معیار مس کرتا ہے۔

ڈرامہ نویسی ہندوستان میں کوئی نئی بات یا دورِ حاضرہ کا کرشمہ نہیں ہے اوراق تاریخ شاہد ہیں کہ زمانہ قدیم میں مہابھارت اور رامائن جیسی کتابوں نے دُنیا پر ثابت کر دیا کہ فنِ ڈرامہ میں ہندوستان دُنیا کے کسی مہذب ملک سے پیچھے نہیں رہا مثل انگلستان کے یہاں ڈرامہ بھی مذہب کی آغوش سے نکلے جس طرح Mirracle and Morality ploys مریکل اور مورلیٹی تماشے وہاں ظہور میں آتے ہیں۔

یہاں بھی ویدوں میں نٹ کا ذکر ہے اور ناٹکیں مذہب یا اخلاق کے زیر دامن پرورش پاتی ہیں۔ ناٹکیں امراء میں بڑی مرغوب تھیں ہر خوشی کے موقع پر ناٹک کرایا ہونا بڑا ضروری تھا چنانچہ ابھی تک مہابھارت کے بہت سے قصے اور رامائن بشکل رام لیلا نانہ بہ نانہ جماعتیں جس کو لیلا منڈلی کہتے ہیں دکھانی رہتی ہیں دورِ سنسکرت میں راجہ بکرماجیت کے درباری شاعر کالی داس نے شکنتلا لکھ کر اعلیٰ لٹریچر اور بہترین کیریکٹر کا نمونہ پیش کیا اس کے بعد (नल दमयन्ती) نل دمنتی کی مثنوی لکھی گئی جس کا فارسی ترجمہ فیضی نے کیا پنچ تنترا (पंचतन्त्र) بھی اُسی مبارک دور کی ایک قصہ در قصہ حکایت ہے اس کے بعد فارسی کا دور شروع ہوا جس میں انوارِ سہیلی اور عیارِ دانش نے ہماری محفل کو گرمایا اُردو کی پیدائش کے بعد سب سے پہلا ڈرامہ اندر سبھا ہمارے سامنے آیا اس کو حضرت امانت نے جو ناسخ کے شاگرد تھے منظوم حیثیت سے واجد علی شاہ کے دورِ حکومت میں لکھا تھا واجد علی شاہ کو ناٹک اور ناچ گانوں کا بہت شوق تھا لیکن جیسا کہ مسعود حسن صاحب نے تحقیق کیا ہے انہوں نے خود اس میں کبھی حصہ نہیں لیا طبیعت بڑی نفاست پسند تھی حسن و عشق دیکھ کر آپ باغ باغ ہوتے تھے محبت کے لطیف جذبہ کو آپ قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے یہی وجہ ہے کہ آپ رہس (रास) میں کا بڑا اثر ہوا جب کبھی آپ نے رہس منعقد کیا یا لمبا کا مار حصہ ہو یہ نہ کو دیا بھانڈ اور نقال بھی اُسی وقت سے چلے آرہے ہیں۔ ان حصوں میں بہاں تماشا [illegible] پتی رام لیلا اور نقصے قدیم رنگ کی نقلیں [illegible] ایک موثر [illegible] جاتے تھے [illegible] ہوتے اور بھانڈوں کے یہ [illegible] جواب بھی [illegible] ان کے بعض حصوں [illegible] جاتے ہیں [illegible] نلوں کا زمانہ بھی اسی قبیل سے ہے جو محض ایک خاندان [illegible] کا کارواں [illegible] تا ہے [illegible] والے [illegible] لوگوں [illegible] ان میں [illegible] اداکاروں کا کام [illegible] ہوا [illegible] دل بدل [illegible] جو اتنے چار پائیوں

۲۰۷

ت بنا یا جاتا ہے اماری جاتی ہیں۔ اُتارنے کا کام اکثر باہر بیٹھنے والے کی بیوی کرتی ہے جو پتلیوں کو حرکت دیتی رہتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ کچھ موسیقیت کا اثر بھی اپنے نرالے انداز سے ڈالتی رہتی ہے۔ ان تماشوں میں ڈرامہ کی زبان گیت اور پتلیوں کی حرکات کا خوشگوار میل رکھنا ہوتا ہے جس کو بہت سے پست طبقوں کے لوگ دیکھ کر بہت خوش ہوتے ہیں۔

نام اسٹیج ایک پردہ کا اسٹیج ہوتا ہے جس میں کوشش یہ کی جاتی ہے کہ پتلیاں تماشبین کے مذاق کے مطابق خاص خوبی کے ساتھ داخل ہوں۔ ان پتلی والوں کے پاس زیادہ تر تاریخی ڈرامے موجود ہیں اور ان کا پیشہ کسی حد تک آبائی بن گیا ہے اگر دیکھا جائے تو بھی کٹ پتلیوں کے اسٹیج اور نوٹنکی کے تخت کو جن پر اندر سبھا، ہیر رانجھا وغیرہ کے ڈرامے آج بھی نوبت کی کھڑک کے ساتھ دیکھے جاتے ہیں ہمارے قدیم اسٹیج کی ابتدائی ساخت اور حالت کے نمونے ہیں۔

اسٹیج جس کو اُردو کا پہلا اسٹیج کہا جاتا ہے سیٹھ پیسٹن جی فرام جی کی کمپنی کا تھا۔ آپ اُردو کے شاعر مانے جاتے تھے آپ کا تخلص ... تھا اور نواب علی نفیس سے اصلاح لیتے تھے۔ آپ کی دلچسپیاں بھی اسٹیج سے وابستہ تھیں جو ہمیشہ یادگار رہیں گی۔ انگریزی دور شروع ہونے پر انگریزی تہذیب اور اسٹیج کا ... یہاں کی ناٹکوں پر پڑا یہ وہ وقت تھا کہ جب ہندوستان کے ڈرامہ کی وہ عظمت و شان جو زمانۂ قدیم سے چلی آ رہی تھی ملک کی سیاسی تبدیلیوں میں چھپ گئی تھی۔ ادھر بے اطمینانی اور ادبی پستی اور ادھر بیرونی اثرات دونوں میں کشاکش تھی عنقریب تھا کہ اردو ڈرامہ ایسے نقصِ ... اتفاقی میں پڑ جاتا یا اتنا ذلیل ہو جاتا کہ لوگ ہمیشہ کے لئے اس کو اپنے ذہن سے بھلا دیتے۔ ایسے وقت میں زبان کی خوش بختی تھی کہ احسن لکھنوی اور بیتاب دہلوی جیسے ڈرامہ نویس پیدا ہو گئے۔ انہوں نے ... کو سنبھالا لیکن اگر ڈرامہ میں دوبارہ توانائی اور تازگی کسی نے ڈالی ہے تو وہ آغا حشر تھے انہوں نے میدان میں آکر وہ عجب خیز انقلاب پیدا کیا کہ ہندوستان ہی نہیں بلکہ ممالکِ غیر بھی ان کے فنِ ڈرامہ کے کمالات اور ادبی سحر کاریوں کو دیکھ کر تحسین کرتے ہیں۔

آپ کا پورا نام آغا محمد شاہ ... تھا۔ آپ کا آبائی وطن کاشمیر ہے لیکن آپ امرتسر میں پیدا ہوئے۔ آپ کی ڈرامہ نویسی کی ابتدا بمبئی میں ہوئی یہاں آکر آپ نے محمد علی ناخدا نامی کی ... تھیٹریکل کمپنی میں ملازمت کی جہاں آپ کو سہراب جی اور عباس علی جیسے نامور ایکٹروں کی صحبت ملی۔ یہاں آپ نے ... کے متعدد ڈراموں کو اُردو کا جامہ پہنایا چنانچہ ... Romeo and Juliet بزمِ فانی (Winters Tale) ... آپ ... کچھ عرصہ کے بعد اس کمپنی کو چھوڑ کر آپ نے خود ذاتی کمپنی کھولی جس کا نام Indian Shakespeare Theatrical Co: انڈین شیکسپیر تھیٹریکل کمپنی رکھا لیکن آپ کو اس میں بڑا نقصان ہوا اور آخرکار وہ سیالکوٹ میں ... Madan & Co ... اس کے بعد آپ کلکتہ ... اور ... (Co) ... میڈن کے یہاں ... ہو گئے اس زمانہ میں آپ نے چند بہترین شاہکار لکھے جن میں بہت سے ہندی ڈرامے تھے کیونکہ ارباب کمپنی ہندی داں تھے، ان ڈراموں نے ان کی شہرت ... چار چاند لگا دئے۔ ۱۹۲۷ء میں آپ آگرہ بنارس وغیرہ کی سیاحت کو نکلے اس کے بعد مہاراجہ ... نے آپ کو اپنے یہاں آنے کی دعوت دی۔ آپ گئے اور ... کی زمانہ میں آپ نے وہاں اپنا ... کمپنی قائم کی جو چند سال بعد نا کامیاب ہوئی وہاں سے آپ پھر کلکتہ آئے اور ... اسٹیج کے لئے ... لیکن فضا بالکل بدلی ہوئی پائی لوگوں کا شوق تھیٹر کی جانب سے ہٹ چلا تھا (Talkies) بولتی تصاویر کا بازار گرم تھا۔ ہر شخص

ان کا مداح اور مشتاق تھا۔ آپ نے جب یہ رنگ دیکھا تو ہمت نہ ہاری۔ نئی چیز تھی، مگر خداداد ذکاوت اور صلاحیت نے قدم آگے بڑھا دیا۔ آپ نے بہت جلد فلمی ڈراموں کے عناصر خصوصی پر عبور حاصل کر لیا اور قلم اٹھا کر "عورت کا پیار" لکھ ڈالا۔ جس کے با اثر مکالمے ہیروئن کا کامل کیرکٹر اور دل ہلا دینے والے دردناک مناظر نے عوام سے خراج تحسین حاصل کیا۔

اس کے بعد آپ نے اور بہت سے ڈرامہ پردۂ فلم کے لئے موزوں کئے جنہوں نے دنیائے فلم کو اعلیٰ پایہ کی تصاویر کا جن میں زبان ادب اور مذاق کا پورا لحاظ رکھا ہو نمونہ پیش کیا۔ ان میں "چنڈی داس" "یہودی کی لڑکی" بیحد مقبول ہوئے ہیں۔ یہودی کی لڑکی میں باپ کے صحیح جذبات ایمان کی پختگی، ملازم کی وفاداری۔ اہل روم کی شوکت اور اُن کا ظلم نہایت مؤثر پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے آخر گانا۔

اپنے مولا کی میں جوگن بنوں گی ....

دنیاوی شورشوں سے تنگ آنیوالی بے قرار روحوں کو ایک پیغام سکون و اطمینان دے کر حقیقی راستہ کی طرف دعوت دیتا ہے۔

آپ نے لاہور میں ایک فلم کمپنی "حشر پکچرس" کے نام سے کھولی اور اپنے ڈرامہ بھیشم پرتگیا (भीष्म प्रतिज्ञा) کو فلمی لباس پہنانے میں مصروف ہو گئے۔ مگر چونکہ آپ نے یک لخت شراب پینا چھوڑ دیا تھا، آپ کی صحت میں فرق آگیا ....

....

....

آپ حکیم فقیر محمد چشتی کے زیر علاج تھے آپ سے کہا گیا کہ اس آتش سیال کو تھوڑا تھوڑا کر کے چھوڑو لیکن خدا کو یہی منظور تھا۔ آپ کا ارادہ نہیں بدلا اور آخرکار ۲۸ اپریل ۱۹۳۵ء کو بوقت ساڑھے چھ بجے شام آپ اس دنیائے فانی سے رخصت ہو کر عالم بقا کو سدھارے

اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ ۝

آغا صاحب شیکسپیر ہند اور مشرقی ابسن (Ibsen) کے نام سے مشہور تھے لیکن زیادہ تر پبلک ان کو پہلے نام سے جانتی ہے، یہ نام آپ کے لئے موزوں تھا مگر چند اعتبار سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ شیکسپیر سے بھی سبقت لے گئے تھے۔ شیکسپیر ایسے دور اور ایسے ملک میں پیدا ہوا تھا کہ جہاں کی قوم اور زبان ایک تھی جہاں علوم و فنون کافی ترقی پر تھے جہاں اسکو ملکہ ایلزبتھ (Queen Elizabeth) اور ارل آف ساؤتھمپٹن (Earl of Southampton) کی سرپرستی نصیب ہوئی جہاں (University Wits) یونیورسٹی کے اعلیٰ التعلیم یافتہ ڈرامہ نویس موجود تھے جن کی نقادانہ روش سے شیکسپیر پر بڑا اصلاحی اثر پڑا۔ جہاں کی قوم ڈرامہ کو حقارت کی نگاہ سے نہیں دیکھتی تھی جہاں Chaucer چوسر اور (Spenser) کے ادبی کارناموں نے اس کو ذخیرہ مواد پیش کیا۔ برخلاف اس کے آغا حشر ایسے نازک دور میں آئے اور وہ بھی ہندوستان جیسے ملک میں کہ جہاں مختلف زبانیں رکھنے والی مختلف النوع قومیں آباد ہیں کہ جن کا فطری مطالعہ نہایت مشکل ہے جہاں ان کی مربی صرف مالکان کمپنی یا نیچے طبقہ کے لوگوں کے سوا کوئی نہ ہوئے جہاں ڈراموں کو مخرب اخلاق اور ڈرامہ نگاری یا ایکٹری کو ذلیل سمجھا جاتا تھا۔ جہاں عام مذاق کو اس کے موجودہ معیار میں تبدیلی پیدا کر کے کسی بلندی پر لیجانا گویا جوئے شیر لانا تھا۔ جہاں قدیم افسانوں اور اساطیر نے ان کے تخیلات کی ضرورت کو پورا نہیں کیا لیکن باوجود ان تمام غیر موافق اسباب کے انہوں نے اپنی طبع کرشمہ زا کے وہ کارنامے دنیا کے سامنے رکھدئے کہ جو ان کو

ایک (Genius) ذہین فطری ڈرامہ نگار۔ اور ادب ہند کے ممتاز ترین علم بردار ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں۔ علاوہ ازیں اگر دور حاضرہ کے اثرات اور موجودہ تہذیب کو دیکھتے ہوئے آغا صاحب کا مقابلہ (Bernard Shaw) برنرڈ شا اور گالزوردی (Galsworthy) سے کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کی جذبات نگاری علو تخیل شگفتہ بیانی جدت فقرے اعلیٰ ادب پرزور مقالے شوکت الفاظ واقعہ شناسی اور فطرت بینی کسی طرح "شا" کی روزمرہ بیان سب و لہجہ کا خیال طبقہ وسطی کی پستی اور بدبختی کا روشنا موثر طرز ادا اور گالزوردی کی مسخر آمیز تجربہ سوسائٹی کی تصویریں زبان کی شستگی۔ بیان کا اختصار و جامعیت اور قدرتی مکالموں سے کسی طرح کم پایہ نہیں ہیں۔

آپ کے ڈراما (Climax) کلائمکس سے معمور ہیں لوگ سمجھتے ہیں کہ اب انتہا ہو گئی آپ اس سے کہیں زیادہ آگے بڑھ جاتے ہیں آپ کی تخیت بڑی عمیق اور دلکش ہوتی ہے آپ کے جذبات خالص و ذاتی کے ترکیب زد نہایت پختہ اور نمایاں ہوتے ہیں۔ آپ کا غم جگر دوز آپ کی مظلومیت اور خستہ حالی [illegible] قدرت آمیز اور محتاج رحم ہوتی ہے کہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ لوگ باوجود زار و قطار رونے لگتے ہیں آپ کی زبان اور خیالات کی خوبیاں اس وقت بہت معلوم ہوتی ہیں کہ جب آپ دو متضاد کرکٹر کا تصادم پیش کرتے ہیں خوبصورت بلا اور اسیر حرص [illegible] اسی کے مناظر موجود ہیں آپ کا مذہبی فلسفہ ایثار اور بھگتی بڑے عام فہم [illegible] میں بھگتی کی متعدد مثالیں موجود ہیں آپ نے کس خوبی سے بلو منگل اور چنتامنی کو جو گمراہ تھے [illegible] رنگ دیا جیسا طوالف نے مرحب بھگتی کا رنگ چڑھتا ہے تو کلیجہ ماتھے پر سب صحیح جذبات کا اظہار [illegible] ہے۔

سیس پاؤں ہوا عامہ پیام ہوما [illegible] جب انہیں کا دیا ہوا جو کچھ بھی ہے [illegible]
ایک کلیجہ ہی نہیں انگ انگ للچائے دھن ہے وہ بھاگ جو یہ ہو کام آئے

آغا حشر جہاں حیثیت ڈرامہ نویس [illegible] رکھتے ہیں وہاں فن شاعری میں بھی ایک مخصوص عظمت کے مالک ہیں آپ الشعراء یتبعھم الغاوون میں تو نہیں ہیں بلکہ ان میں سے ہیں جن کے متعلق ان اللہ تعالیٰ خزائن تحت العرش مفاتیحھا السنۃ الشعراء [illegible] آپ کا کلام مجموعی طور پر شائع نہیں ہوا ہے۔ اس سے وہ لی مخلصانہ [illegible] نہیں ہوسکتی [illegible] کہا جاسکتا ہے کہ آپ کا رنگ عمر خیام کے رنگ سے ملتا جلتا ہے۔

آپ کے کلام کا [illegible] حصہ خمریات کا ہے [illegible] آپ کا اعلیٰ معیار [illegible] ہونا [illegible] (Epicurean Theory) ای کیوری نظریے [illegible] اور کبھی کبھی [illegible] موجودہ رنگ [illegible] نہیں کیا [illegible] ہیں۔

ہولی کو بھی جام مے جنت ہوئی ہے خس خانہ و میخانہ و پیمانہ جب [illegible] ہو

آپ کے ماہ [illegible] کی اکثر [illegible] میں دیکھا ہے فطرت کا ہر منظر آپ کی نگاہ میں ایک مخصوص معنی رکھتا ہے۔ شب ماہ میں آپ تاروں کی چمک کو دیکھتے ہیں [illegible] خیال آپ کو مسنون ہیں [illegible] تمام منظر جھلکتا ہوا ساغر نظر آتا ہے [illegible] سے پوچھتے ہیں

یہ تارے ہیں کہ موج نور کے جھلکے ہوئے قطرے کہاں سے اے قمر تو نے یہ جام آتشیں پایا

حسن و محبت کی نازک اور دلفریب الجھنیں آپ پر کافی اثر رکھتی ہیں محبت کی تحریک کو آپ نے بڑے خوبصورت پیرایہ میں بیان کیا ہے کہتے ہیں۔

محبت حسنہ [illegible] حسن کے نظاروں کی [illegible] ہے

اسی طرح آپ نے نیاز عشق کی حقیقت یعنی محبت کی گہرائیوں میں ڈوب کر اپنے کو بھی محبوب سے

دنیا رد شکار [illegible] کس خوبی سے بتایا ہے فرماتے ہیں۔

نیاز عشق نے گل کے عوض سجدہ بکھیرے ہیں جہاں تیرا قدم دیکھا وہیں نقش جبیں پایا

شراب کا شوق اور مخموریت کا سودا آپ پر غالب تھا مگر صرف غالب ہی کی طرح

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے

خیام کا یہ خیال۔

ابا دخرابات زمے خوردن ماست خون دو ہزار توبہ در گردن ماست

گویا آپ کے اس جذبہ کے مرادف ہے کہ جو اس شعر میں موجود ہے

حشر یہ کالی گھٹائیں اور توبہ کا خیال ہم ہیں بیٹھے رہو میں سوئے میخانہ چلا

آپ (Optimist) متفاؤل ہیں [illegible] کے ندرت [illegible] کی طرح نہیں ہے [illegible] ادباں کی طرح

سوتی ہے [illegible] ساز دل [illegible] تار میرا اے ناسکون تو زندگی بھی فدا ہو
مرتا ہوں [illegible] یہ آرزو ہے میری دامن ترا کو [illegible] ہوتا ہو

یا (W.B. Yeats) ڈبلو بی ئیٹس کے مانند

I will arise and go now, and go to Innisfree
And a small cabin build there of clay and wattles made

دنیا سے کنارہ [illegible] ہونا نہیں چاہتے ہیں بلکہ اس کے برعکس [illegible] دل کو مرغوب آپ ایسا [illegible] نا پاتے تھے [illegible] ہیں۔

جا بس کے وہاں خوش دل دیوانہ جہاں ہو گلشن کے میں آپ [illegible] خانہ جہاں ہو
[illegible] محبوب کی [illegible] طبع تبسم کے ساتھ [illegible]
[illegible] ہو [illegible] جا [illegible] وہاں بلبل دیوانہ جہاں ہو

انگلینڈ کے موجودہ مشہور شاعر (Masefield) میسفیلڈ نے بھی [illegible]
[illegible] دلکش [illegible]

But the loveliest things of beauty God ever has showed to me,
Are her voice and her hair, and eyes, and the dear red curve of her lips.

اس [illegible] روانی اور جدت [illegible] آغا کا [illegible] غزلیات کے علاوہ آپ کی نظموں [illegible] زیادہ [illegible] [illegible] حوصلہ نظموں [illegible] [illegible] تعلیم یافتہ طبقہ میں بڑی دلچسپی [illegible] جاتی ہے [illegible] [illegible] مسلمانوں کو [illegible] کا سبق [illegible] فرماتے ہیں

[illegible]
[illegible]

اس نظم کا خاتمہ ایک [illegible] اور دل ہلا دینے والی اپیل سے کیا گیا ہے۔

حق بتوں کی اگر کی تو نے دلجوئی نہیں　　طعنہ دیں گے بت کہ مسلم کا خدا کوئی نہیں

موجزن ہے آپ کے اسلامی جوش اور اعتقاداتِ راسخ کا پتہ دیتی ہے۔ گو ظاہرہ آپ کے خیالات میں بڑی آزادی نظر آتی تھی مگر وہ محض مادی یا دنیاوی تحریکات تک محدود تھی۔ مذہبی معتقدات پر آپ نے کبھی اپنی آزادروی سے متاثر نہیں ہونے دیا۔ ایک جگہ فرماتے ہیں۔

میں غلام اُس کا ہوں جس آقا کا نام نامی ہے بلال　　دفتر کونین کا سر رشتہ آغاز ہے

کس قدر نظارہ پرور جلوۂ معراج تھا　　آج تک شوقِ نقاب چشمِ انجم باز ہے

پیغمبر اسلام کے مرتبہ اور معراج کی شان کو ایک خاص ہیئت میں پیش کیا ہے اسی طرح اپنے اسلامی جذبہ اور قوت عمل کا اظہار کرتے ہوئے اسی نظم میں دعا کی ہے۔

اے خدا دے زورِ دستِ خالد و حیدر ہمیں　　پھر اٹھانا ہے صفِ کفر و درِ خیبر ہمیں

الغرض آغا صاحب کی ادبی خوبیاں بہت ہیں اور اُن کا اس قلیل مضمون میں بیان کرنا گویا دریا کو کوزہ میں بند کرنا ہے۔ اس لئے مختصر مگر یہ کہتے ہوئے مضمون کو ختم کرتا ہوں کہ آغا صاحب نے ہندوستانی تاریخ ڈرامہ کو دوبارہ زندگی بخشی۔ شکسپیر جیسی ہستی کو اُردو داں طبقہ میں روشناس کیا اور کمال فن یہ ہے کہ ڈرامۂ ہند کے نظریہ کو ہی بدل کر آپ اس کو معیاری پستی سے نکال کر ایسی ادبی بلندی پر لے گئے کہ جہاں ہندوستانی فخر کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اِن کا ڈرامہ دُنیا کے کسی ملک و قوم کے ڈرامہ سے پیچھے نہیں ہے۔

حکایت بود بے پایاں بہ خاموشی ادا کردم

ٹیگور کا ایک تازہ گیت

اب اجڑے ہوئے بازار کو کیوں جلد جلد جاتے ہو!

رات کی تاریکی بڑھ رہی ہے شام کا سندور کا پھیکا پڑ رہا ہے۔ گاؤں کے آسمان پر نیا چاند چمک رہا ہے اور لوگ اپنی اپنی ٹوکریاں لیکر اپنے مکانوں کو واپس آ گئے ہیں۔ اور بیچارہ ایک تنہا مسافر دریا کے کنارے کھڑا گھاٹ والے کو بلند آواز میں پکار رہا ہے نیند درختوں کی شاخوں سے ہو کر گاؤں کی طرف جا رہی ہے اور چڑیاں اپنے آشیانوں میں خاموشی کے ساتھ آرام کر رہی ہیں۔ تالاب کے کنارے جھاڑیوں میں جھینگر بول رہا ہے۔ ہوا بھی بانس کی پتیوں میں الجھی ہوئی ہے۔ پھر تمہارے تھکے ہوئے اعضا بھی تمام محنت سے تھک کر چراغ کے قریب پڑی ہوئی چٹائی پر کچھ آرام کرنا چاہتے ہیں۔ ایسے وقت میں

تم کیوں اجڑے ہوئے بازار کی طرف جلد جلد جاتے ہو!؟

تاثرات

دیکھو تو! دریا کا پانی ساکن رہ کر گدلا اور میلا ہو گیا ہے اور سُنا ہے ایسا ہی ہو جاتا ہے۔ اس لئے تم آبِ محبت کو رواں ہی رہنے دو۔ یوں کہ وہ کبھی ایک کنارے کو چھوئے اور کبھی دوسرے کو ــــــ ورنہ تمہاری کشتیٔ حیات خراب و خستہ، تباہ و برباد ہو جائے گی۔ اور تمہاری روح ایک گھبرائے ہوئے ملاح کی طرح مایوسی و ناامیدی کے گرداب میں ہچکولے کھانے لگ جائے گی! سب سے محبت کر: تمام بنی نوع انسان سے۔ اپنی محبت کی حدود کو اتنا تنگ نہ کرو کہ تمہارا وسیع قلب اُس میں پھنس کر رہ جائے، اس کو اتنی وسعت دو کہ تمام کائنات پر محبت کا رنگ چھا جائے اور اخوت باہمی کے رنگ سے فضائے ہند رنگین بن جائے۔

تمہاری اس تابندگی نصیب پر رشک کرتا ہوں کہ دن رات میں کئی مرتبہ اُن کا قربِ جمیل حاصل ہو جاتا ہے جن کی صورت کی ایک ہلکی سی جھلک دیکھنے کیلئے میری آنکھیں ترسا کرتی تھیں دن میں کھلی رہتی تھیں اور رات کو کچھ بند ہو جاتی ہیں کہ وہ حسین و رنگین خواب پھر دیکھ سکیں جب نیازِ حُسن سے محبت کو پسینہ آ رہا تھا لیکن ــــ آہ انہوں نے تو مجھے اتنا بُھلا دیا ہے کہ اب خواب میں بھی نظر نہیں آتے!!!

خواب میں بھی نظر نہیں آتے　　مجھے اتنا بُھلا دیا تم نے "ساغر"

دیوانہ
(مصطفیٰ آبادی)

تاریخ علم ہیئت و تنجیم پر ایک نظر

(گذشتہ سے پیوستہ)

خط استوا پر ہمیشہ رات اور دن برابر ہوتے ہیں مندرجۂ ذیل جدول سے مختلف عرض البلد پر گھنٹوں اور مہینوں کا اختلاف بآسانی معلوم کیا جا سکتا ہے۔

درجات		
ڈگری	منٹ	گھنٹے
۰	۰ صفر	۱۲
۱۶	۴۴	۱۳
۳۰	۴۸	۱۴
۴۱	۲۴	۱۵
۴۹	۲	۱۶
۵۴	۳۱	۱۷
۵۹	۲۰	۱۸
۶۱	۱۹	۱۹
۶۳	۲۳	۲۰
۶۴	۵۰	۲۱
۶۵	۴۸	۲۲
۶۶	۱۱	۲۳
۶۶	۳۲	۲۴
۶۷	۲۳	ایک ماہ
۶۹	۱۵	۲ ماہ
۷۳	۴۰	۳ ماہ
۷۸	۱۱	۴ ماہ
۸۴	۵	۵ ماہ
۹۰	۰	۶ ماہ

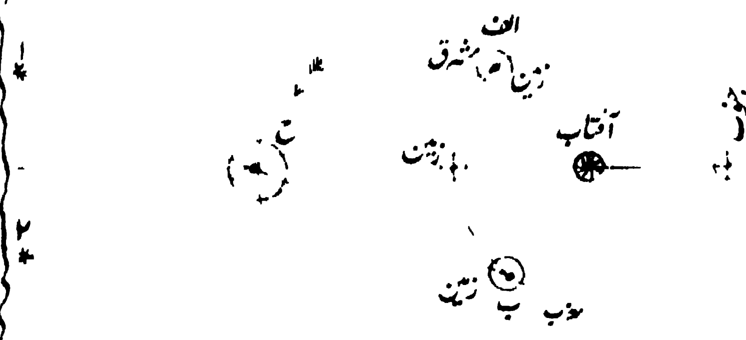
جب آفتاب خط استوا یعنی برج حمل سے مسافت شروع کرتا ہے تو اس کا رُخ جانب شمال ہوتا ہے اور برج سرطان تک شمال ہی کی جانب سرکتا ہے یہاں تک کہ آفتاب اور خط استوا کا $23\frac{1}{2}$ درجہ شمالاً و جنوباً تفاوت ہو جاتا ہے پھر آفتاب سرطان سے جنوب کی جانب رُخ کرتا ہے جس وقت میزان میں آتا ہے تو پھر خط استوا پر آجاتا ہے جس طرح برج سرطان میں آفتاب کے چلے جانے سے خط استوا سے شمالی دنیا میں سخت گرمی پڑنے لگتی ہے اسی طرح برج جدی میں آنے سے انتہائی سردی پڑنے لگتی ہے مگر وہ ممالک جو خط استوا سے جنوب کی جانب واقع ہیں جیسے افریقہ آسٹریلیا وغیرہ ان میں موسم اس کے برعکس ہوتے ہیں یعنی جب جدی میں آفتاب آتا ہے تو خط استوا سے جنوبی آبادی پر گرمی کا موسم ہوتا ہے اور جب سرطان میں جاتا ہے تو سرد موسم ہوتا ہے جس طرح خط استوا سے شمال کی جانب $23\frac{1}{2}$ درجہ آفتاب کے ہٹ جانے سے برج سرطان کی حد قرار پاتی ہے اسی طرح خط استوا سے جنوب کی جانب $23\frac{1}{2}$ درجہ آفتاب کے ہٹ جانے سے برج جدی کی حد قرار پاتی ہے۔

آفتاب کے کسی برج میں ہونے سے یہ مطلب ہے کہ صبح طلوع کے وقت دائرہ افق پر سب سے پہلے وہی برج طلوع ہوگا جس میں آفتاب چل رہا ہے یعنی وہ برج آفتاب کے سامنے آجائیگا اور اس کے بعد دیگرے ۱۱ اور دوسرے برج افق سے طلوع ہوتے ہیں کئی دن دوسری صبح کو وہی برج طلوع ہوگا جس میں آفتاب چل رہا ہے ایک ماہ تک صبح وہی برج طلوع ہوتا رہے گا جس میں آفتاب چل رہا ہے۔

عطارد و زہرہ آفتاب کے ساتھ طلوع و غروب ہوتے ہیں اسی وجہ سے رات کو نہیں بلکہ دن میں قوی دوربینوں سے دیکھے جاتے ہیں یہ دو سیارگان مقابلہ دنیا کو اب کے آفتاب کے نزدیک رہتے ہیں اور کبھی صبح و شام کو بھی نظر آتے ہیں زہرہ کا آفتاب سے ۴۸ درجے سے زائد کبھی فصل نہیں ہوتا اور عطارد ۲۹ درجے سے زائد فاصلہ پر نہیں ہوتا زہرہ و عطارد باہم ۷۶ درجے سے زائد کبھی نہیں دیکھے گئے۔

سیارگان کی چال منجمین کے نزدیک دو قسم کی مانی گئی ہے ایک استقامت دوسری رجعت حالت استقامت میں ایک سیارہ ہمیشہ سیدھی رفتار پر چلتا ہے اور رجعت میں واپس اسی برج میں جاتا ہوا دکھائی دیتا ہے جس برج سے وہ نکلا ہے یہ بات نقشۂ ذیل کے ملاحظہ سے بآسانی سمجھ میں آجائے گی۔

نقشہ ۲



جب دو سیارے ایک ہی خط پر واقع ہوں یعنی الزخط کھینچا جائے تو ان سیاروں کے مرکز میں ہو کر گزرے دیکھو نقشہ نمبر ۲ شمس زمین اور سیارہ "ت" ایک ہی خط میں جانب شمال ہیں

شاعر و آفتاب

شاعر:-

اے حریمِ نور کے پیغامبر اے آفتاب! — رُوح پیرا ہے ہر اک شے میں تری موجِ شباب
ہر شعاعِ تیز ہے تیری پیامِ انقلاب — تیرے چہرہ سے ہویدا دیوتاؤں کا شباب
دوش پر ذرّوں کے ہے انوار کی زرّیں کتاب — ثبت ہے آفاق کے صفحات پر مہرِ شباب
اللہ اللہ یہ شبابِ صبحِ آغاز و طلوع — دمبدم انگڑائیاں لیتی ہے رُوحِ انقلاب
پردہ دارِ حق و باطل تھی سیاہی شام کی — تو نے اُلٹی چہرۂ ہستی سے ہر رنگیں نقاب
منعقد ہے آسماں پر محفلِ رامشگراں — ہر کرن تیری مغنّی، ہر کرن تیری رباب
جگمگا اُٹھے ترے انوار سے کاخِ بلند — کچھ شعاعیں ہم غریبوں پر بھی اے زرّیں نقاب
کچھ مجھے بھی تو بتا اے ہمدمِ رُوحِ حیات — مسکرا کر زندگی نے کیا دیا تجھ کو جواب

کیا جہاں میں پھر زمانِ انقلاب آنے کو ہے؟
کیا چمن کے ذرّہ ذرّہ پر شباب آنے کو ہے؟

آفتاب:-

تو زا ساحل بھی ہے، راہی بھی ہے، منزل بھی ہے — حق بھی روشن ہے مرے انوار سے باطل بھی ہے
اے کہ ہے تجھ پر بھی ہر رمزِ حقیقت آئینہ — تیرے ایوانِ تفکّر میں ہے فطرت آئینہ
علم و حکمت سر بزانو ہیں ترے دربار میں — اور سیاست سر بسجدہ ہے تری سرکار میں
فرض ہے اس وقت زادِ رہ کی تیاری سُنا — اُٹھ کے دُنیا کو مرا پیغامِ بیداری سُنا
جاگ اور اُٹھ کر جگا دے خفتگانِ عیش کو — ختم کر دے خواب آگیں داستانِ عیش کو
ہر صدا ہستی کی ہے سازِ صدائے انقلاب — ہر نفس دراصل ہے بانگِ درائے انقلاب
صبحدم کرنیں سُنہری ہیں مگر کیونکر کہوں! — گل بنیں گی شام کی آغوش میں یا موجِ خوں
چھیڑ وہ سازِ حیات نوہسیانِ انجمن — جھوم جائے جس سے خود رُوحِ روانِ انجمن
آ کہ چھیڑیں مل کے ہم وہ نغمۂ سازِ شباب — جس کو سُن کر رقص میں آجائے رُوحِ انقلاب

حق کو حق، باطل کو باطل کر دکھائیں دہر میں
اُٹھ کہ کیف و نور کا طوفاں اُٹھائیں دہر میں

ساغر نظامی

(صفحہ ۱۱۲ سے آگے کا مضمون ملاحظہ ہو)

اس حالت کو اصطلاح نجوم میں "اجتماع" کہیں گے۔ جب زمین مغربی نقطہ "ب" پر پہونچے گی تو اس وقت زمین سیارہ "ح" اور ۱ ایک ہی خط میں ہوں گے اور جب زمین اپنے دائرہ پر جانب جنوب گردش کرتی ہوئی آگے بڑھے گی تو سیارہ ۱ سیارہ ۲ کی جانب حرکت کرتا ہوا نظر آئے گا۔ جب نقطہ "الف" جانب شرق حرکت کرتا ہوا پہونچیگا تو یہی سیارہ ۲ سے ۱ کی طرف واپس جاتا دکھائی دیگا۔ چونکہ زمین سریع ہونے کے باعث آگے بڑھ جائے گی اور سیارہ ۲ بوجہ بطی السیر ہونیکے زمین سے پیچھے چھوٹ جایگا۔ یہ حالت رجعت کی ہے۔ متقدمین کا یہ خیال کہ سیدھی رفتار سے الٹی یعنی پیچھے کی جانب حرکت کرنے لگتا ہے غلط ہے۔

آفتاب زمین کے گرد گردش کرتا ہے یا زمین آفتاب کے گرد گردش کرتی ہے یہ بحث کا اہم مسئلہ ہے۔ متقدمین کا یہ خیال تھا کہ آفتاب گردش کرتا ہوا زمین کے گرد اپنا دورہ تمام کرتا ہے۔ جدید تحقیقات و دلائل سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ زمین آفتاب کے گرد گردش کرتی ہے۔ زمین کی حرکت کو ثابت کرنے کے لئے فرانس کے مشہور فلسفی M Leon Foucult ایم لیون فوکلٹ نے ایک وزنی چیز کو آہنی تار میں آویزاں کر کے تار کے ایک سرے کو ایک چھت میں لٹکا دیا جس کی شکل گھڑی کے پنڈولم کی سی تھی۔ یہ آلہ آگے اور پیچھے مثل پنڈولم کے حرکت کرتا تھا اور ایک سوئی اس وزنی آلہ میں نصب کر دی گئی تھی جب یہ حرکت کرتا تھا تو یہ سوئی نیچے بچھی ہوئی بالو ریت پر نشان ڈالتی جاتی تھی اس سوئی نے جو مختلف نشانات بنائے وہ عمارت کی سطح خط سے مختلف پائے گئے جس سے ثابت ہوا کہ عمارت بلکہ صحیح یہ کہ زمین متحرک ہے۔ یہ آلہ قطب شمالی و جنوبی دونوں سمت حرکت کیا کرتا تھا اور اس حرکت سے ۲۴ گھنٹے میں وہ اپنا دورہ ختم کر لیتا تھا۔ اگر زمین پر گھنٹے کے نشانات باقاعدہ بنائے جاتے تو یہ مثل گھڑی کے کام کرتا۔ چونکہ زمین قطب شمالی کی طرف مغرب سے مشرق کی جانب گردش کرتی ہے اور نیچے گھڑی کا ڈائل (پلیٹ) بنا ہوا زمین کی حرکت کے ساتھ ساتھ وہ بھی پنڈولم کے نیچے مغرب سے مشرق کی جانب حرکت کرے گا۔ اس طرح زمین اور ڈائل دونوں مشرق سے مغرب کی طرف حرکت کرتے ہوئے نظر آئیں گے۔ قطبین کے وسط میں یعنی خط استوا پر یہ اثر محسوس نہ ہوگا۔ چونکہ یہ ایک ایسا مقام ہے جہاں حرکات کا باہمی تصادم ہوتا ہے۔ جب ایک چیز اپنے مدار پر صحیح طور پر حرکت کر رہی ہے اور ایک ایسی حالت میں چھوڑ دی جائے جہاں قوت کشش مفقود ہو تو مدار ہمیشہ ایک ہی حالت میں رہے گا۔ اور خصوصاً ایسی صورت میں کہ ایک ستارہ کی جانب رُخ قائم کیا جائے جو زمین سے علیحدہ اور متحرک فرض کر لیا جائے تو اس کا رُخ اس ستارے سے نہ بدلے گا۔ گراس کوپ[۱۸] (Gros Cope) میں ایک وزنی پہیہ (Wheel) لگا کر تیز حرکت دیجائی تو وہ ایک عرصہ تک گردش کرتا رہے گا بشرطیکہ تمام تر وہ اثرات جو حرکت کو روکنے والے ہیں۔ مثلاً قوت کشش موجود نہ ہوں اگر زمین ساکن ہوتی تو اس کے مدار میں تبدیلی نہ ہوتی خواہ کتنے ہی عرصہ تک پہیہ Wheel حرکت کیوں نہ کرتا رہتا لیکن اگر زمین متحرک ہے اور مدار ساکن تو کچھ اختلاف کا ہونا ضروری ہے۔ تجربہ سے یہ ثابت ہوا ہے کہ فرق پڑتا ہے اور اس فرق سے ثابت ہوتا ہے کہ زمین متحرک ہے۔ اہل چین، اہل ہند، مصری اور کلدانی نجومی حسابات آفتاب کے طلوع سے کرتے ہیں۔ منجمین یورپ بجائے طلوع آفتاب کے دن کے ۱۲ بجے سے شمار کرتے ہیں[۱۹]۔ نجومی حسابات تمام مرکز زمین سے لیے جاتے ہیں اور علم ہیئت کے حسابات تمام مرکز شمس سے کئے جاتے ہیں۔ آفتاب کے کسی برج میں داخل ہونے کو اصطلاح نجوم میں تحویل شمس کہتے ہیں۔ پورے دائرہ منطقۃ البروج کو چار برابر حصوں میں تقسیم کر دینے سے سال کا طول معلوم کیا جا سکتا ہے۔ برج حمل کے صفر درجہ سے حساب شروع ہوتا ہے۔

	دن	گھنٹے	منٹ
آفتاب کو برج حمل کے صفر برج سرطان کے صفر تک پہونچنے میں لگتے ہیں۔	۹۲	۱۹	۵۳
برج سرطان کے صفر درجہ سے میزان کے صفر درجہ تک پہونچنے میں	۹۳	۱۴	۳۹
برج میزان کے صفر درجہ سے جدی کے صفر درجہ تک پہونچنے میں	۸۹	۱۸	۳۵
برج جدی کے صفر درجہ سے حمل کے صفر درجہ تک پہونچنے میں	۸۹	۰	۴۲
یعنی دوازدہ بروج طے کرنے میں کل	۳۶۵	۵	۴۹

صرف ہوتے ہیں اگر تحویل شمس برج حمل کا صحیح طور پر معلوم ہے تو آئندہ سال کا تحویل شمس برج حمل ۳۶۵ دن ۵ گھنٹے ۴۹ منٹ جوڑ دینے سے معلوم ہو جائیگا مثلاً آفتاب ۲۱ مارچ ۱۹۰۹ء کو برج حمل میں شام کو ۶ بجے ۱۳ منٹ پر داخل ہوا تھا اور ۱۹۱۰ء کے متعلق یہ دریافت کرنا ہے کہ شمس اس سال برج حمل میں کس وقت داخل ہوگا۔

	دن	گھنٹے	منٹ
حمل مارچ ۱۹۰۹ء =	۲۰	۱۹	۱۳
اس میں	۳۶۵	۵	۴۹ جوڑ دینے سے
حاصل	۳۸۶	۰۰	۲ ہوئے
اس میں سے ۳۶۵ دن منہا کر دینے سے	۳۸۶	۰۰	۲
	۳۶۵	۰۰	۰
	۲۱	۰	۲

یعنی ۲۱ مارچ کو ۱۲ بجکے ۲ منٹ پر آفتاب داخل برج حمل ہوگا۔

فلکی امیری ۲۱۳

نام کی تبدیلی

بعض احباب کے اصرار سے ناچیز بندہ کا نام اب

کلیم

کر دیا گیا ہے

ایجنٹ اور خریدار براہ کرم نوٹ فرمالیں

حضرت جوش ملیح آبادی

---

[۱۸] ایک قسم کا آلہ ہے۔ [۱۹] ۱۲ بجے دن سے دوسرے دن کے ۱۲ بجے تک ایک دن مانا گیا ہے۔

ضمیر فروش ملکہ

(اقبال احمد بی، اے)

اڈگر شاہ انگلستان اپنی ونچسٹر (Winchester) کی محلسرائے میں مضمحل بیٹھا تھا اس کی پیشانی پر شکنیں پڑی ہوئی تھیں اور دماغ کسی گہرے خیال میں غرق، ملکۂ انگلستان کا حال ہی میں انتقال ہوا تھا اور اس نے وارثِ تاج و تخت ایک ناتواں اور سمجھدار بچہ چھوڑا تھا جس سے آئے دن کی خانہ جنگیوں کے زمانہ میں سلطنت سنبھالنے کی کوئی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ بادشاہ کو دوسری شادی اور ایک مضبوط وارث کی فکر دامنگیر تھی مگر ہنوز کوئی عورت اُس کی نظر میں نہ تھی جو اس کی شریک زندگی بننے کی اہلیت رکھتی ہو۔ امراء اور درباری سب پریشان تھے کہ کس طرح بادشاہ کی پیشانی سے شکنیں رفع کی جائیں کہ خوش قسمتی سے ایک مغنّی دربار میں حاضر ہوا چونکہ بادشاہ کو نغمہ و سرود سے خاص شغف تھا۔ درباریوں نے اُس کو بادشاہ کے حضور میں پہنچایا۔ اور ایک بڑے انعام کا وعدہ کیا۔ اگر وہ بادشاہ کو خوش کرنے میں کامیاب ہو سکا۔ مغنّی مؤدبانہ بادشاہ کے حضور میں دو زانو ہو گیا۔ اشارہ پا کر اُس نے اپنا سرود اُٹھایا اور اس کے تاروں پر ہلکے سروں میں گانا شروع کیا۔ ایسے ہلکے اور نرم انداز میں کہ ہر ایک مصرعہ کی شیرینی اور حلاوت علیحدہ علیحدہ نمایاں ہو رہی تھی مگر یکایک جب مغنّی نے الفریڈا نواب ڈیون شائر (Duk of Devnshire) کی مدح خوانی میں قصیدہ شروع کیا تو تاروں کی جنبش میں انتہائی تیزی پیدا ہو گئی۔ مغنّی نے بھی جہاں تک اس کے گلے اور انگلیوں کا تعلق تھا اپنی پوری قوت کا اظہار کیا اس کی آواز سرود کے تاروں سے اس طرح ملی ہوئی نکل رہی تھی کہ سننے والے کو گمان ہوتا تھا موسیقی سرود کے تاروں سے ٹپک رہی ہے۔ ہر نشیب و فراز جو مغنّی کی آواز سے پیدا ہوتا اور ہر تعریف جو شاعر نے اپنی جگر سوزی سے اس کے وجود میں پیدا کی تھی اپنی پوری قوت کے ساتھ حاضرین کو مسحور کر رہی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خود سرود الفریڈا کی شان میں رطب اللساں ہے۔

نغمہ ختم ہو گیا اور مغنّی بادشاہ سے لیکر خادم تک کو مبہوت چھوڑ کر کھڑا ہو گیا اور جس وقت اس نے اپنی گردن بادشاہ کے حضور میں سلام کے لئے خم کی تب لوگوں کو ہوش آیا کہ نغمہ ختم ہو چکا ہے۔ بادشاہ نے دریافت کیا کہ آیا فی الواقع الفریڈا اتنی ہی حسین اور ہوشربا ہے جیسا کہ شاعر نے بیان کیا ہے یا محض یہ ایک شاعرانہ تخیل ہے۔ مغنّی نے جواب دیا کہ دُنیا کی تمام شاعری الفریڈا کے حسن کا ایک نامکمل خاکہ پیش کر سکتی ہے۔ وہ خود ایک شعر ہے مگر ایسا شعر جو صانع حقیقی کے قلم سے بھی ایک مرتبہ نکلا ہے اس کی رعنائی اس کا حُسن و جمال اس کی سرو قامتی ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار محال ہے۔ جب کبھی وہ ٹہلتی ہوئی باغ کی روش پر طلوعِ ماہتاب کے وقت چلی جاتی ہے تو دیکھنے والے کو دھوکا ہوتا ہے کہ آیا آج ایک ماہتاب نکلا ہے یا دو۔ اور یہ تو ایک حقیقت ہے کہ کوئی شخص نہیں پہچان سکتا کہ آیا آج ماہتاب کی کرنیں دُنیا کو منور کر رہی ہیں یا شہزادی الفریڈا کا حُسن۔ اس کا قد لانبا ہے۔ اس کی آنکھیں ایک زندہ سحر سامری ہیں۔ اس کی رعنائی ایک سیلاب ہے جو انسانی توازن کو بہالیجاتا ہے جس شخص نے شہزادی کو ایک مرتبہ دیکھ لیا اس کے دل سے شہزادی کی محبت کا خمار جہنم کی تمام سختیاں بھی نہیں مٹا سکتیں۔ اس کا رنگ ایسا معلوم ہوتا ہے (کہ کسی نے ہاتھی دانت میں رنگ گلاب حلول کر دیا ہے) وہ ایک صبح بہار ہے جو چشم عالم پھر کبھی نہ دیکھے گی۔ غرضیکہ جسقدر تعریف زبان انسان کر سکتی ہے مغنّی نے شہزادی الفریڈا کی کی اس شب بادشاہ کی آنکھیں نیند سے ناآشنا تھیں۔ وہ برابر کروٹیں بدلتا رہا یہاں تک کہ اس نے ایک خادم کو آواز دی اور اس کو اپنے دوست اور معتمد خاص ایتھلوڈ (Atheled) کے بلانے کا حکم دیا۔ اور جس وقت ایتھلوڈ کمرہ میں حاضر ہو گیا۔ تو بادشاہ نے اس سے کہا میرے دوست آج اس مغنّی نے مجھ پر سحر کر دیا ہے میری آنکھوں سے خواب کافور ہے اور سر میں شہزادی کا سودا۔ کیا تیرے خیال میں کسی عورت کا اس قدر حسین ہونا ممکنات سے ہے۔ ایتھلوڈ نے جس کو آجتک اس بات پر فخر تھا۔ کہ کوئی عورت اس کے دل پر قبضہ کرنے میں کامیاب نہیں ہوئی ہے اور جس کا نظریہ عورت کے متعلق صرف اس قدر تھا کہ عورت کا وجود ایک پھول ہے جو مرد کے لئے توڑنے سونگھنے اور مسل ڈالنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے وہ کہا کرتا تھا کہ عورت کی آنکھوں کا افسوں صرف کمزور مردوں سے ہی تاب مقابلہ چھین لیتا ہے ورنہ عورت کا حسن و شباب کمزور دل مردوں کو ابرق کی اور مضبوط دل مردوں کو معصیت کی دعوت دیتا ہے انتہائی حقارت کے ساتھ اپنے شانوں کو جنبش دیتے ہوئے کہا کہ بادشاہ سلامت یہ شاعر اور مغنّی تو دو خوبصورت آنکھوں اور صبیح رنگ و روپ سے اس قدر متاثر ہو جاتے ہیں کہ ان کی تعریف میں اپنے کمال کو صرف کر ڈالتے ہیں گویا یہ وہی دیویاں ہیں جن سے اصنام پرستی کی ابتدا ہوئی۔ لیکن اگر ان کو بنظر غور دیکھا جائے تو وہ خلاق عالم کا ایک ادنیٰ کرشمہ معلوم ہوتی ہیں نہ کہ کمال صناعی۔ او مگر مغنّی کہتا تھا کہ وہ دُنیا کا بہترین شاہکار ہے بادشاہ بڑبڑایا اور پھر ایتھلوڈ کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگا میرے دوست تمہاری وفاداری مُسلم ہے اور تم کو بخوبی علم ہے جو اعتماد مجھ کو اپنی سلطنت بھر میں تم پر ہے وہ کسی اور پر نہیں چنانچہ میں اپنے دل کا راز دار بھی تم ہی کو بنانا چاہتا ہوں۔ تم ایک ہفتہ کے اندر سفر کی تیاری کرو اور ڈیون شائر پہونچکر شہزادی الفریڈا کو بچشم خود دیکھو اور واپس ہو کر مجھ سے بیان کرو کہ آیا شہزادی واقعی اس قدر خوبصورت ہے جیسا کہ آج مغنّی بیان کر رہا تھا یا تمہارا خیال صحیح ہے۔ مگر حلف اُٹھاؤ کہ واپسی پر شہزادی کے حسن و شباب کا بالکل صحیح خاکہ میرے سامنے کھینچو گے۔ اس پر ایتھلوڈ نے اس قدر سخت قسم کھائی جس کے توڑنے پر ابدی لعنت میں اس کا گرفتار ہونا لابدی ہو جائے۔ ایتھلوڈ کو اس سفر کی اس قدر بیتابی تھی کہ وہ اگلے ہی روز روانہ ہو گیا۔ تاریخ اس بارے میں خاموش ہے کہ ایتھلوڈ اور شہزادی الفریڈا کی پہلی مرتبہ کہاں ملاقات ہوئی۔ اغلب یہ ہے کہ ڈیوک نے جو بادشاہ کے معتمد کو خوش آمدید کہنے کے لئے ایک بڑی دعوت دی تھی اس میں اوّل مرتبہ شہزادی اور بادشاہ کے مصاحب خاص نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ مگر جہاں کہیں بھی

وہ نظر اولین ایتھلوڈ پر پڑی یہ یقینی ہے کہ چاہے اس کو کیوپڈ کے تیر سے تعبیر کیجئے یا آنکھوں کے سحر سے۔ شباب کی رعنائیوں سے یا آواز کی موسیقی سے لیکن ایک مرد کے فخر و مباہات ایک ناتواں ہستی کے قدموں کو بوسہ دینے کے لئے بیتاب اور ایک آہنی ارادہ کے انسان کا پیمانِ وفا اور مذہب بارگاہِ حسن میں قربان ہو چکا تھا الفریڈا کے حسن میں تو کوئی کلام ہو نہیں سکتا چونکہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ تمام تعریفیں اس کی ان رعنائیوں کو بیان کرنے سے قاصر ہیں جو الفریڈا کی ذات میں علاوہ حسن کے موجود تھیں

یہ یقینی ہے کہ الفریڈا کی نگاہ اولیں ہی نے ایتھلوڈ کے دل اور روح کو مجروح کر دیا تھا مگر اس نے انتہائی ضبط سے کام لیا اور ایک ناکام کوشش اپنی وفاداری کو قائم رکھنے کی کی مگر عشق از ین بسیار کردہ است و کند، ایک جانب تو ایتھلوڈ کو اب معلوم ہوا کہ وہ زندگی کی نئی لذت سے پہلی مرتبہ آشنا ہوا ہے اور اس کی گزشتہ زندگی ایک بے مزہ خواب تھی جس سے وہ ابھی ابھی بیدار ہوا ہے دوسری جانب شہزادی نے یہ دیکھ کر کہ ایتھلوڈ ایک حسین شخصیت اور ایک بڑے مرتبہ کا حامل ہے اپنے میگوں لبوں کی موسیقی اور اپنے شباب کی رعنائیاں ایتھلوڈ کے دل پر قبضہ پانے میں صرف کرنی شروع کر دیں بالآخر ایتھلوڈ الفریڈا کے ہاتھوں میں ایک بے جان قالب تھا۔ وہ شہزادی کو حریص نگاہوں سے دیکھتا اور ایسا محسوس کرتا کہ قوت گویائی اس سے چھین لی گئی ہے۔ اس نے اپنے آنے کی وجہ بالکل ظاہر نہ کی اور شہزادی کو بالکل علم نہ ہو سکا کہ ایتھلوڈ پہ مسکرانے میں وہ انگلستان کے تخت کو خیر باد کہہ رہی ہے الفریڈا کی محبت میں ایتھلوڈ اپنے آپ کو ایک ہی دنیا میں پاتا تھا۔ آہ اس نے خیال کیا ابدی لعنت شہزادی کے چند لمحوں کی محبت کی قیمت نہیں ہو سکتی۔ پھر کیا وجہ ہے کہ وہ جری ہو کر نہ رہے۔ چنانچہ اس نے شہزادی کے باپ کے سامنے اپنی شادی کی درخواست پیش کر دی اور ڈیوک نے یہ خیال کرتے ہوئے کہ اس سے بہتر پیغام اس کی لڑکی کو ملنا مشکل ہے۔ ایتھلوڈ کی درخواست منظور کر لی۔ اب شہزادی ایتھلوڈ کے آغوش میں تھی اور اس کے حسین لب ایتھلوڈ کے لبوں میں جذب۔ شہزادی نے ایتھلوڈ سے الفت اور پیمانِ وفا کرنے کے بعد اس کو رخصت کیا۔

ایتھلوڈ بادشاہ کے حضور میں حاضر ہوا جو نہایت بے تابی سے اس کی آمد کا منتظر تھا اور شہزادی کی کیفیت دریافت کی۔ ایتھلوڈ نے نہایت حقارت سے اپنے شانوں کو جنبش دیتے ہوئے کہا حضور انور شہزادی کا چہرہ ضرور خوبصورت ہے مگر جسم کی ساخت نے چہرہ کی خوبصورتی پر پردہ ڈال دیا ہے۔ میری ناچیز رائے میں تو وہ ہرگز سلطنت کی شریک بننے کی اہلیت نہیں رکھتی۔

ایتھلوڈ کو اپنی چالاکی پر حیرت تھی کہ جس کے لب کبھی دروغگوئی سے آشنا نہیں ہوئے تھے وہ کس دریدہ دہنی سے جھوٹ بول رہا تھا مگر حسن کے جادو نے اب اس کو قعر مذلت کی انتہائی گہرائی میں گرنے پر تیار کر دیا تھا۔ اور ہو یہ ہے اس کے حسن کی حقیقت میں نے نہایت عقلمندی سے کام لیا کہ شادی کا پیغام بھیجنے سے قبل تم کو روانہ کر دیا۔ وہ ہرگز میری ملکہ نہیں ہو گی" بادشاہ نے جواب دیا۔ اس کے بعد بادشاہ کو الفریڈا کا خیال بھی نہ رہا ایتھلوڈ کچھ عرصہ دربار میں رہا اور اپنی حرکات و سکنات پالیسی اور طرح اپنی غداری پر بادشاہ کو شبہ ہونے کا موقع نہیں دیا۔

کچھ عرصہ کے بعد وہ بادشاہ سے رخصت ہو کر ڈیون شائر پہنچا اور اب الفریڈا ایتھلوڈ کی بیوی تھی۔ بادشاہ کو جب اس شادی کی خبر پہنچی تو اس نے ایتھلوڈ کو فوراً دربار میں حاضر ہونے کا حکم دیا اور جب وہ دربار میں حاضر ہوا تو اس سے دریافت کیا کہ اگر الفریڈا اس قدر بھدی ہے تو اس نے کیوں اس سے شادی کی۔

ایتھلوڈ نے جواب دیا۔ خدا شہنشاہ کی عمر میں برکت دے۔ میری شادی کی وجہ شہزادی کا حسن یا اس کی محبت نہ تھی کیونکہ محبت تو کاہلوں کی بیکاری کا مشغلہ ہے۔ مجھ کو جس چیز نے الفریڈا سے شادی کی ترغیب دی وہ اس کے باپ کی دولت ہے۔ ایتھلوڈ نے اس قدر چرب زبانی سے گفتگو کی کہ بادشاہ کو اس کا دوبارہ یقین ہو گیا اور ایتھلوڈ کو بھی اب اطمینان قلب نصیب تھا۔ چند روز دربار میں حاضر رہ کر ایتھلوڈ پھر اپنی بیوی کے پاس جا پہنچا۔ دن عید اور رات شب برات تھی۔

ایتھلوڈ کو اب معلوم ہوا کہ زندگی اپنے اندر کیسے کیسے اسباب لذت اور تفریح پنہاں رکھتی ہے۔ اس کی حالت ایک مدہوش انسان کی سی تھی۔ وہ صحیح معنی میں الفریڈا کا پرستار تھا اور خیال کرتا تھا کہ اس کی غداری الفریڈا کی نیم نگاہی کی بھی قیمت ادا نہیں کر سکتی لیکن ایک مجرمانہ خیال تھا جو اس کی لذت کو کبھی کبھی تلخ کر دیتا تھا۔ اور وہ یہ کہ اگر بادشاہ کو اس کی غداری کا علم ہو گیا تو اس کا کیا حال ہو گا ادھر درباریوں نے ایتھلوڈ کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھا کر بادشاہ کے کان بھرنے شروع کر دئے تھے۔ اڈگر کو دکا اور دربار نے اس کا یقین دلانا شروع کر دیا تھا کہ الفریڈا واقعی قدرت کا شاہکار ہے اور برطانیہ کا بادشاہ بھی ایسی ملکہ پر فخر کر سکتا ہے مگر ایتھلوڈ نے بادشاہ کو دھوکہ دے کر اس کو اپنی بیوی بنا لیا ہے ان خبروں سے بادشاہ کے مردہ شبہات از سر نو زندہ ہو گئے اور اڈگر شکار کے بہانہ سے الفریڈا کو بچشم خود دیکھنے کے لئے روانہ ہو گیا جوں ہی ایتھلوڈ کو بادشاہ کی آمد کی خبر معلوم ہوئی انفعال اور خوف اس کے دامنگیر تھے کیونکہ اڈگر نہایت غضبناک بادشاہ تھا۔ اس نے نہایت جابرانہ اور وحشتناک قوانین ایجاد کئے تھے اور جو شخص بدقسمتی سے بادشاہ کو ذرا سا موقع برہمی کا دیتا تھا اس پر عفو اور کرم کے دروازہ بند ہو جاتے تھے اور بادشاہ کا انتقام نہایت سنگدلانہ ہوتا تھا چنانچہ ایتھلوڈ کا اس وقت سے جبکہ اس کے بادشاہ اور آقا کو اس کی غداری کا علم ہو گا لرزہ براندام ہونا درست اور صحیح تھا۔

اس کی امیدوں کا آخری مرکز اس کی بیوی تھی۔ چنانچہ لرزتے ہوئے دل سے اس نے الفریڈا سے کہا۔

الفریڈا تیری محبت سے اندھا ہو کر میں نے ارتکاب جرم کیا ہے اور اب وہی زندگی کی کفیل ہو سکتی ہے

میرے آقا فرمایئے جہاں تک لونڈی کے اختیار میں ہے وہ اپنے مالک کے لئے ذبانی کر سکتی ہے الفریڈا نے جواب دیا۔

ایتھلوڈ کے لئے حسن کو ماتو سیوں نے ... حرف ... الفاظ۔ یک گونہ پیغام مسرت رکھتے تھے ایک طرف وہ بادشاہ کے سامنے ... پیش کرنے میں اپنی بیوی کی مدد ... تھا اور دوسری جانب اس کو الفریڈا کی محبت کا یقین تھا جو اس کی مسنون ... تنہا ... تھی۔ چنانچہ اس نے اپنا بادشاہ کا قاصد ہو کر جانا اور محبت سے دیوانہ ہو کر بادشاہ سے غداری کرنے کا تمام واقعہ اپنی بیوی کو سنایا۔ الفریڈا کو آج پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ اس کے انگلستان کی ملکہ نہ بننے کا باعث اس کا شوہر ہے جس سے اس نے دائمی پیمان وفا باندھا ہے۔ چنانچہ باوجود نہایت ہوشیار ہونے کے وہ بھی اس شعلہ کو جو اس کی آنکھوں سے ظاہر ہونا چاہتا تھا نہیں چھپا سکی اور اس نے اپنی نظر دوسری جانب

چھپے ہیں۔ لیکن جب ایتھلوڈ اپنا قصہ ختم کر چکا تو وہ ایک محبت آمیز تبسم سے اس کی جانب متوجہ ہوئی۔ اس کی آواز میں ہلکا سا ترنم تھا۔ اور کہا میرے آقا جو آپ کی خواہش ہو بیان فرمائیے کنیز آپ کے ہر حکم کی تعمیل میں اپنی محبت کا ثبوت دیگی۔

"میں نے بادشاہ سے یہ کہا تھا کہ تم ایک معمولی حُسن کی مالک ہو اور تمہارا قد و قامت بھدا ہے کیا تم ایسا بھیس بدل سکتی ہو کہ تم بادشاہ کی نظر میں بالکل معمولی عورت کی حیثیت سے [illegible] ہو؟"

"اوہ یہ تو بچوں کا کھیل ہے۔" الفریڈا نے جواب دیا۔ "لیجئے میں ابھی اپنی شکل بدلے ڈالتی ہوں۔" یہ کہکر اس نے اپنی ناگن جیسے سیاہ لانبے بالوں کو نہایت بھدے طریقہ سے پریشان کر کے نصف چہرہ اور پیشانی کو ان سے چھپا لیا۔ ایسے انداز میں کہ اُس کو آنکھوں کا حُسن بھی بدنما معلوم ہونے لگا اور اپنے ایک شانہ کو اُبھار کر اور ایک کو نیچا کر کے کولہوں میں سختی پیدا کی اور لنگڑا کر اس طور پر چلنے لگی گویا کہ اس کے عضو اس کے قابو سے باہر ہیں۔ "آپ یہی چاہتے ہیں کہ میں بادشاہ کے سامنے اس انداز میں نمودار ہوں" یہ کہکر وہ اس طرح مسکرائی کہ حوران جنت کو بھی اس کی مسکراہٹ پر رشک آ گیا۔ "ہاں میری اچھی بیوی اگر تم اس انداز سے بادشاہ کے سامنے آؤ گی تو نہ صرف یہ کہ میری زندگی معرضِ خطر سے باہر ہو گی بلکہ دربار میں میرا اقتدار اور بھی بڑھ جائے گا۔ اب میں بادشاہ کے استقبال کے لئے جاتا ہوں اور واپسی پر میں خود تمکو بادشاہ کے سامنے لیجاؤں گا۔"

"یہ ناممکن ہے۔" الفریڈا نے جواب دیا۔ "یہاں میں اپنے کمرہ میں اپنے ہاتھوں اور رخساروں پر رنگ ملوں گی جس سے میرا رنگ خراب معلوم ہو۔ اپنے بالوں کو اس طرح آراستہ کروں گی کہ میری آنکھیں بے رونق معلوم ہوں اور اپنے کپڑوں کے نیچے اس طریقہ پر روئی رکھوں گی کہ میں کبڑی معلوم ہونے لگوں۔ مگر جب تک یہ تبدیلی مکمل نہ ہو جائے میں آپ کے سامنے حاضر ہونا نہیں چاہتی۔ آپ بادشاہ کو بڑے کمرے میں لیجائیں اور جب میری کنیز آپ کو میری آمد کی اطلاع دیں تو آپ دروازہ سے پردہ ہٹا کر اپنی بدصورت بیوی کو بادشاہ کے حضور میں پیش کریں۔" ایتھلوڈ تو اپنی بیوی کی ہیئت تبدیل کرنے پر رضامند ہو جانے سے اس قدر خوش تھا کہ اس کی کسی بات پر اعتراض کرنا اس کی طاقت سے باہر تھا چنانچہ اس نے کہا۔ "میری نازنین الفریڈا آج کے بعد تمہارے ادنیٰ اشارہ کی تعمیل میرا فرض اولین ہوگا۔ آج تم صحیح معنوں میں جان نواز ہو" یہ کہکر وہ اپنی بیوی سے بغلگیر ہوا جس کے جواب میں الفریڈا ایک مدہوشی کے عالم میں اپنے خاوند سے لپٹ گئی اور بسلامت روی و باز آئی کہکر رخصت کیا۔

ایتھلوڈ شاہ اڈگر کو ایک بڑے ہال میں پہونچا اور ایک جام شراب دو زانو ہو کر بادشاہ کی خدمت میں ان الفاظ کے ساتھ پیش کیا۔ "میں اپنے گھر کی بہترین شراب خدمتِ عالی میں لایا ہوں اور یہی میرے پیمان وفا کی دلیل ہے۔" اڈگر نے جام شراب ہاتھ میں لیا ہی تھا کہ ایک کنیز نے خبر دی کہ بیگم تشریف لا رہی ہیں۔ چنانچہ اڈگر نے کہا میں بیگم الفریڈا کا جام صحت نوش کرتا ہوں۔ ایتھلوڈ نے دروازہ کے قریب پہنچکر سُن لیا تھا کہ اس کی بیوی لنگڑاتی ہوئی آ رہی ہے۔ "آہ میری جاں نواز بیوی اور وفا کی پتلی مجھ کو بچانے آ رہی ہے۔" اور دروازہ پر سے پردہ ہٹاتے ہوئے یوں گویا ہوا۔ "عالی جاہ میری بیوی گو شکل و صورت کے اعتبار سے ضرور نظر فریب ہے مگر اس میں دیگر" اس کے بعد الفاظ اس کے مردہ لبوں سے نہ نکل سکے اس کی آنکھیں کھُلی کی کھُلی رہ گئیں وہ ہکا بکا ایک بُت کے مانند اپنی بیوی کو دیکھ رہا تھا جو دروازہ میں کھڑی تھی۔

شاہ اڈگر اور اُس کا مصاحب مختلف جذبات سے اس ماہ چہار دہم کو دیکھ رہے تھے جو بدلی کو چیر کر نکلتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ آج ایتھلوڈ کی بیوی کی جانب سے اُس دغا بازی کا مکمل جواب دیا گیا تھا جو کچھ عرصہ پہلے وہ اپنے بادشاہ سے کر چکا تھا۔ الفریڈا اپنی جملہ رعنائیوں کے ساتھ دروازہ میں جلوہ گر تھی۔ اس کی شفاف جلد ہر قسم کے غازہ سے بری تھی۔ اس کی آنکھیں شراب کے چھلکتے ہوئے دو جام تھے۔ اس کے سیاہ لانبے بال نہایت آراستگی سے سنوارے ہوئے تھے۔ اس کی چال میں شاہانہ دلربائی تھی اور ہاتھ معانقہ کے لئے شاہ اڈگر کی جانب دراز تھا۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ اس وقت سے لیکر دوسرے روز تک ایتھلوڈ بادشاہ کے زیر نظر تھا۔ اور تیسرے روز اس دنیا میں نہیں تھا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اس کو بادشاہ نے خود اپنے ہاتھ سے قتل کیا اور کچھ لوگوں کا بیان ہے کہ بادشاہ اڈگر کے حکم سے مارا گیا۔ بہر حال اس کی زندگی کا خاتمہ اگلے روز ہو چکا تھا اور ایک ہفتہ کے اندر الفریڈا انگلستان کی ملکہ بن چکی تھی۔ اس نے اپنے خاوند کی روح کو ثواب پہونچانے کی غرض سے ایک خانقاہ تعمیر کرائی اور اس کے بعد سے ایتھلوڈ کا خیال دل سے نکال دیا۔

شاہ اڈگر کی رسم تاجپوشی چند در چند وجوہات سے اب تک نہیں ہوئی تھی جو شادی کے بعد نہایت شاہانہ شان سے منائی گئی اور روپیہ پانی کی طرح بہایا گیا۔ جس وقت ملکہ الفریڈا نے شریک سلطنت کا تاج پہنا اُسی وقت اس نے ارادہ کر لیا تھا کہ وہ سلطنت کے کاموں میں شاہ اڈگر سے زیادہ اختیارات کا استعمال کریگی چنانچہ ایسا ہی ہوا شادی سے لیکر شاہ اڈگر کی موت تک جو تین سال بعد واقع ہوئی وہ صحیح معنوں میں انگلستان کی اصلی مالک تھی شاہ اڈگر جو نہایت جابر اور ظالم حکمراں تھا اپنی بیوی کے ہاتھ میں کٹھ پتلی کی طرح ناچتا تھا۔ اور اس کی ہر خواہش کی تکمیل اس کے اظہار سے قبل ہی کر دی جاتی تھی جو تاریک گناہ ملکہ الفریڈا نے کئے ان میں سے ایک قابل ذکر یہ ہے شاہ اڈگر نے اپنی موت پر ایک ناتواں بچہ جو ولیعہد مقرر ہو چکا تھا اور ایک بچہ جو الفریڈا کے بطن سے پیدا ہوا تھا چھوڑے تھے الفریڈا اپنے بیٹے کیلئے تاج و تخت کی متمنی تھی چنانچہ جس وقت ولیعہد الفریڈا کے محبت بھرے ہاتھوں سے شراب کا ایک جام پی رہا تھا اسی کے اشارے سے جلاد نے غریب شہزادے کی زندگی کا خاتمہ کر دیا

حاصلِ علالت

سب دیکھنے آئے ہیں کیا اپنے پرائے
مرتے تھے مگر جن کیلئے وہ ہی نہ آئے

ساغر

نذر
خالدہ ادیب خانم

از:- اسرار الحق بی۔اے (علیگ) مدیر علیگڈھ میگزین)

یہ تاریخی نظم جو نہایت گہرے اور لطیف جذبات خیر مقدم سے لبریز ہے مسلم یونیورسٹی یونین کے ایک عظیم الشان جلسے میں اس موقع پر مجاز صاحب نے اپنے مترنم لہجے میں ارشاد فرمائی تھی۔ جب ترکی کی عظیم المرتبت خاتون خالدہ ادیب خانم تشریف لائی تھیں۔ یہ جلسہ اپنی ادبی اہمیت اور نوعیت کے لحاظ سے یوں بھی تاریخی تصور کیا گیا تھا کہ اس کی صدارت ملک کے بلند پایہ ادیب شہیر جناب سجاد حیدر یلدرم بی۔اے نے کی تھی۔ اس نظم نے جلسہ میں ایک خاص حرارت اور زندگی پیدا کر دی تھی اور اس مدح منظوم کی کامیابی کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا تھا جب ڈاکٹر انصاری صاحب کی کوٹھی پر مسز سروجنی نائیڈو نے ہند کی انقلابی خاتون محترمہ خالدہ ادیب خانم سے تعارف کرایا تو خود ممدوحہ نے اس نظم کی تعریف کی۔ میں اس موقع پر مجاز صاحب کو مبارکباد دیتا ہوں کہ وہ خالدہ خانم کی خوبصورت تحسین حاصل کر سکے۔

ساغر

دل مست کی فراوانی سے دیوانہ ہے آج — دیکھنا یہ کون آخر زیب کاشانہ ہے آج
کیف صہبائے طرب میں غرق میخانہ ہے آج — ہر شجر ساغر بکف ہر پھول پیمانہ ہے آج
غنچہ و گل تھے یہی لیکن یہ رعنائی نہ تھی
اس گلستاں میں بہار اس دھوم سے آئی نہ تھی

نرگس مخمور ہے لذت کش خواب نشاط — پھوٹ نکلا ہے گل و نسریں سے سیلاب نشاط
اہل محفل کے لئے مشکل ہے اب تاب نشاط — آج پیمانوں سے چھلکے گی مئے ناب نشاط
پُرفشاں ہے جذبۂ پنہاں ابھرنے کے لئے
مضطرب ہے ذرہ ذرہ رقص کرنے کے لئے

پھر ادھر آئے نہ آئے یہ شمیم جاں فزا — پھر یہ ہو نہ ہو ایسا سماں ایسی ہوا
چھیڑ اس انداز سے اے مطرب رنگیں نوا — ٹوٹ جائے آج اک اک تار تیرے ساز کا
ذکر جس کا زہرہ و پروین کے کاشانے میں ہے
وہ صنم بھی آج اپنے ہی صنم خانے میں ہے

خالدہ! تو ہے بہشت ترکمانی کی بہار — تیری پیشانی پہ نور حریت آئینہ دار
تیرے رخ سے پرتو معصومیت ہے آشکار — تیرے جلووں کی صباحت سے فرشتے شرمسار
گل پشیماں قلب بلبل رشک سے دونیم ہے
تیری باتوں میں سرور کوثر و تسنیم ہے

شوق کی سوزش جمال و نور کا سیلاب ہے — ہر کلی ساز طرب ہے ہر نظر مضراب ہے
آنکھ حیراں روح ارباب وفا بیتاب ہے — یہ ہمارے خواب کی تعبیر ہے یا خواب ہے
لالہ و گل کیا چمن بھی تیرے قدموں پر نثار
یہ گہرہائے سخن بھی تیرے قدموں پر نثار

یوں تو ہم ہر شمع علم و فن کے پروانے رہے — یہ حقیقت ہے کہ ہم تیرے ہی دیوانے رہے
مدتوں اپنی زباں پر تیرے افسانے رہے — تو رہی بیگانہ لیکن ہم نہ بیگانے رہے
یاد تیری اک زمانے سے ہمارے دل میں تھی
تو یہاں آنے سے پہلے بھی اسی محفل میں تھی

اے مقدس حور اے پروردۂ موج نسیم — روح حضرت گاہ ساحل جان طوفان عظیم
تو نے ترکوں کو دکھائی ہے رہ راہ مستقیم — پھونک ڈالے ہیں تعصب کے حجابات قدیم
شعلہ دکھلایا ہے جب بھی فطرت احرار نے
آگ برسا دی ہے تیرے نطق گوہر بار نے

رہ چکی ہے ہاتھ میں تیرے وہ تیغ بے نیام — جس کی جنبش نے بدل ڈالا حکومت کا نظام
ترک اٹھے وہ کو تو نے ہی دیا اذن خرام — تیرے ہی ہاتھوں نے چھلکائے ہیں آزادی کے جام
تو نے جو احساں کئے ہیں ملت احرار پر
نقش ہیں اب تک تمنا کے در و دیوار پر

ہاں بتا دے ہم کو بھی اے روح ارباب نیاز — کس طرح بنتا ہے آخر رنگ و خوں کا امتیاز
دل پہ کیونکر فاش ہو جاتے ہیں آزادی کے راز — چھیڑتے ہیں کس طرح محفل میں بیداری کا ساز
تیری آنکھوں میں سرور عشرت جمہور ہے
آہ یہ جوہر ہمارے دسترس سے دور ہے

محرم درد و مسرت راز دار صبح و شام — خامشی محفل فطرت ہے تجھ سے ہم کلام
تیری ہستی آسمان ترک کا ماہ تمام — تو محبت ہے نفس تیرا محبت کا پیام
گلشن مشرق میں مانند صبا آئی ہے تو
صبح روشن کا پیام جانفزا لائی ہے تو

قربت گل کس قدر جاں بخش ہے خاروں سے پوچھ — چاندنی تو ہے یہ کیا لطف ہے تاروں سے پوچھ
نشۂ صہبا میں کیا لذت ہے میخواروں سے پوچھ — چارہ سازی میں مزہ کیا ہے یہ بیماروں سے پوچھ
روح و دل کو جگمگا دے جلوہ آرائی تری
ہم سے کم اتنا تو کر جائے مسیحائی تری

کوئی دم میں اس گلستاں سے نکلنا ہے تجھے — وحشت گلشن سے دور انگاروں پہ چلنا ہے تجھے
خارزار غم کو یوں دل سے کچلنا ہے تجھے — جادۂ منزل میں کرنا ہے جو کرنا ہے تجھے
درس ایسا دے کہ دل آزردۂ منزل نہ ہو
فکر لاحاصل نہ ہو اندیشۂ باطل نہ ہو

مسئلہ "بیم و رجا" پر نفسیاتی تبصرہ

"خوف و امید" کا اچھوتا تجزیہ

فطرتِ انسانی کی رگیں فلسفہ کے نشتر پر

(از ماہر القادری)

یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ موالیدِ ثلاثہ خلاصۂ کائنات ہیں اور انسان موالیدِ ثلاثہ کا خلاصہ اور جوہر ہے۔ وہ تمام امتیازی خصوصیات جو جمادات، نباتات اور حیوانات (موالیدِ ثلاثہ) میں پائے جاتے ہیں مجموعی طور پر "انسان" اُن کا حامل ہے۔ جمادات کا امتیاز خصوصی "جسم و صورت" نباتات کا "نمو اور بالیدگی" اور حیوانات کا امتیاز خصوصی "غیر ارادی احساس" ہے۔ انسان میں "جسم و صورت" "نمو (بالیدگی)" اور "احساس" تمام امتیازات پائے جاتے ہیں۔ پس انسان کو موالیدِ ثلاثہ کا خلاصہ اور جوہر کہنا مطابق عقل و واقعیت اور قرین قیاس ہے۔ لیکن جسم و صورت، بالیدگی اور احساس، انسان کے امتیازی خصوصیات نہیں ہیں، انسان کا امتیاز خصوصی "ادراک" ہے اور یہیں سے حیوان مطلق اور انسان کی حدیں علیحدہ ہو جاتی ہیں۔

انسان اور حیوان مطلق میں بعض باتیں بڑی حد تک مشترک پائی جاتی ہیں "تنمیہ، تغذیہ، دفع فضلات، اور تولیدِ مثل" کے محرکات و موثرات کے اعتبار سے انسان اور حیوان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اس اشتراک کا سبب صرف یہ ہے کہ یہ تمام افعال "حیاتِ غیر شاعرہ" سے تعلق رکھتے ہیں "ادراک" یا "حیات شاعرہ" سے ان کو کوئی علاقہ اور واسطہ نہیں۔ اوپر کہا جا چکا ہے کہ انسان کا امتیاز خصوصی "ادراک" ہے اس اعتبار سے انسان کا دوسرا نام "ہستیٔ مدرک" بھی ہو سکتا ہے۔ ابھی ابھی بیان ہو چکا ہے کہ "تنمیہ، تغذیہ اور تولیدِ مثل کا تعلق" ادراک سے نہیں ہے۔ آؤ اس مسئلہ کو ذرا تفصیل و وضاحت کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کریں۔

ایک صحیح و تندرست انسان (ہستیٔ مدرک) کسی سبب سے یکایک "دیوانہ" ہو گیا "دیوانگی" نے اس کی حالتِ شعوری میں عجیب و غریب انقلاب پیدا کر دیا۔ وہ کسی سبب کے بغیر قہقہے لگاتا ہے، بازاروں میں عریاں گھومتا ہے۔ راہگیروں پر بے تحاشا پتھر برساتا ہے اور قانون کی گرفت اور حکومت کی داروگیر کی مطلق پروا نہیں کرتا، بھری محفل میں ناچنے لگتا ہے، قیمتی اشیاء کو توڑ پھوڑ ڈالتا ہے۔ قیمتی سے قیمتی لباس کی دھجیاں بکھیر دیتا ہے، حالانکہ اب سے کچھ دن پہلے یہی شخص انتہائی مہذب و سنجیدہ تھا۔ محفل میں تمیز سے بیٹھتا تھا، بازار کو بن سنور کر جاتا تھا، لباس اور آرائش و زینت کی اشیاء کو جان سے زیادہ عزیز رکھتا تھا، مگر شعور و ادراک کے اس فقدان کے باوجود وہ کھاتا ہے پیتا ہے سوتا ہے اور مقاربت و اقتران کا بھی حظ اٹھاتا ہے پس معلوم ہوا کہ کھانا، پینا، سونا اور جماع کرنا "غیر شاعرہ" افعال ہیں "شعور و ادراک" سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے لہٰذا اس قسم کے تمام افعال میں حیوان اور انسان مشترک ہیں۔ اس کے بعد "حفاظتِ خود اختیاری" کا درجہ ہے۔

قدرت نے ہر جاندار کو "حفاظت نفس" اور "مدافعت" کا احساس عطا فرمایا ہے، چیونٹی اور مچھر سے لے کر شتر مرغ اور ہاتھی تک سب کے سب اپنے بچاؤ کی تدبیر کرتے ہیں۔ چیونٹی جسامت و صورت کے اعتبار سے حقیر ترین جانور ہے مگر جب اس کو کوئی خطرہ محسوس ہوتا ہے تو یہ ننھی سی جان اپنے بچاؤ کے لئے رفتار تیز کر دیتی ہے اور محفوظ مقام کی طرف جانے کی کوشش کرتی ہے یہی حال دوسرے جانداروں کا ہے۔ شیر جنگل کا بادشاہ ہے، اس کی ایک دہاڑ سے ہاتھی کانپ اٹھتا ہے لیکن خطرہ کے وقت وہ بھی اپنی حفاظت کرتا ہے اور خوفزدہ بلی کی طرح پناہ ڈھونڈتا پھرتا ہے۔ ضرورت پڑتی ہے تو دلیری کے ساتھ مقابلہ بھی کرتا ہے۔ "حفاظت" اور "مدافعت" کیوں کی جاتی ہے؟ اس سوال کا جواب بغیر کسی غور و تامل کے دیا جا سکتا ہے یعنی "جان کا خوف" ایک جاندار کو حفاظت و مدافعت کے لئے مجبور کرتا ہے پس حیوان اور انسان "جذبۂ خوف" کی حقیقی نوعیت کے اعتبار سے ایک حد تک اشتراک رکھتے ہیں۔ مگر چونکہ انسان کو قدرت نے "ادراک" بھی عطا فرمایا ہے وہ حیواناتِ مطلق کے مقابلہ میں حفاظتِ نفس اور مدافعت کے لئے زیادہ موثر اور کارگر تدابیر اختیار کرتا ہے، اور مستقبل کے خطرات کی روک تھام کے لئے بہت پہلے دفاعی تدابیر شروع کر دیتا ہے۔ بس ضروری تمہید کے بعد نفس موضوع پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

قدرت نے فطرتِ انسانی کو "بیم و رجا" سے مرکب کیا ہے، انسان کا سارا کاروبار "خوف و امید" کے بل بوتے پر چلتا ہے۔ جاہل و عالم، ذہین و کودن، امیر و غریب، صحیح و تندرست، متقی و سیاہکار، سب "بیم و رجا" کی کشمکش میں مبتلا ہیں۔ "خوف و امید" یا "بیم و رجا" میں "بیم" یعنی خوف کا مرتبہ افضل اور اس کی حیثیت اہم ہے۔ "رجا" یعنی امید کا درجہ بعد کا ہے، سب سے پہلے انسان کے قلب میں "دفع مضرت" کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور اسی جذبہ کو ہم "خوف" کہتے ہیں۔ جلب منفعت کی حیثیت ثانوی ہے۔ مطلب عرض کرنے کا یہ ہے کہ انسان کو اپنے مفاد کا

خیال آنے سے پہلے نقصان سے بچنے کا خیال آتا ہے یعنی "دفع مضرت" کو "جلب منفعت" پر ترجیح حاصل ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ "خوف" "امید" پر ہر حالت میں ترجیح رکھتا ہے۔ شاید پورے طور پر آپ یہ مطلب نہیں سمجھے۔ لائیے مثلاً کو اور زیادہ واضح کر دوں۔ ایک شخص اوامر کی تعمیل اور نواہی سے کلیتہً اجتناب کرتا ہے۔ بالیدگی نفس، تعمیر و تزکیہ روح کی خاطر ہر لمحۂ حیات کو عبادت الٰہی کے لئے وقف کر دیتا ہے فردوس کی نازک اندام حوریں، خلد کے گلفام غلمان، سونے چاندی کے قصر، ہیرے اور یاقوت کی جھیلیں، اطلس اور حریر کے پرتکلف لباس، خوش ذائقہ شرابیں، روح پرور نظارے اور حسین و دلربا جلوے اس کا مطمح نظر نہیں ہیں۔ وہ جو کچھ کرتا ہے "خوشنودی خدا" کے لئے کرتا ہے لیکن خوشنودی باری کی امید سے پہلے اس کو "عتاب خداوندی" کا بھی خوف لگا ہوا ہے اور اس خوف سے کہ برے کاموں سے خدا ناراض ہوتا ہے، عبادت بجز گناہ سے خداوند کریم "شدید العتاب" ہے، وہ معاصی سے احتراز کرتا ہے اور ہر اس کام کو ہاتھ لگاتا ہے جو خدا کے عتاب کو دعوت نہ دیتا ہو۔ اس کا دوسرا مطلب یہ نکلا کہ "خوشنودی سے پہلے" "عتاب" کا ڈر لگا ہوا ہے یعنی "امید" سے قبل "خوف" کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ پس حقیقت میں اصل شے خوف ہی ہے، "امید" تو اس کا عکس ہے۔ یہ امید در حال ہمت کو باطل نہیں کرتا بلکہ یہ کہنا چاہتا ہوں کہ "خوف" امید کے مقابلے میں اولیت اور افضلیت رکھتا ہے۔ آگے چل کر خوف کی مختلف نوعیتوں پر بحث کی جائے گی تاکہ تصویر کا ہر رخ آپ کی نگاہوں کے سامنے آ جائے۔

ایک شخص آخرت میں محض روح و جسم کے حظ و کیف کے لئے نیک کام کرتا ہے، اس کے ہر سجدہ کی غرض و غایت اور اس کی ہر دانہ تسبیح کی ہر جنبش کا منتہا فردوس کی بہاریں اور جنت کی لذتیں ہوتی ہیں۔ اگر کوئی شخص اس عابد زاہد کو اس حقیقت سے مطلع کر دے کہ "تیری عبادت و ریاضت کا صلہ لذید فردوس اور کیفیات جنت کی صورت میں نہیں ملے گا بلکہ تجھ کو دوزخ کے شراروں اور جہنم کے انگاروں کی حرارت و التہاب کو بھی برداشت کرنا ہوگا" تو وہ عابد یک لخت تلملا اٹھے گا۔ لذائذ جنت کے حصول کا خیال اس کے دل و دماغ سے حرف غلط کی طرح مٹ جائیگا۔ اور شاید جہنم سے بچنے کی تدابیر میں مصروف ہو جائے۔ پس معلوم ہوا کہ "دفع مضرت" "جلب منفعت" سے کہیں زیادہ ضروری ہے اور "امید" کی تہہ میں "خوف" کار فرما ہوتا ہے۔ اور خوف کا جذبہ "امید" کے جذبہ سے زیادہ قوی اور برانگیختہ ہے۔

کوئی قوم اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی جب تک کہ افراد کے قلوب "تخریب" کے خوف سے نہ کانپ اٹھتے ہوں جب تک "بگڑنے" کا خوف نہ ہو گا بننے کی تدبیر کارگر نہیں ہو سکتی۔ جس قوم کو اپنی تخریب و تذلیل کا خوف (احساس) نہیں ہوتا وہ کبھی نہیں ابھر سکتی جب کوئی قوم ترقی کرتی ہے تو سب سے پہلے ان مصائب و مشکلات پر قابو پاتی ہے جو اس کی تخریب کر رہی ہوں اور کوئی ترقی یافتہ قوم کسی ایسے غیر مستحسن فعل کا اقدام نہیں کرتی جس کا نتیجہ "تخریب و تباہی" ہو۔ مختصر یہ کہ تخریب کا خوف ایک پست قوم کو بلند سے بلند تر بنا دیتا ہے۔ قوم و جماعت سے گزر کر افراد و اشخاص کی حیثیات کا مطالعہ کیجئے تو یہ حقیقت اور زیادہ نمایاں اور واضح طور پر نظر آئے گی۔ ایک کاشتکار زمین میں ہل چلاتا ہے، پانی دیتا ہے، فصل کی حفاظت کرتا ہے۔ بادی النظر میں سب یہی سمجھتے اور دیکھتے ہیں کہ کاشتکار کی تمام حرکات کا محور "امید" ہے مگر ہم ان سے افعال و حرکات کا جائزہ لینا چاہتے ہیں تاکہ امید کی حقیقت واضح ہو جائے۔ ہل چلانے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ زمین نرم و ملائم ہو جائے اور دانہ ابھرنے کا خاطر خواہ موقع مل سکے۔ وہ اس سے ڈرتا ہے کہ زمین کی کیفیت تبدیل نہ ہو، کھیت سخت رہے یا بیج ڈالنے کے بعد زمین کو نرم نہ بنائے۔ مگر وہ ایسی غلطی کبھی نہیں کرتا۔ کیونکہ اس کو اس بات کا "خوف" ہوتا ہے کہ زمین کے سخت پڑے رہنے سے پودے کو سرسبز نہ ہونے دیں گے۔ زمین جوتنے کے بعد جب اس کا یہ خوف دور ہو گیا تو اس نے آبیاری شروع کی، ممکن تھا کہ بیج اگ آنے کے بعد پودوں کو پانی نہ دیا جاتا۔ لیکن ایسی فروگذاشت کبھی ظہور پذیر نہیں ہوتی۔ اس "خوف" سے کہ کہیں پودے مرجھا نہ جائیں کھیت کو اس وقت تک پانی دیا جاتا ہے جب تک کہ پژمردگی کا خوف دور نہ ہو جائے۔ فصل جب پکنے کے قریب ہوتی ہے، تو اس کی حفاظت و نگہداشت کی جاتی ہے۔ اور پرندوں، جانوروں اور انسان کی دستبرد سے بچایا جاتا ہے۔ "فصل کے نقصان کا خوف" کسان سے کھیت کی حفاظت کراتا ہے۔ اور کوئی بدنصیب کسان "خوف" کی ان تمام منزلوں سے نہیں گزرتا تو اس کی آنکھیں لہلہاتی کھیتی کا کبھی نظارہ نہیں کر سکتیں اور وہ مدت العمر نامراد رہتا ہے۔ اس مثال سے دنیا کے دیگر افراد پر بھی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ "جذبۂ خوف" سے وہ کس درجہ متاثر ہوتے ہیں اور ان کی زندگی پر اس جذبہ کا کتنا اثر مترتب ہوتا ہے۔

علم ترقی نفس اور تہذیب حیات کے لئے حاصل کیا جاتا ہے مگر غور سے دیکھا جائے تو "حصول علم" سے پہلے ایک جذبہ میں بھی "خوف جہل" کا جذبہ نظر آئیگا۔ اگر جہل و لا علمی کا خوف دل سے دور ہو جائے تو پھر حصول علم کا جذبہ پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔ انسان جہالت کو انسانیت کی راہ میں رکاوٹ سمجھتا ہے اور اس خوف سے کہ کہیں اس کی انسانیت ناقص نہ رہ جائے وہ علم حاصل کرنے کے لئے مضطرب ہوتا ہے۔ ایک طالب علم نے اپنی استعداد کے مطابق بہت کچھ علم حاصل کر لیا اور اب اس کے دل سے جہل کا "خوف" دور ہو گیا۔ ممکن ہیں کہ بعض تجربہ کار اشخاص "خوف جہل" کے فقدان کو زیادہ اہمیت نہ دیں مگر حقیقت نگر حضرات کی نگاہ میں تو اس طالب علم کا مستقبل تباہ ہو گیا۔ اس کی ترقی رک گئی، اور انانیت کے جذبہ نے اسے "جہل مرکب" بنا دیا۔ اگر طالب علم کے دل میں "خوف جہل" ہوتا تو وہ حصول علم کی کوشش سے کبھی منہ نہ پھیرتا اور علم و فضل کی بلندیوں پر پہنچ کر دم لیتا۔ پس معلوم ہوا کہ جذبۂ خوف انانیت اور خودی کا دشمن ہے۔ بہت سے سرکش اور متمرد افراد نے خدائی کا دعویٰ کیا ہے۔ ان کے قلوب جذبۂ خوف کی حلاوت کی تاب کو زائل کر چکے تھے اور یہ کہا جا چکا ہے کہ جذبۂ خوف کا زوال کبر و انانیت تھو کمال کا مرادف ہے۔ بس یہ لوگ بے فکر ہو گئے کہ خدائی کا دعویٰ کر بیٹھے اور خوف کا وہ رابطہ جو بندہ کو خدا سے وابستہ رکھتا ہے قطع ہو گیا۔ خدائے قہار و جبار نے "خوف" دلانے کے لئے بہت سے انبیاء کو اپنا پیغام دے کر لوگوں کے ذریعہ بھیجے۔ جب ڈرانے والوں کے وعظ و تبلیغ پر بھی توبہ نہ کی تو ہواؤں کے جھکڑوں، مینڈکوں کے غول اور پانی کی موجوں کو "خوف" کا ذریعہ بنایا۔ تاکہ بندوں کے دلوں میں "خوف" پیدا ہو۔ فرعون میں "جذبۂ خوف" اس وقت نمایاں ہوا جب پانی کی ہولناک موجوں کو دیکھ کر "خوف" کا جذبہ ابھرا مگر اب تلافی کا وقت نہیں رہا تھا کاش یہ جذبہ کچھ دن قبل پیدا ہو جاتا تو بجائے ہامان، قارون، فرعون کے ابراہیم بن ادہم کی صف میں شامل ہوتا۔

. . . .

. . . .

. . . .

۲۱۹

ایک انسان کسی جرم کے ارتکاب سے صرف "خوفِ سزا" کے سبب اجتناب کرتا ہے۔ تمام تعزیری قوانین کا مقصد "خوف" دلانا ہے تاکہ امن وامان قائم رہے اور حدودِ انسانیت سے تجاوز نہ ہو جس شخص کا احساسِ خوف جس قدر قوی ہوتا ہے اُتنا ہی وہ معاصی و جرائم سے محترز رہتا ہے، جرائم پیشہ اقوام کی "حسِ خوف" مٹ جاتی ہے اور بڑے سے بڑا جرم کرنے میں عار نہیں ہوتا۔ جب جذبۂ خوف دل سے بالکل ہٹ جاتا ہے یا قلب میں اس جذبہ کے تخلیق کی صلاحیت باقی نہیں رہتی تو دل پتھر سے زیادہ سخت ہو جاتا ہے اور پھر کوئی نصیحت اثر نہیں کرتی، انسانیت کی تباہی کی یہ آخری منزل ہے، اس کے بعد انسانیت حیوانیت و درندگی سے بدل جاتی ہے۔ وہ مجرم جن کو کسی سنگین ترین جرم کی پاداش میں "حکمِ موت" سنایا جاتا ہے۔ حاکم کو گالیاں سُناتے ہیں۔ عدالت کے کمرہ کو سر پر اُٹھا لیتے ہیں۔ بیڑیوں اور ہتھکڑیوں کو آپس میں ٹکراتے ہیں۔ قید خانے کے ہر قانون کی خلاف ورزی کرتے ہیں، حالانکہ "سزائے موت" سنائے جانے سے پہلے یہی مجرم عدالت میں آکر حاکم کو مؤدبانہ سلام کرتے تھے، سپاہیوں سے نرمی کے ساتھ گفتگو کرتے تھے۔ قید خانہ کے تمام قوانین کی پابندی کو انہوں نے خود پر لازم کر لیا تھا۔ مگر اب چونکہ ان کے دل سے "خوف" جاتا رہا لہذا تمام قوانین و ضوابط کو بالائے طاق رکھ کر لاقانونیت پر اُتر آئے۔

خوف غضب اور بُزدلی کا فرق

خوف اور غضب کے جذبہ میں اتنا بیّن فرق ہے جس پر روشنی ڈالنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ خوف اور غضب کے محرکات چونکہ ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں لہذا خوف و غضب کا اختلاف بھی لابد و ضروری ہے۔ کیونکہ محرک کا اختلاف متحرک پر اثر انداز ہوتا ہے ان تمام بدیہات کے باوجود آؤ لگے ہاتھوں اس سلسلہ پر تھوڑی بہت روشنی ڈال ہی دیں۔ ارتکابِ جرم کے وقت دل میں "خوف" پیدا ہوتا ہے "غضب" پیدا نہیں ہوتا۔ جذبۂ خوف سے انسان کا قلب ہر وقت لبریز رہتا ہے مگر قوتِ غضبی خوابیدہ رہتی ہے کبھی کبھی سرزد تا بیدار ہو جاتی ہے۔ خوف عبدیت کی امتیازی خصوصیت اور غضب (حقیقی) صفتِ ربانی ہے۔ خوف کا جذبہ اگرچہ بہت قوی جذبہ ہے۔ مگر بعض اوقات قوتِ غضبی جذبۂ خوف پر غالب آجاتی ہے بعض حالات کے تحت، انسان کی رگِ حمیت و غیرت تڑپ اُٹھتی ہے، جس کے بعد انسان غیر معمولی طور پر غضبناک ہو جاتا ہے، ایسی حالت میں انسان سے ایسی حرکات سرزد ہو جاتی ہیں جن کی سزا موت تک ہو سکتی ہے اس صورت میں قوتِ غضب جذبۂ خوف پر غالب آگئی۔

خوف اور بُزدلی میں بظاہر قدرے اشتراک و ربط پایا جاتا ہے لیکن فی الحقیقت ان میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ خوف فطری جذبہ ہے اور بُزدلی شخصی جذبہ ہے، فطرتِ انسانی کی عمومیت سے اس کا کوئی علاقہ نہیں ہے بُزدلی کا جذبہ نفس کے رذیل ملکات اور ذمیم عادات میں شامل ہے۔ ایک شخص شیر کو دیکھ کر خوفزدہ ہو جاتا ہے، اس کو "بزدلی" نہیں کہہ سکتے۔ شیر خونخوار جانور ہے اور انسان سے زیادہ طاقتور لیں حفاظتِ جان کا خیال انسان پر خوف طاری کر دیتا ہے۔ اس "خوفزدگی" کے مدارج مختلف ہیں وحشی اقوام کے افراد شیر کو دیکھ کر صرف چوکنے ہو جائیں گے شکاری پر معمولی سی گھبراہٹ ہوگی اور وہ شخص جس نے اس سے قبل شیر کو نہ دیکھا ہوگا، خوف سے کانپنے لگے گا۔ بعض لوگ چور کو دیکھ کر کانپ اُٹھتے ہیں، سانس پھول جاتی ہے، حواس مختل ہو جاتے ہیں، اس کو "بزدلی" سے تعبیر کیا جائیگا، چور ایک ذلیل انسان ہے اُس کا ضمیر مجرم ہوتا ہے جس کے سبب وہ خود "تذبذب" اور "شدید گھبراہٹ" کی حالت میں ہوتا ہے، لہذا ایسے شخص سے ڈرنا فطرتِ انسانی کے خلاف ہے۔ مسلح ڈاکوؤں کی ٹولی کو دیکھ کر حفاظتِ جان کے لئے بچنے کی کوشش کرنی چاہئے اور اگر آدمی تنہا ہو تو مقابلہ کرنا سخت حماقت اور خودکشی کے مرادف ہے لیکن اس کے یہ معنی بھی نہیں ہیں کہ ان بدمعاشوں کو دیکھ کر ہاتھ پیر پھول جائیں، ایسی حالت میں اگر کوئی بدحواس ہو جائے تو اس کو بزدل کہا جائے گا۔ بعض لوگ شیر سے نہیں ڈرتے۔ جنگلوں میں بے خوف گھومتے پھرتے ہیں ڈاکوؤں کا مقابلہ کرتے ہیں مگر "چھپکلی" "کتے" یا مینڈک کو دیکھ کر ڈر جاتے ہیں، اس حالت کو "بزدلی" نہیں کہا جائے گا کیونکہ کسی خاص واقعہ کے سبب ان چیزوں کی دل میں دھاک بیٹھ گئی ہے اور فی نفسہ فطرتِ انسانی کا جوہرِ شجاعت زائل نہیں ہوا ہاں ایسا شخص جس نے کبھی خطرات کا مقابلہ نہیں کیا، جنگلوں میں نہیں گھوما، امن و اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کی اگر چھپکلی، یا مینڈک سے ڈرتا ہے، تو اس کو "بزدل" کہا جائیگا کیونکہ اس کی یہ حرکت جوہرِ فطری پر اثر انداز ہوتی ہے اور وہ خطرات کا مقابلہ کرنے میں ہمیشہ ڈرپوک ثابت ہوگا۔

کسی بادشاہ، امیر یا حاکم کو دیکھ کر ڈر جانا "بزدلی" ہے، ایسا کمزور انسان فی نفسہ ضمیر و قلب کی قوت کو بڑی حد تک زائل کر چکا ہے، اس قسم کا جذبہ فطرتِ انسانی کی ضد ہے ایک انسان کو کسی دوسرے انسان سے ہرگز خوف نہ کرنا چاہئے چاہے وہ "تختِ طاؤس" پر کیوں نہ بیٹھا ہو، اور "کوہ نور" اس کے تاج میں جگمگا رہا ہو، کسی انسان سے ڈرنے کے یہ معنی ہیں کہ خوف وہ مقدس جذبہ جو صرف "خدا" کے لئے مخصوص تھا فنا ہو گیا اور انسانیت بڑی حد تک ذلیل ہو گئی یہ ناپاک جذبہ جب قلب میں بار بار پیدا ہوتا ہے تو پھر انسان خود کو نہایت ہی ذلیل اور کمزور سمجھنے لگتا ہے اور اس جذبہ کا رسوخ و استحکام "پرستش" کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔

بچّہ اور صنفِ نازک

چھوٹا بچہ فطرتِ صحیحہ کا حامل ہوتا ہے اُس کو آپ کسی باسطوت بادشاہ کے پاس لیجائیے یا مسلح ڈاکو کے سامنے۔ ہرگز نہیں ڈرے گا ہاں خونخوار درندوں آگ کے شعلوں ریل کی گھڑگھڑاہٹ سے اُس کو خوف معلوم ہوگا اور یہ طبعی چیز ہے۔ مگر افسوس کہ گھر کی عورتیں ڈراؤنے قصے سُنا سُنا کر اُس کو زبردستی "بزدل" بنا دیتی ہیں اگر اس کی صحیح تربیت کی جائے اور گھر والے "خوف و بزدلی" کے فلسفہ سے واقف ہوں اور اُس پر عامل بھی ہوں تو سنِ رُشد کو پہنچنے کے بعد یہ بچّہ بہادر ثابت ہوگا۔ اور بزدلانہ حرکات ظہور میں نہ آئیں گی۔

عورت کے جذبات مرد کے مقابلہ میں لطیف تر ہوتے ہیں مگر فطری طور پر وہ بزدل نہیں ہوتی، ہاں یہ ضرور ہے کہ جس چیز کو دیکھ کر فطری طور پر مرد کو قدرے گھبرا جانا چاہئے اُس کے دیکھنے سے عورت کیکپا جائے گی، عورت فطری طور پر "حسن و نزاکت" کو مرد سے زیادہ پسند کرتی ہے، لہذا تمام ایسے مناظر جو ہیبت ناک اور خشونت لئے ہوتے ہیں، اُن کے نظارہ سے عورت کو دہشت سی ہوتی ہے اور بعض اوقات یہ وحشت

"خوف" کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔ شب کے سناٹے میں کالی گھٹاؤں کی چلمن سے بجلی کی چمک کو دیکھکر ایک حسین عورت سہم جاتی ہے۔ اس کو "بزدلی" سے تعبیر کرنا ایک ایسا شدید جرم ہے جو غالباً ناقابلِ عفو ہے۔ عورت کے سہم جانے کا یہ منظر اس درجہ اثر انگیز ہوتا ہے کہ جس کو دیکھکر بڑے بڑے صاحبانِ جرأت و ہمت بے دل ہو جاتے ہیں۔ جو لوگ اس کو "بزدلی" سمجھتے ہیں ان کے متعلق سوائے اس کے اور کیا کہوں، ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں"

خطرات اور اصنافِ انسان

چین و جاپان کے لوگ عموماً بزدل ہوتے ہیں۔ چینی اپنی بزدلی کا اظہار بہت جلدی کر دیتے ہیں، مگر جاپانی ملمع کاری سے کام لیتے ہیں۔ گورکھا [illegible] ہوتا ہے لیکن اگر ہتھیار پاس نہ ہوں تو بھیگی بلی بن جاتا ہے۔ افغانی ہمیشہ خطرات کے مقابلہ کرنے میں لذت محسوس کرتا ہے۔ ایرانی خطرات سے بچنے کے لئے حکمت عملی سے کام لیتا ہے۔ ترک ہر وقت کفن سر سے لپیٹے رہتے ہیں۔ عرب موت کو حیات سمجھتے ہیں۔ انگریز خطرہ کے وقت حواس کو مختل نہیں ہونے دیتا۔ اس کے پاس خطرات سے نجات کے لئے "ڈپلومیسی" کی بحکدار ڈھال ہوتی ہے۔ فرانسیسی اس معاملہ میں یک رنگ نہیں ہوتا کبھی خطرہ کے وقت محاذ پر جما رہتا اور کبھی لومڑی کی طرح فرار ہو جاتا ہے۔ جرمن اور [illegible] بہت جوشیلا ہوتا ہے اور اسی جوش کے سبب خطرات میں کود پڑتا ہے۔ ہندوستانی خطرات کا مقابلہ کرنے میں افغانی کی طرح لذت محسوس نہیں کرتا مگر وقت پڑنے پر پیچھے بھی نہیں ہٹتا۔ جوش و غضب کی حالت میں وہ بپھرے ہوئے شیر کی مانند ہوتا ہے۔ مگر آہ! ان دنوں اس کی حالت کا تصور بھی پریشان کن ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس کا جواب نظیری کی زبان سے سنئے۔

دیدنش بر دیدنِ من حسرتِ دیگر فزود
خواستم پیکان بر آرم از جگر نشتر شکست

خوف کے اثرات

خوف خدا سے دل میں انشراح پیدا ہوتا ہے اور یہ حالت ہمیشہ روح افزا ثابت ہوتی ہے۔ تنہائی میں ڈراؤنے منظر کو دیکھکر دل میں سختی سی پیدا ہوتی ہے۔ خوف کے وقت محرکاتِ خوف کے اختلاف کے اعتبار سے دل کی کیفیات میں بھی اختلاف ہوتا ہے۔ بعض وقت دل بیٹھا جاتا ہے۔ بعض وقت ڈوبنے لگتا ہے۔ کبھی غیر درست حرکت ہوتی ہے۔ کبھی جمود طاری ہو جاتا ہے۔ کبھی "دھک دھک" ہوتی ہے۔ کبھی کلیجہ میں چبھن سی محسوس ہوتی ہے۔ بعض وقت رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پسینہ آ جاتا ہے۔ رگوں میں تشنج پیدا ہو جاتا ہے۔ بدن کانپنے لگتا ہے۔ "رعب و حسن" کو بھی خوف کی ایک شق کہہ سکتے ہیں مگر اس کی خصوصیت کون بیان کرے۔ نظیری نیشاپوری نے تو اس داستان کو یک شعر میں بیان کیا ہے۔

ہیبتِ حسنش کسے را رخصتِ آمد نداد
گرچہ بر خود داد خوابے بود او تنہا گذشت



(۱)

اے بے قرار کوئل!

برسات کی سہانی، راتوں کی تیرگی میں
سوئی ہوئی فضا کی نمناک دلکشی میں
تو کر رہی ہے دل کے رازوں کی ترجمانی
آواز میں ہے مدھم دریاؤں کی روانی
نغموں میں بہ رہی ہے جذبات کی کہانی

(۲)

اے دل فگار کوئل!

آنکھوں میں پھر رہے ہیں گذرے ہوئے زمانے
بچھڑی ہوئی محبت، بھولے ہوئے فسانے
موہوم آرزوئیں، معصوم شادمانی
بیدار ولولوں کی، جاں بخش کامرانی
خوابوں کی سرزمیں میں کھوئی ہوئی جوانی

(۳)

اے سوگوار کوئل!

تو روحِ عاشقی کی بھٹکی ہوئی فغاں ہے
دُکھتے ہوئے دلوں کی مغموم داستاں ہے
جیسے کوئی حسینہ فریاد کر رہی ہو
بچھڑے ہوئے پریتم کو یاد کر رہی ہو
رو رو کے زندگانی برباد کر رہی ہو

ذوقی

ضبطِ تولید

مسئلہ کا دوسرا رُخ

مسئلہ ضبطِ تولید پر احمدی صاحب کے مضمون کے بعد خان صاحب خواجہ لطیف احمد علی کا مضمون شائع کیا جاتا ہے۔ جو احمدی صاحب کے مضمون کا جواب تو نہیں ہے لیکن ان کے نقطۂ خیال کی [illegible] خواجہ لطیف احمد صاحب [illegible] اور [illegible] ادیب ہیں اور آپ نے ایک مبسوط کتاب [illegible] لکھی ہے۔ یہ مضمون دراصل اس کا دیباچہ ہے جس میں ضبطِ تولید کی تردید میں سیاسی اور عقلی دلائل پیش کئے گئے ہیں۔ چونکہ وقت کا اہم [illegible] ہے اس لئے [illegible] بہتر موقع ہے اس مسئلہ پر روشنی ڈالی جائے گی۔ آخر میں ہم خان صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ وہ ایشیا پر اسی طرح کرم فرماتے رہیں گے۔ (ایڈیٹر)

ضبطِ تولید کے مسئلہ پر ہندوستان میں بھی کچھ عرصہ سے بہت کچھ غور اور بحث جاری ہے مضامین لکھے گئے۔ کتابیں تصنیف ہوئیں۔ اخبارات میں بحث مباحثہ کا سلسلہ رہا صوبہ کی کونسلوں میں بھی تجاویز اور قانون پاس کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ مختلف مقامات میں مردانہ اور زنانہ انجمنوں میں مباحثے ہوئے لیکن یہ سب کچھ انگریزی زبان میں ہوا کسی ملکی زبان میں جہاں تک مجھے علم ہے اس مسئلہ پر نہ کوئی مضمون لکھا گیا اور نہ کوئی کتاب شائع ہوئی۔ حالانکہ ضرورت زیادہ تر اس بات کی تھی کہ خواص سے گزر کر عوام کے طبقہ میں اس مسئلہ کی اشاعت کی جائے اس لئے کہ کثرتِ پیدائش کی عوام اور مزدور پیشہ طبقوں میں ہے۔ اس کے مقابلہ میں متموّل اور تعلیم یافتہ طبقہ میں بہت کم ہے۔

مختصراً اس مضمون پر تین نقطۂ خیال سے نظر ڈالی جا سکتی ہے۔ اول اقتصادی دوسرے سیاسی تیسرے مذہبی۔ اقتصادی سے میری مراد مسئلۂ آبادی ہے۔ انسانی آبادی کے بڑھنے کی رفتار بقول مالتھس اس قدر تیز ہے کہ اگر کوئی غیر معمولی رکاوٹ پیدا نہ ہو۔ اور شرحِ اموات معمول سے زیادہ نہ بڑھے تو کسی ملک کی آبادی پچیس برس کے عرصہ میں دگنی ہو جانی چاہئے لیکن قدرتی اسباب آبادی کو روکنے میں حائل ہوتے رہتے ہیں وبائی امراض جنگ اور قحط۔ یہ تین قدرتی اسباب ایسے ہوتے ہیں جن سے کسی ملک کی آبادی اس رفتار سے نہیں بڑھنے پاتی کہ پچیس برس کی مدت میں دگنی ہو جائے اس میں شک نہیں کہ اگر یہ قدرتی رکاوٹیں پیش نہ آتی رہتیں تو اب تک کرۂ ارض پر چپہ بھر زمین بھی ایسی نہ باقی رہتی جس پر انسان آباد نہ ہوں۔

آبادی کی اس رفتار کے ساتھ یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ جس نسبت سے آبادی بڑھتی ہے اس نسبت سے زمین کی پیداوار جس پر انسان کی زندگی کا دارومدار ہے نہیں بڑھتی باوجود زمانۂ حال کی نئی تحقیقات کے جو زراعت کی ترقی اور پیداوار کو بڑھانے میں بہت کچھ مدد ہوئی ہے یہ ممکن نہیں نظر آتا کہ زمین کی پیداوار اتنی ترقی کر سکے کہ آبادی کی بڑھتی ہوئی نسبت کے ساتھ مقابلہ کر سکے۔ اگرچہ بعض ماہرینِ فنِ زراعت اس بات کے مدعی ہیں کہ انسان کی آبادی خواہ کسی رفتار سے بڑھتی رہے یہ بالکل ممکن ہے کہ زمین کی پیداوار اس سے دگنی چوگنی رفتار سے بڑھائی جا سکے۔ اور یہ خوف بالکل بے بنیاد ہے کہ کبھی دنیا کی آبادی اتنی زیادہ ہو جائے کہ اس کے پیٹ بھرنے کے لئے غذا میسر نہ آسکے۔

قدرتی رکاوٹیں جو مالتھس نے کسی زمانہ میں قرار دی تھیں اُن کا انسداد انسان نے بہت کچھ کر لیا ہے۔ وبائی امراض کی روک تھام اور علاج ایسے ایسے دریافت ہوئے ہیں جن سے ان کی مضرت اور انسانی ہلاکت بہت کم ہو گئی ہے۔ اس طرح سے جنگ کو روکنے کے لئے "لیگ آف نیشنز" کا قیام بھی ایک حد تک معتبر قرار دیا جا سکتا ہے۔ قحط کا اثر کسی ملک پر اب مہلک نہیں ہو سکتا اس لئے کہ ذرائع آمد و رفت ایسے زود رفتار ہو گئے ہیں کہ اشیا ملک میں نہایت تیزی اور سرعت کے ساتھ پہنچائی جا سکتی ہیں غرض ان قدرتی اسباب ہلاکت کا انسداد بہت کچھ ہو گیا ہے

مالتھس نے ان اسبابِ ہلاکت سے بچنے کا ذریعہ یہ بھی قرار دیا تھا کہ آبادی کو اس رفتار سے نہ بڑھنے دیا جائے جس رفتار سے قدرتاً اسے بڑھنا چاہئے اور اس کا ذریعہ اس نے "ضبطِ تولید" بتایا تھا۔ اس وقت ضبطِ تولید کے وسائل جو آج معلوم ہیں اُن سے دنیا واقف نہ تھی اور صرف اخلاقی رکاوٹ یعنی مرد کا عورت سے اجتناب ہی ایک ذریعہ ایسا بتایا گیا تھا جس سے اولاد کی پیدائش بند ہو سکتی ہے۔ لیکن اب عرصہ ہوا بہت سے ایسے ذرائع معلوم ہو گئے ہیں جن پر عمل کرنے سے اولاد پیدا نہ ہو۔ چنانچہ یورپ میں ان پر بہت کچھ عمل کیا گیا ہے اور اس میں کامیابی ہوئی۔ تاہم یہ امر بھی ظاہر ہے کہ دنیا کے ہر ملک کی آبادی باوجود ان قدرتی اسبابِ ہلاکت اور ضبطِ تولید کے عمل کے پھر بھی بڑھ رہی ہے یورپ کی آبادی جو اپنے ملکوں میں نہیں سما سکتی وہ دوسرے نئے آباد ممالک اور جزائر میں جا کر آباد ہو رہی ہے آسٹریلیا امریکہ جنوبی افریقہ اور بہت سے جزائر ایسے ہیں جہاں یورپ کی قومیں جا کر آباد ہو گئی ہیں خود ہندوستان کی بڑھتی ہوئی آبادی کے بہت سے لوگ مختلف ممالک میں چلے گئے ہیں جنوبی افریقہ میں جیسے ٹرانسوال اسٹریٹ سیٹلمنٹس میں کینیا میں، ماریشس میں غرض جہاں کچھ ذریعہ معاش کی راہ نکلتی ہے چلے جاتے ہیں لیکن پھر بھی ہندوستان کی آبادی گزشتہ مردم شماری کی رو سے دس فیصدی کی رفتار سے گزشتہ دس سال کی مدت میں بڑھ گئی ہے اگر یہی رفتار قائم رہی تو یہ مسئلہ قابلِ غور ہے کہ آیا زمین کی پیداوار اتنی کافی ہو سکے گی کہ اس بڑھتی ہوئی آبادی کا پیٹ بھر سکے۔

ہر طرف سے یہ آواز آ رہی ہے کہ ہندوستان میں افلاس روز بروز بڑھ رہا ہے اس کے اسباب کیا ہیں۔ یہ ایک پیچیدہ مسئلہ ہے اور یہاں اس کے متعلق بحث کی گنجائش نہیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ آیا اس افلاس کی وجہ ہندوستان کی آبادی کی زیادتی بھی ہے۔ ہمارے ملک میں جو لوگ [illegible] اور [illegible] مبتلائے افلاس ہیں [illegible] بعنوان حال ہے [illegible] سے اختیار کرتے ہیں کہ اس افلاس کی [illegible] صرف اس حقیقت کا اظہار کرنا منظور ہے [illegible]

223

ہے۔ افلاس میں مبتلا ہے۔ یہاں تک کہ فاقوں مرنے کی نوبت پہنچ گئی ہے پس ہم یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہیں کہ زمین کی پیداوار اور آمدنی اور ہندوستان کی آبادی کی رفتار ترقی میں توازن نہیں رہا۔ اس سے زیادہ ہمیں بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔

اسی امر کو پیش نظر رکھتے ہوئے ضبط تولید کی آواز بلند ہوئی ہے اور اس کا مطمح نظر صرف یہی ہے کہ ہندوستان کی اقتصادی حالت میں توازن قائم کیا جائے اور ملک کے بڑھتے ہوئے افلاس کا سدّ باب کیا جائے۔

اب ہم اس مسئلہ پر دوسرے نقطۂ خیال سے نظر ڈالتے ہیں۔ ایک گروہ سیاسی طبقہ کا ایسا ہے جو ہر فرقہ اور جماعت کا اصلاحات ملکی میں حصہ ٹھہرانا چاہتا ہے۔ اور چونکہ یہ حصّے تناسب آبادی کے مطابق قرار دئے گئے ہیں۔ اس لئے اس خیال کا حامی ہے کہ وہ فرقہ جو اصلاحات ملکی میں زیادہ حصہ لینے کا خواہشمند ہے۔ وہ اپنے فرقہ کی آبادی بڑھانے کی کوشش کرے[1]۔ مثلاً ہندو پولٹیکل لیڈر۔ نیچ ذات کے فرقوں کو اپنی آبادی میں شمار کرانے کی سعی بلیغ کر رہے ہیں۔ اور جب وہ اپنے حقوق کا جداگانہ مطالبہ کرتے ہیں۔ تو اُن کو یہ کہکر تسلّی دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ تم تو ہماری جماعت اور ہمارے مذہب میں شریک ہو۔ یا اُن صوبوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں اس بات کو فراموش نہیں کرسکتے کہ اگر ان کی آبادی اس صوبہ میں کم نہ ہوتی تو ان کا حصہ صوبہ کی کونسلوں وغیرہ میں اس قدر کم نہ ہوتا جتنا اب ہے۔ یہی حال ان فرقوں کا ہے جو اقلیت میں ہیں بہرحال یہ خیال کہ اپنے فرقہ کو بڑھانے کی کوشش کرنی چاہئے؟ ہر اقلیت فرقہ کے دل میں جاگزیں ہے اور یہ خیال ضبط تولید کے مسئلہ کے منافی ہے۔

یہاں ایک یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کسی فرقہ یا قوم کی سیاسی قوت محض اس کی کثرت تعداد پر منحصر ہے۔ یا اِس کے تموّل۔ تہذیب و شائستگی اور علم و ہنر پر۔ ہماری آنکھوں کے سامنے وہ طبقہ جو نیچ ذات کہلاتا ہے موجود ہے۔ ان کی تعداد مردم شماری کے لحاظ سے کروڑوں تک ہے اور اگر ان کو اہل ہنود سے الگ کرلیا جائے تو خود ہنود جو اس وقت آبادی کے لحاظ سے غالب طبقہ سمجھا جاتا ہے۔ اقلیت میں ہوجاتا ہے اس طبقہ کی قوت سیاسی آبادی کے لحاظ سے جو کچھ بھی ہے وہ پوشیدہ نہیں۔ برخلاف اس کے پارسی قوم کس قدر تعداد میں ہندوستان میں موجود ہے۔ لیکن ان کا اثر ان کی وجاہت۔ اُن کا تموّل اُن کو ہر جگہ پیش پیش رکھتا ہے۔ پس محض کثرت تعداد کسی فرقہ یا قوم کی زندگی میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی اسی قوم کا دنیا میں عزت و وقار کیا جاتا ہے جو علم و ہنر سے بہرہ ور ہو۔

تیسرا نقطۂ خیال مذہبی ہے۔ عیسائی۔ مسلمان۔ ہندو۔ ہر مذہب کا پیشوا ہمیشہ سے ضبط تولید کے اصول اور عمل کا مخالف رہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اگر قانون قدرت کے مطابق ہم مقصد حیات پر نظر ڈالیں تو ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ ہر جنس کا مقصد حیات اس قدرت سے نباتاتی ہو یا حیوانی اپنی جنس کی پیدائش اور اس کی ترقی ہے اور یہی مقصد حیات اس شدت سے دنیا میں عمل پیرا ہے کہ اس کا نتیجہ ہم ہر جگہ کشاکش حیات میں دیکھتے ہیں۔ اگر مذہبی اصول قانون قدرت کے مطابق ہیں تو مذہبًا اور قانون قدرت کے مطابق ضبط تولید کا اصول اور عمل کسی طرح جائز نہیں قرار دیا جاسکتا۔ اسی بنا پر پادریوں، مولویوں، پنڈتوں کی مخالفت بالکل بجا اور درست ہے۔

لیکن قابل غور یہ امر ہے کہ زمانۂ حال کی کشمکش حیات اور عوام کی اقتصادی حالت کا اقتضا کیا ہے؟ کیا ایک مزدور یا ایک محدود آمدنی والا شخص یہ برداشت کرسکتا ہے۔ کہ ہر سال اِس کے گھر میں ایک بچہ پیدا ہوتا رہے؟ کیا ایک غریب شخص کثرتِ اولاد کا متحمل ہوسکتا ہے؟ دیکھنا یہ ہے کہ بچّوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت کے بار کو ایک متوسط درجہ کا شخص کس حد تک برداشت کرسکتا ہے؟ کیا یہ بات غیر واجب ہوگی کہ وہ اسی حد تک اولاد پیدا کرے جس حد تک وہ اس بار کو اُٹھا سکتا ہے؟ ہر سمجھدار شخص یقیناً یہی کہے گا کہ ایک ذمہ دار انسان کے لئے لازمی ہے کہ وہ اولاد کی پیدائش اُسی حد کے اندر محدود رکھے جس حد تک وہ اولاد کی تعلیم و تربیت اور پرورش کے اخراجات کا متحمل ہوسکتا ہے؟

سوائے اس کے ہم دیکھتے ہیں کہ متوسط اور غریب طبقہ کی عورتیں کثرت تولید کے سبب کمزور نحیف اور گوناگوں امراض میں مبتلا رہتی ہیں اور اُن میں ایسے امراض عام طور پر پائے جاتے ہیں جو ان کی ہلاکت کا سبب ہوتے ہیں۔ دق کا مرض ہندوستان کی عورتوں میں عام ہوگیا ہے اور اس میں زیادہ تر وہی عورتیں مبتلا پائی جاتی ہیں جن کی قوتِ تولید پر حد سے زیادہ بار پڑتا ہے۔

ہندوستان میں جس قدر اموات عورتوں کی تولید کے وقت ہوتی ہیں وہ کوئی پوشیدہ امر نہیں ہے۔ اس کی زیادہ تر وجہ یہی ہوتی ہے کہ کثرتِ تولید کے باعث اِن کی صحت خراب اُن کے اعضا کمزور اور ان کی جسمانی قوت اس درجہ زائل ہوجاتی ہے کہ وہ اس صدمہ کو جو تولید کے وقت ان کے جسم کو پہونچتا ہے برداشت نہیں کرسکتیں اور قبل از وقت موت کا شکار ہوجاتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس جسمانی کمزوری کا ایک بڑا سبب ہندوستان میں کم سنی کی شادی بھی ہے اور پھر اس پر متواتر کثرت کے ساتھ تولید کی مصیبت ان کو قبل از وقت لبِ گور پہونچا دینے کا باعث ہوتی ہے۔

اسی سلسلۂ اسباب میں یہ بھی سب لوگ جانتے ہیں کہ نوزائیدہ بچّوں کی اموات کی ہندوستان میں کس قدر زیادتی ہے۔ کمزور ماؤں سے کمزور بچّوں کا پیدا ہونا لازمی ہے اور ایسے نحیف و نزار بچّوں کی زندگی چند روزہ نہ ہو تو کیا ہوگی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عورتوں اور بچّوں کی اس کثرت سے ہلاکت کا ذمہ دار کسے قرار دیا جاسکتا ہے؟ بلاشبہ اگر انسان اپنی سمجھ اور عقل سے کام لے تو وہ ان اسباب کو جو اس ہلاکت کا موجب ہیں روکنے کی ذمہ داری محسوس کرے گا۔ اور اس احساس کا نتیجہ سوائے اس کے کچھ نہیں ہوسکتا کہ وہ ضبط تولید پر عمل پیرا ہو۔

ہمیں بحیثیت ایک مسلمان ہونے کے یہ دیکھنا ہے کہ مذہب اسلام ضبطِ تولید کو کہاں تک جائز یا ناجائز قرار دیتا ہے۔ مذہبًا اسقاطِ حمل اس وقت تک جائز ہے ماں کے پیٹ میں بچہ انسانی صورت اختیار نہ کرلے۔ یا دوسرے الفاظ میں اس میں جان نہ پڑ جائے البتہ جب جنین انسانی صورت میں بڑھ جائے اور اس میں جان پڑ جائے تو اسقاط حمل نہ صرف ناجائز بلکہ ایک گناہ عظیم ہوجاتا ہے۔ احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے عزل جائز قرار دیا ہے اور اس فعل کو بُرا نہیں سمجھا گیا چنانچہ یہ عمل اسلامی دنیا میں رائج تھا۔ بالخصوص

---

[1] خواجہ صاحب اس حقیقت سے تو انکار نہیں فرما سکتے کہ اچھوت اقوام ہندو جسم ہی کا ایک ماؤف حصہ ہیں۔ مذہبی اور سماجی تقسیم اور برہمن ازم کی خود غرضانہ کارفرمائیوں نے ان کو ان حالوں پہنچایا۔ اب اگر ہندو قوم اپنے ماؤف حصہ جسم کی صحت کی طرف رجوع ہوئی ہے تو اس کو محض سیاسی مصالح پر مبنی خیال کیوں کیا جائے اس کو انسانی خدمت بھی تو کہا جا سکتا ہے
رہی اس باب میں اس کی کامیابی سو یہاں اس سے بحث مقصود نہیں۔ (شاکر)

کنیزوں اور لونڈیوں کے ساتھ اس عمل کے جواز کا بہت زیادہ پتہ چلتا ہے (ملاحظہ ہو مشکوۃ شریف۔ باب المباشرۃ) ہمیں صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ ضبط تولید کا اصول مذہباً ناجائز نہیں۔ اگر کوئی شخص کثرت سے اولاد پیدا کرنے کی ذمہ داری محسوس نہیں کرتا تو ہم ایسے شخص کو اپنا مخاطب نہیں بناتے۔ ہمارے پیش نظر تو صرف وہ لوگ ہیں جو اولاد کی زیادتی سے پریشان ہیں ان کی پرورش اور تعلیم و تربیت سے بسبب ناداری معذور ہیں وہ ایسے ذرائع کے جویا ہیں جن سے اولاد کی کثرت پیدائش کو روکا جا سکے۔

اطباء اسلام نے بہت سی ایسی ترکیبیں ایجاد کیں اور نسخے دریافت کئے جو ضبط تولید کے کام میں لائے جاتے تھے۔ چنانچہ علی ابن سینا، علی ابن عباس وغیرہ مشہور اطبا نے بہت سی ایسی دوائیں اور ترکیبیں بتلائی ہیں جن سے حمل کا قرار پانا روکا جا سکتا ہے۔

ہمارے خیال میں ان تمام امور کو پیش نظر رکھکر جو مختصراً اوپر بیان کئے گئے ہیں ہندوستان کے باشندوں کے لئے عموماً اور مسلمانوں کیلئے بالخصوص یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ضبط تولید کے اصول اور عمل کو عام طور پر رواج دیا جائے مسلمانوں کا روزافزوں افلاس اس امر کا مقتضی ہے کہ ہم اولاد کی کثرت پیدائش کو روکنے کے ذرائع اختیار کریں یک متوسط الحال شخص جس کی آمدنی پچاس اور سو روپیہ ماہانہ سے زیادہ نہ ہو زیادہ سے زیادہ دو تین بچوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت کا بار اٹھا سکتا ہے۔ مزدور پیشہ جماعت اس وقت ہمارے پیش نظر نہیں ہے اس لئے کہ اس طبقہ کے لوگوں کی زندگی کا معیار اس حد تک ہوا ہے کہ تم اس کو وانی زندگی سے ذرا بھی بالاتر نہیں سمجھتے۔ بلا شبہ یہ طبقہ قابل رحم ہے ان کی زندگی کے مصائب اور تکالیف لاتعداد ہیں لیکن اس طبقہ کو بار جو کثرت پیدائش وہ پریشان کن حالات پیش نہیں آتے جو ایک متوسط الحال شخص پر گزرتے ہیں اس لئے کہ ایک مزدور پیشہ شخص اپنی اولاد کو بھی ابتدائے عمر میں مزدوری پر لگا دیتا ہے اور اپنا معیار زندگی اپنی آمدنی سے بڑھنے نہیں دیتا۔

ہماری آنکھوں کے سامنے بہت سے ایسے اصحاب ہیں جن کی آمدنی محدود ہے لیکن گھر میں ہر سال یا دوسرے سال ایک بچہ پیدا ہو جاتا ہے۔ بچہ پیدا ہونے کے وقت اخراجات اور بیماری کا سلسلہ جو بیوی اور بچہ کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے۔ وہ علیحدہ پریشان کرنے والا ہوتا ہے۔ ایسے متوسط الحال اشخاص کثرت اولاد کے سبب اپنی حیثیت اور اپنے درجہ سے گرتے جا رہے ہیں ان کا معیار زندگی گھٹ رہا ہے اور بیکاری جس کی عام شکایت ہے وہ اس طبقہ پر بالخصوص ایسی مسلط ہو رہی ہے کہ وہ رفتہ رفتہ مزدور پیشہ کے طبقہ میں شامل ہوتے جا رہے ہیں۔ پس مسلمانوں کی قوم کے لئے یہ ایک عظیم خطرہ ہے جب اس میں متمول گروہ مفقود ہوتا جا رہا ہو متوسط الحال طبقہ مزدور پیشہ میں منتقل ہو رہا ہو تو اس کا نتیجہ آئندہ جا کر اس کے سوا کچھ نہ ہوگا کہ مسلمانوں کی قوم ایک مزدور پیشہ جماعت ہوگی اور ان کا شمار انہی اقوام میں ہوگا جو اب نیچ ذات اور ادنیٰ طبقے سمجھے جاتے ہیں۔ اس خطرہ کو پیش نظر رکھکر ہمارا قومی اور اخلاقی فرض یہ ہو جاتا ہے کہ ہم اپنے ذرائع آمدنی کے مطابق اور مناسب اولاد پیدا کریں اور کثرت اولاد کو ضبط تولید سے روکیں

ناقوسِ حقیقت

یہ کعبہ و دیر یہ کلیسا سب نذر
یہ مولوی پنڈت اور صوفی زاہد
کچھ وہم کے بت ہیں اور کچھ پتھر کے
عالم بت خانہ اہل عالم بت گر

(بادۂ مشرق)

سنسار کا نالہ ہوں مستی کا غلام
دنیا والے ہیں بندگانِ اوہام
فطرت ہے امامِ کائنات اے ساغر
عالم ہے تمام کعبہ کعبہ ہے تمام

ساغر نظامی

مشاہیر مغرب و مشرق کے زرّین اقوال

(مترجمہ سید محمد یحیٰ میرٹھی)

دنیا کی عجیب اور نفیس جہالت یہ ہے۔ کہ جب ہم بدبختیوں کا شکار ہوتے ہیں۔ جو ہمارے افعال و اطوار کا نتیجہ ہیں تو اپنی بربادیوں کا مجرم سورج۔ چاند اور ستاروں کو ٹھہراتے ہیں۔ گویا احتیاج اور ضرورت نے ہمکو بدکردار بنایا۔ آسمانی جبر سے بیوقوف بنے۔ اجرام فلکی کے غلبہ نے بدمعاش۔ چور اور غدار بنایا۔ اثرات انجم کی جبریہ اطاعت کرنے سے شرابی، دروغ گو اور زناکار ہوگئے۔ حتیٰ کہ ہمارے اندر جتنی برائیاں ہیں وہ سب خدا کی طرف سے مسلّط کی گئی ہیں۔

(شکسپیر)

قومی تکبّر اور خودپسندی کے نظام کا جال جس کو انسان نے اپنے اردگرد خود بنایا ہے اس سے ہر شخص کو آزاد کرانا ہمارا فرض ہے۔ تتلی کو یہ سمجھانا ہے کہ مٹھاس دینے والے پھول کی حفاظت سے زیادہ قیمتی آسمان کی آزادی ہے دنیا پر غیر فانی روح کی طاقت کا مظاہرہ کرکے اگر ہم طاقتور مسلح اور دولتمند شخص کا مقابلہ کریں تو جسم کے دیو کا قلعہ گمنامی میں فنا ہو جائے گا۔ مشرق کے ہم بھوکے ننگے بدنصیبوں کو تمام عالم انسانی کی آزادی حاصل کرنا ہے۔

(ٹیگور)

میں مذہب کو ہوا نہیں بناؤں گا اور نہ اس کے مقدس نام کے ساتھ کسی برائی کی وابستگی کو صحیح سمجھ سکتا ہوں۔۔۔۔۔۔ میں انجیل قرآن اور ژند اوستا کو اتنا ہی الہام خداوندی سمجھتا ہوں جتنا کہ ویدوں کو

(مہاتما گاندھی)

تہذیب جدید صرف نام کی تہذیب ہے۔ اس کے ماتحت زندگی کا واحد مقصد مادّی عظمت و شان ہے اس تہذیب نے یورپ والوں کو حصول زر کا بندہ بنا دیا اور امن و سکون اور روحانی زندگی سے محروم کر دیا ہے۔ مزدوروں اور کمزور لوگوں کے لئے یہ جہنم ہے۔ تمام نسلوں کی طاقت کو اس نے غارت کر دیا ہے۔ یہ شیطانی تہذیب اپنی ہی آگ میں جل کر فنا ہو جائے گی۔

(رومین رولینڈ)

اگر کوئی مفاد یا مقصد نہ ہو تو زندگی ایک نہایت غیر دلچسپ شے ہے۔ ان لوگوں کے لئے جو علم و فن سے محروم ہیں دنیا رنگوں کی ایک ترتیب یا ایسا ناہموار راستہ ہے جہاں آسانی سے وہ اپنی ٹانگیں توڑ سکتے ہیں خواہش اور شوقِ معلومات ہی انسان کو زندہ رکھتا ہے۔

(اسٹیونسن)

جب ہم میں اسقدر صلاحیت پیدا ہو جائے گی کہ ہم خدا کے ہر عمل میں حسن و جمال محسوس کرنے لگیں تو اسوقت دعویٰ کر سکیں گے کہ ہم اس کی حقیقت سے واقف ہو گئے ہیں۔

(رسکن)

بلاشبہ خدا نیکی ہے۔ انسان کی نیکی یہ ہے کہ اپنے بنی نوع سے محبّت کرے۔ لیکن خدا کی نیکی اسکا وہ نظام ہے جس سے وہ کائنات کو سنبھالے اور تمام اجزا کو باہم جوڑے ہوئے ہے۔

(جاں جاک روسو)

انسان فطرت کی خفیہ قوتیں بیدار کر کے سخت خطروں میں پڑ گیا ہے۔ اب اس کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ یا ان قوتوں کو آخری طور پر مغلوب کر کے مسخر کرلے یا خود مغلوب ہو کر برباد ہو جائے۔

(گبن)

حدبندیوں سے آزاد۔ وہ خاموش اور ہمیشہ بے چین و مضطرب رہنے والی چیز یعنی وقت لڑکتا ہوا جھپٹتا ہوا۔ تیز رفتار۔ خاموش جو سمندر کی ہمہ گیر موج کی طرح ہے۔ جس پر ہم بھوت پریت کی طرح موجود ہوتے اور پھر غائب ہو جاتے ہیں۔ یہ وقت ہمیشہ سے لغوی معنوں میں معجزہ ہے یہ ایسی چیز ہے جو ہمیں گونگا بنا دیتی ہے۔ کیونکہ ہمارے پاس الفاظ نہیں جو اس کے بارے میں کچھ کہہ سکیں۔ آہ! یہ کائنات! وحشی انسان اس کے متعلق اب تک کیا جان سکا ہے۔ اور اب بھی ہم جان ہی کیا سکتے ہیں؟ یہ ایک طاقت ہے ہزارگونہ طاقتوں کا ایک معمہ ہے یہ وہ طاقت ہے جو ہم سے علاوہ ہے۔ یہ ہم سے بالکل مختلف چیز ہے۔ طاقت۔ طاقت ہر جگہ طاقت۔ اسکے مرکز میں ہم بھی ایک پُراسرار طاقت ہیں۔ سڑک پر بکھرے ہوئے پتے جو سڑنے لگتے ہیں ان میں بھی طاقت ہے۔ اگر طاقت نہ ہوتی تو وہ کیسے سڑتے۔

(کارلائل)

تربیت کا سب سے بڑا ثمرہ یہ ہے کہ وہ عقل کو تصنع اور مکر سے پاک کرتی ہے۔ اور ہر چیز کی حقیقت دیکھنے کا موقع بہم پہنچاتی ہے۔ علم ہمیں صحیح طور پر فصاحت و بلاغت سے بدظن کرتا ہے۔ آزاد ملکوں میں اگر کسی شخص کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھنا ضروری ہے تو وہ اچھے تقریریں کرنے والا شخص ہے۔ یعنی وہ شخص جو تعلیم یافتہ بھیڑ کو اپنی چرب زبانی سے مسحور کر دیتا اور گمراہی کو خوشنما بنا کر عام کرتا ہے۔ آزادی کے ہر زمانہ میں سب سے بڑا خطرہ یہی گمراہ مقرر ہے

(مسٹر بالڈون)

زمانے کے انقلابات دوست کو دشمن اور دشمن کو دوست بنا دیتے ہیں۔۔۔ آزادی کے طلبگار انتہا پسند نہیں ہوتے۔ اس لئے کہ یہ تو ابتدائی چیز ہے۔ غلامی کے پسند کرنے والے البتہ انتہا پسند ہیں کیونکہ غلامی ذلت نفس کی انتہا ہے۔

(سعد زاغلول)

"انتقام ایک انفرادی فعل ہے سزا کا اختیار صرف خدا کو ہے۔ سوسائٹی کا راستہ انتقام اور سزا کے بین بین ہے۔ سزا اس کے دائرۂ اقتدار سے باہر ہے۔ انتقام سوسائٹی کے شایان شان نہیں۔ سوسائٹی کو انتقام کے لئے سزا نہیں دینی چاہئے بلکہ اسے مجرموں کی اصلاح کرنی چاہئے"۔

"وہ سزائیں جو مجرموں کو دی جاتی ہیں ان لوگوں کو خوفزدہ کرتی ہیں۔ جن کے آغوش اذہان میں جرائم پرورش پاتے ہیں"۔ "سر بازار سزائے موت سے بیان کردہ تاثرات پیدا نہیں ہوتے مگر جمہور کے دماغ پر ایسے ہولناک مناظر سے خطرناک اثرات پیدا ہوتے ہیں۔ ان کے احساسات اور جذبات قلب مجروح ہوتے ہیں۔ ان کے اخلاق پر بہت بُرا اثر پڑتا ہے"۔ "میزان عقل میں بڑے سے بڑے جرم کو تولو تو ہمیں معلوم ہو جائیگا کہ سوسائٹی کو اس چیز سے محروم کر دینے کا کوئی حق حاصل نہیں جسکو وہ عطا نہیں کر سکتی"۔

(وکٹر ہیوگو)

انانیت کی تاریکی

انانیت کی تاریکی جس کو مٹانا ہے وہ انفرادی نہیں بلکہ عوام کی انانیت ہے مشرق ہو یا مغرب یہ محض انسانی دماغ ہے جو مختلف پہلوؤں اور مختلف زاویۂ نگاہ سے سچائی تک پہونچنا چاہتا ہے اور اگر یہ بات سچ ہو سکتی ہے کہ مغرب نے غلط راستہ کی طرف رہبری کی تو مشرق کے نقطۂ نگاہ کے متعلق بھی کوئی شخص یقین نہیں کر سکتا کہ صحیح ہوگا یا غلط۔ ہمیں چاہیے کہ جھوٹے فخر و مباہات کو ترک کر دیں اور دنیا کے کسی گوشہ میں بھی اگر کوئی چراغ روشن ہو تو یہ سمجھ کر کہ یہ ہمارے ہی مشترک گھر کا چراغاں ہے اس پر خوشی و خرمی کا اظہار کریں۔"

(ٹیگور)

عدم تشدّد

"ہماری جنگ کا مقصد تمام دنیا سے محبت اور دوستی ہے۔ عدم تشدّد انسانوں سے روشناس ہو چکا ہے اور یہ قایم رہے گا عدم تشدّد امنِ عالم کا ہراول ہے۔"

(مہاتما گاندھی)

ضمیر

ضمیر کسے کہتے ہیں؟ یہ سچ ہے کہ جز اُن لوگوں کے جو بالکل بے عقل ہیں ضمیر ہر شخص میں موجود ہے لیکن یہ گذشتہ تجربات کا نتیجہ ہوتی ہے اور ان تجربات کے مطابق ہی اس میں اختلاف ہوتا ہے۔ گذشتہ زندگیوں میں ہر شخص یہ معلوم حاصل کرتا ہے کہ فلاں طریقۂ عمل خوشی اور مسرت کی طرف رہبری کرتا ہے اور اس کے علاوہ مصائب و آلام کی طرف کھینچتے ہیں پچھلی تمام زندگیوں میں رفتہ رفتہ تمہارا تجربہ ایک قطعی فیصلہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اور جب تم پیدا ہوئے ہو تو تمہارا رجحانِ طبع اسی قطعی فیصلہ کی پیروی کرتا ہوتا ہے اور جس طرح ایک شخص کا تجربہ دیگر اشخاص کے تجربوں سے مختلف ہوتا ہے اسی طرح ایک شخص کا ضمیر بھی اپنے ہمسایوں کے ضمیر سے اختلاف رکھتا ہے۔ ضمیر کا ارتقا تہذیب علم اور بڑھتی ہوئی آبادی کے ارتقا تہذیب علم اور بڑھتی ہوئی آبادی کے ارتقا کے ساتھ ہوتا ہے۔

(مسز اینی بیسنٹ)

ماحول کا اثر

افراد کے باہمی خود غرضانہ استعمال میں جس قدر کمی ہوتی جائے گی اسی قدر قوموں کا باہمی خود غرضانہ استعمال بھی کم ہوتا جائے گا جوں جوں وہ فرقہ بندیاں کم ہوتی جائیں گی قوموں کی باہمی دشمنی بھی گھٹتی جائے گی۔ کیا اس حقیقت کے سمجھنے کے لئے کسی گہری بصیرت

کی ضرورت ہے کہ مادّی حالات زندگی اور اجتماعی نظام کی تبدیلی کے ساتھ انسان کے خیالات نظریات تصورات حتیٰ کہ ضمیر و وجدان تک بدل جاتا ہے؟

خیالات کی تاریخ بجز اس کے اور کیا ثابت کرتی ہے کہ پیداوار مادّی پیداوار کے ساتھ ہمیشہ بدل جاتی ہے؟ ہر عہد کے حکمراں کے خیالات وہی رہے ہیں جو اس کے حکمراں طبقے کے تھے۔

(کارل مارکس)

موجودہ سوسائٹی

ہم سب بھائی ہیں مگر ہر روز صبح کو میرے بھائی اور بہنیں میرے لئے نہایت ذلیل خدمات انجام دیتی ہیں۔ ہم سب بھائی ہیں مگر میں ہر روز صبح کو چرٹ پیتا ہوں مٹھائی کھاتا ہوں اور آئینہ کے سامنے بیٹھتا ہوں اور بہت سے ایسے سامانوں سے اپنا دل خوش کرتا ہوں جن کی تیاری میں میرے بھائی بہنوں کی تندرستی غارت ہوئی ہے۔ میں ان کا استعمال ترک نہیں کرتا بلکہ اُن کو حکماً طلب کرتا ہوں۔

ہم سب بھائی ہیں لیکن میں کسی بنک یا سوداگر کی دوکان پر ملازمت کر کے اپنے دن گزارتا ہوں اور ہمیشہ اپنے بھائی اور بہنوں کے لئے ضروریات زندگی کی قیمت بڑھاتا رہتا ہوں۔ ہم سب بھائی ہیں مگر میں اپنے بھائیوں کے خلاف فیصلے لکھنے اور ان کو جیلخانوں میں بھیجنے اور چوروں اور طوائفوں کو سزا دینے کے لئے تنخواہ پاتا ہوں۔ کو چور اور طوائفوں کو سزا دینے کے لئے تنخواہ پاتا ہوں و چوروں اور طوائف [illegible] زندگی کے اسباب نے پیدا کئے ہیں۔ ہم سب بھائی ہیں لیکن [illegible] ٹیکس وصول کر کے زندگی بسر کرتا ہوں اور [illegible] عیش اور کاہل وجودی میں رہنے دیتا ہوں ہم سب بھائی ہیں مگر میں عیسوی مذہب کی [illegible] اعتقاد نہیں ہے [illegible] کو تلقین [illegible] تنخواہ پاتا ہوں اور لوگوں کو چالاکی [illegible] کرنے سے روکتا ہوں۔ میں [illegible] ہوں [illegible] معاملہ میں [illegible] ہوں جو ان کی زیست اور موت کا سوال ہے اور تنخواہ لیتا ہوں ہم سب بھائی ہیں لیکن میں اپنے بھائی سے جملہ خدمات کی جو میں اس [illegible] یاد اکثر انجام دیتا ہوں قیمت لیتا ہوں۔ ہم سب بھائی ہیں [illegible] لگانے [illegible] لڑنے [illegible] ہتھیار ولوہ بارود اور قلعے [illegible] تنخواہ لیتا ہوں۔

ہمارے اعلیٰ طبقہ کی ساری زندگی [illegible] انسان میں [illegible] صاف قلب کے آدمی کو [illegible] حالت میں [illegible] زندگی [illegible] افسوس یا خوف سے خالی نہیں۔

(کاؤنٹ ٹالسٹائی)

اچھوت

"میں دوبارہ پیدا ہونا نہیں چاہتا لیکن اگر دوبارہ جنم لینا ضروری ہے تو میری تمنا ہے کہ خدا مجھ کو اچھوتوں میں پیدا کرے تاکہ اُن کی مصیبتوں میں شریک ہوسکوں اور اُن کو آزاد کرانے کی کوشش کرسکوں۔" (مہاتما گاندھی)

صفائے قلب

بہت ضروری ہے کہ میں اپنے دل کو صاف کروں۔ اخلاقی ماحول میں جو چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں ہوتی ہیں اُن کو سمجھنے اور جمع کرنے کی طاقت میرے اندر ہونی ضروری ہے۔ میری عبادت جو کچھ ظاہر کرتی ہے۔ اس سے کہیں زیادہ اس میں گہری صداقت اور انکسار درحقیقت موجود ہونا چاہئے۔ (مہاتما گاندھی)

مغرب اور اُس کی درندگی

"قومی دولت ہو یا آزادی انسان کی اخلاقی عظمت میں بے لاگ یقین رکھنے سے زیادہ کوئی بھی چیز قیمتی نہیں۔ مغرب کو مادی طاقت اور دنیاوی ترقی پر پختہ یقین ہے۔ اس لئے قیام امن و تخفیفِ اسلحہ کی چیخ و پکار کتنی ہی بلند کیوں نہ ہو مغرب اس کی وحشت اور اس کی درندگی اس سے بھی کہیں زیادہ دہاڑیں مارتی، دانت پیستی اور مضطرب ہے۔ اپنی دُم اِدھر اُدھر مارتی ہے۔ اس کی مثال مچھلی کی سی ہے جو سیلاب کے دباؤ سے ضرب کھا کر ہوا میں اُڑنے کی ترکیبیں سوچتی ہے۔" (ٹیگور)

تعجب خیز دُنیا

یہ ہری بھری پھولوں سے لدی سنگلاخ زمین یہ درخت یہ پہاڑ یہ دریا اور طوفان [illegible] والا سمندر [illegible] اگر سمندر جو ہمارے سروں پر موجیں مارتا ہے ہوا ہے جو اس نیلگوں سمندر میں بہتی ہے۔ کالا بادل جو دل کے دل جمع کرتا ہے۔ کبھی آگ برساتا ہے اور کبھی اولے اور بارش نازل کرتا ہے یہ سب کیا کارخانہ ہے؟ یہ کی بات ہم میں سے اب تک کوئی نہیں جانتا اور نہ کبھی کوئی جان سکے گا۔ . . . گرجتے ہوئے سیاہ بادل کی آگ کو ہم بجلی کہتے ہیں اور [illegible] عالمانہ لکچر دیتے ہیں۔ اس کا مثل شیشہ اور گلاس [illegible] یہ کیا چیز؟ کس چیز سے بنی ہے؟ کہاں سے آتی ہے؟ اور کہاں چلی جاتی ہے؟ . . . یہ دنیا باوجود ہمارے جملہ علوم کے ایک معجزہ ہے۔ جتنا بھی کوئی سوچ سکتا ہے [illegible] یہ دُنیا تعجب خیز سمجھ میں نہ آنے والی ایک جادو کی چیز اور اس سے بھی زیادہ معلوم ہوگی۔" (کارلائل)

سستی اور عدم

"سستی اور عدم ایک چیز ہے۔ .... تمام آدمی اچھے ہیں جب اُن کے حرص کے پاس کرنے کے لئے کوئی کام نہیں ..... زندگی کا مقصد ہی کام کرنے کے لئے ہے نفس کو ہمیشہ زیادہ سے زیادہ کام میں مشغول رکھنا چاہئے۔ سستی جس قدر زیادہ ہو جاتی ہے محنت کی ضرورت کا اتنا ہی زیادہ یقین ہو جاتا ہے جو شخص محنت کا عادی ہو جاتا ہے اُسے محنت میں اتنی خوشی حاصل ہوتی ہے کہ زندگی کی تمام کلفتیں بھول جاتا ہے...... اگر خودکشی منظور نہیں ہے تو اپنے لئے کوئی کام پیدا کر لو۔" (والٹیر)

مغربی طریقۂ تعلیم

کوئی بھی ہندوستانی ذہانت اور عقلمندی پر شبہ نہیں کر سکتا۔ مگر یہ حیرت ہے کہ مغربی طریقۂ تعلیم نے اسے کس طرح اپنا شکار کر لیا ہے اور ہندوستان کی روایتی ذہانت کی مشتعل قوت بالکل افسردہ ہو کر رہ گئی ہے۔" (میرس)

دُنیا اور فکر و عمل

دُنیا نے فکر و عمل کے الگ الگ گوشے بنائے ہیں اور استعداد و صلاحیت کے دائرے بنا کر ان میں لکیریں کھینچ دی ہیں تاکہ تقسیم عمل کے حدود قائم ہو جائیں لیکن تقسیمیں اور حدبندیاں ہمیشہ نہیں چل سکتیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ طبیعت کا جوش اور فکر کی وسعت ان چھوٹے چھوٹے خانوں کی تنگنائیوں میں قانع نہیں رہ سکتی اور حد بندیاں توڑ کر باہر نکل جاتی ہے۔ (ابوالکلام آزاد)

اتحادِ باہمی

"آپس کا ملاپ قائم رکھنا روزے نماز سے بھی افضل ہے ..... یتیموں کا خیال رکھو ان کے منہ میں خاک مت ڈالو۔ وہ تمہاری موجودگی میں ضائع نہ ہونے پائیں اپنے پڑوسیوں کا خیال رکھو تمہارے رسول برابر پڑوسیوں کے حق میں وصیت کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ہم سمجھے شاید انہیں ورثہ میں شریک کر دیں گے۔ ..... خدا کے تمام بندوں پر شفقت کرو۔ جب بات کرو تو میٹھی زبان سے بات کرو۔ ایسا ہی خدا نے حکم دیا ہے بے تکلف اور سادگی پسند ہو۔ گناہ اور زیادتی میں کسی کی مدد نہ کرو۔" (حضرت علیؓ)

زندگی اور موت

"زندگی کتنی ہی شاندار اور عظیم الشان ہو لیکن تاریخ اپنے فیصلہ کیلئے موت کی منتظر رہتی ہے۔" (وکٹر ہیوگو)

غیرتِ قومی

"میں صلح چاہتا ہوں لیکن صلح کی بنیاد کیا ہو؟ کیا غلامی؟ ہرگز نہیں غلامی سے پہلے موت۔ سیاہ موت۔ پھر کیا ہو؟ اقتصادی امتیازات دینے کو آمادہ ہوں لیکن اس وقت جب طرابلس کی سرزمین پر اٹلی کا ایک آدمی بھی باقی نہ رہے۔ اگر ایسا نہ ہو سکے تو پھر اس کے سوا چارہ نہیں کہ جنگ! موت تک جنگ! قیامت تک جنگ!" (شیخ سنوسی)

آزادی اور قربانی

آزادی کی جنگ دُنیا کی تاریخ میں بھی کبھی بغیر قربانی کئے کامیاب نہیں ہوئی۔ میں پھر کہتا ہوں جاگ اُٹھو! جاگ اُٹھو! جاگ اُٹھو! بہت دن سو لئے۔ طوقِ غلامی کا احساس کرو اور آزادی کی شاہراہ پر دلیری اور مضبوطی کیساتھ کھڑے ہو جاؤ۔" (سی آر داس)

بُری عادت

"اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بعض مخصوص اشخاص میں ایک خاص فطری نقص ہوتا ہے۔ . . . وہ نقص خواہ فطرت کا ہو یا قسمت کا عطیہ لیکن اس مخصوص واحد نقص کا نشان جب تک قائم رہے گا۔ اُس وقت تک پبلک کی نگاہ میں یہ لوگ کثیف ہی نظر آئیں گے یا ان کی دوسری خوبیاں ایسی پاک وصاف ہی کیوں نہ ہوں جیسے خدا کی رحمت اور چاہے وہ اتنی زیادہ ہی کیوں نہ ہوں جتنی کسی انسان کے اندر ممکن ہو سکتی ہیں۔ دنائت کی تھوڑی سی مقدار بعلائی کی کل مقدار کو فنا کر دیتی ہے . . . . . . جس طرح کمال کو پیدا کرنے کے لئے قدرت جسم پر گوشت چڑھا دیتی ہے۔ اسی طرح کسی انسان کی سیرت بگاڑنے کے لئے قدرت اس شخص میں بری عادت پیدا کر دیتی ہے۔"

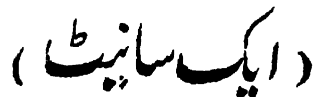
(شیکسپیر)

قول و فعل کی یکسانیت

"لوگوں کو نیک زندگی بسر کرنے کی جانب لیجانے کا صرف ایک طریقہ ہے اور وہ یہ کہ خود وہ شخص نیک زندگی بسر کرے اس کے ان لوگوں کی جد وجہد جو عام لوگوں میں اچھی زندگی قائم کرنے کی آرزو رکھتے ہیں۔ اس بات پر مشتمل ہونی چاہئے کہ وہ اپنی اندرونی تکمیل کی کوشش کریں انجیل کے الفاظ ہیں جیسا تمہارا باپ آسمان پر مکمل ہے اسی طرح تم بھی مکمل ہو جاؤ۔"

(ٹالسٹائی)

مرجانہ



(ایک سانیٹ)

دلوں میں رقص کرتے ہیں فسانے تیرے مرجانہ

ترے جلووں کی رنگینی میں ہے تصویر کا عالم
شباب خامۂ بہزاد کی تحریر کا عالم

فضاؤں میں مچلتے ہیں ترانے تیرے مرجانہ
پرندوں کو بھی شرماتے ہیں گانے تیرے مرجانہ

تو سر سے پاؤں تک ہے پیکرِ تنویر کا عالم
شراب و شعر کی بہکی ہوئی تاثیر کا عالم

بہاروں میں پڑے ہیں آشیانے تیرے مرجانہ

خمارِ رنگ و بُو بن کر دیارِ دل میں تو آئی

جوانی کی بہاریں ہیں محبت کی ملاقاتیں
شگوفوں سے بھرے دن ہیں ستاروں سے بھری راتیں

بہشتِ آرزو بن کر دیارِ دل میں تو آئی

تری رنگین صحبت میں شرابِ حسن پیتا ہوں
شرابِ حسن پیتا ہوں اسی نشے میں جیتا ہوں

خان صاحب خلیلی
امرتسر

ہندوستان میں صنعت فلم سازی کا مستقبل

(شیخ افتخار الرسول بار ایٹ لاء کے قلم سے)

ہر صدی اپنے جلو میں پیغام عمل لاتی ہے۔ جو اقوام اس پیغام کو سن کر اُسے عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرتی ہیں۔ ترقی و تہذیب کی علمبردار بن جاتی ہیں۔ یورپ کی ترقی کا راز صرف اس پیغام کی پیروی ہے۔ بیسویں صدی کی ابتدا کے ساتھ حیاتِ اجتماعی کے اصول کا انشراح ہوا۔ امریکہ نے زیادہ اور یورپ نے ایک معقول حد تک اس صنعت کو اپنے نظام عمل میں شامل کیا اور اپنی مالی اولوالعزمی محنت اور سرگرمی سے اس کو ایسا فروغ دیا کہ آج اس کے سامنے بڑی بڑی زرخیز صنعتیں گرد ہو رہی ہیں۔ اور فلم کے کاروبار میں کروروں نہیں بلکہ اربوں روپیہ لگا ہوا ہے جو حیرت انگیز منافع دے رہا ہے۔ جرمن۔ فرانس اور انگلستان سرتوڑ کوشش کر رہے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح امریکہ کو اس صنعت میں شکست دیں لیکن امریکہ بدستور برسرِ اقتدار ہے اور دنیا کے ہر حصے میں اس کے بنائے ہوئے فلم نہایت ذوق و شوق سے دکھلائے جا رہے ہیں۔ اس تھوڑی سی مدت میں اس صنعت نے جتنی ترقی کی ہے اس کی مثال دنیا میں کہیں نہیں مل سکتی۔

روس بھی اس دوڑ میں پیچھے نہیں رہا۔ یہ شک کہ وہاں ہر ایک معلم کیلئے فلم آرٹ کا ماہر ہونا اب ضروری سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ ان کے خیال میں غیر مہذب حلقہ کو تمدن سے آشنا کرنے میں اس سے بہتر اور کوئی آلہ کار نہیں ہو سکتا۔

صرف یہی نہیں بلکہ حال ہی میں ماسکو میں ایک فلمی یونیورسٹی کا افتتاح ہوا ہے جس کی تعلیم چار سال میں پایۂ تکمیل تک پہنچتی ہے۔ اسوقت اس یونیورسٹی میں ... طلباء تعلیم پا رہے ہیں۔ اس یونیورسٹی کا مقصد صرف ایکٹر ہی پیدا کرنا نہیں بلکہ وہاں مصور کیمرہ کے ماہر ڈائرکٹر۔ ڈراما نویس وغیرہ سب کی علیحدہ علیحدہ تعلیم کا انتظام کیا گیا ہے۔ اس میں طلباء کی عمر کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا ہے۔ جن کی عمر عموماً سولہ اور بیس برس کے درمیان ہوتی ہے۔ یونیورسٹی کی تعلیم صرف کتابوں پر ہی مبنی نہیں ہوتی بلکہ انہیں کام کی عملی تعلیم دینے کے بعد استاد بنایا جاتا ہے۔ سب سے عمدہ بات وہاں یہ ہے کہ فلموں کی قسمیں علیحدہ علیحدہ کر دی گئی ہیں۔ فوجی۔ زراعتی۔ طبعی اور صنعت و حرفت کے متعلق جداگانہ فلمیں ہیں جن کا نتیجہ یہ ہے کہ اس تھوڑے عرصہ میں روسی فلموں نے غیر معمولی ترقی حاصل کر لی ہے اور اب ان کا شمار دنیا کی بہترین فلموں میں ہونے لگا ہے۔

ان روسی فلموں میں نمایاں ترین خصوصیت یہ ہے کہ یہ بدرجہ غایت جذباتی ہوتی ہیں۔ اور خواہ وہ ظریفانہ ہوں یا ٹریجک۔ ان کا دامن جذبات سے لبریز ہوتا ہے۔ ان کے ایکٹنگ میں تصنع کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔

میرے خیال میں امریکہ اور روس ہی ایسے ملک ہیں جہاں تعلیم کے ذریعے تفریح کے ساتھ ساتھ پروپیگنڈہ سے بھی کام لیا گیا ہے۔ روسی فلموں میں خاص طور پر بالشوزم یا اشتراکیت کا سبق دیا جاتا ہے۔ بچوں کے لئے ایسے فلم تیار کئے جاتے ہیں جن سے ان کے دل میں "کیمونزم" کی محبت جاگزیں ہو اور وہ اشتراکی نظام حکومت کو فرض سمجھیں۔ (لینن کی یہ خواہش کامیابی کے ساتھ بچوں پر اپنا اثر کر لینے جا رہی ہے جو روسی فلموں سے ظاہر ہے)

یہ ایک جملہ معترضہ ہے۔ میرا مطلب اس تمہید سے صرف یورپ اور امریکہ کی ترقی کے وسائل بتانے ہیں جن سے ہمارے فلم ساز ایک سبق سیکھ سکتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان کی صنعت فلم سازی آج کل ترقی کے راستے پر گامزن ہے لیکن ہمارے سرمایہ داروں، ڈائرکٹروں اور ایکٹروں میں بعض ایسے عیوب اور بعض ایسی کمزوریاں اب تک بھی موجود ہیں کہ اگر اُن کو دور کرنے کی سرتوڑ کوشش نہ کی گئی تو اندیشہ ہے کہ ہماری یہ صنعت بہت جلد فنا ہو کر رہ جائے گی۔ فلم کی صنعت کا منشا یہ ہرگز نہیں کہ چند ایک اُلٹے سیدھے فلم تیار کر کے پبلک کے سامنے پیش کر دئے جائیں جنہیں دیکھ کر عام لوگ خوش ہو جائیں۔ ہمیں اسوقت مغربی فلموں کی ہر دلعزیزی کا مقابلہ کرنا ہے۔ اور جس طرح مغربی ممالک کے فلم ہندوستان میں آ کر لاکھوں ہندوستانیوں کے دل بہلاؤ کا سامان بہم پہنچاتے ہیں۔ اسی طرح ہندوستانی فلموں کو بھی عالمگیر شہرت اور مقبولیت حاصل کرنی چاہئے تاکہ مغربی لوگ مشرقی اوضاع و اطوار کی شائستگی کو سمجھیں۔ ایشیا کے آرٹ کی قدر کرنا سیکھیں اور ہندوستانی سرمایہ دار غیر ملکی ذرائع سے بھی فائدہ حاصل کر سکیں۔

موجودہ حالت میں ہندوستانی مالکان کمپنی نے روپیہ پیدا کرنے کی دھن میں اپنے فرائض حقیقی کو قطعی نظر انداز کر دیا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ ایسے فلم تیار کرتے ہیں جو نہ صرف مخربِ اخلاق ہیں بلکہ وہ جوانانِ ملک کی زندگیوں کے واسطے جو ملک کے واسطے مستقبل کی امانت ہیں نہایت ہی تباہ کن ہیں۔ ہندوستان میں اس فن کے واسطے بہترین دماغ موجود ہیں۔ لیکن وہ منتشر حالت میں ہیں اور میرے خیال میں اُن کو یکجا اکٹھا کرنے کی کوشش ہی نہیں کی گئی۔

وقت آ گیا ہے کہ ہندوستان کے سرمایہ دار اور فلم ساز ان باتوں کا سنجیدگی اور ٹھنڈے دل سے مطالعہ کریں اور محسوس کریں کہ فلم ملک کو مہذب اور تعلیم یافتہ بنانے کا آسان ذریعہ ہے۔ ہم اس صنعت میں اور ممالک کے مقابلے میں بہت پیچھے ہیں اور ابھی اصلاح کا وقت ہاتھ سے زیادہ دور نہیں گیا ہے۔

فلم کسی قوم کے مقاصد و خیالات کے اظہار کا لاثانی ذریعہ ہے۔ ہندوستان کو دنیا میں اپنے فلسفہ۔ تہذیب و تمدن کے باعث ایک قابل فخر درجہ حاصل ہے۔ اگر ہم ان چیزوں کو اپنے مخصوص انداز میں بذریعہ متحرک تصاویر اور قوموں میں شایع کریں تو ہم اس کے واسطے وہی عالمگیر عزت اور مرتبہ حاصل کر سکتے ہیں جن کا یہ حقدار ہے۔

یہ ایک تجارتی مسئلہ نہیں ہے۔ قومی اور ملکی مسئلہ ہے۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ ایک تعلیمی مسئلہ ہے۔ آج ہمارے پاس فلم کی وساطت ایک ایسی کامیاب وساطت ہے۔ جس کے ذریعہ نہ صرف ہم غیر ملکوں میں اپنی گذشتہ عظمت کے افسانے اپنے روحانی ارتقا کے تذکرے اپنے ملک کے نامور باشندوں کے کارنامے پیش کر سکتے ہیں۔ بلکہ ہندوستانیوں کے دلوں میں بھی زمانۂ ماضی کی یاد تازہ کر سکتے ہیں۔ اُن کے دماغوں کو معاصر اقوام کی ترقیوں کے مناظر دکھلا کر بیدار کر سکتے ہیں۔ اور ان کے حواس کو زمانۂ مستقبل کے عروج و اقبال کے امکانات سے مائل بہ حرکت کر سکتے ہیں۔



ثریا

(از سیّد محمد عسکری طباطبائی، بی، اے)

(۱)

جب میں نے اُسے پہلی مرتبہ دیکھا تو مجھے جو معلوم ہوئی نہ پری بلکہ یہی انسانی گوشت پوست کی مخلوق ارضی جو اس قابل بھی نہ تھی کہ غیر معمولی طور پر حسین کہی جا سکے ایک سادہ وضع ولباس کی سانولی رنگت والی لڑکی کشیدہ قامت اور گداز جسم، وہ اپنے چہرہ میں کوئی خاص دلکشی نہ رکھتی تھی، ہاں اس کی آنکھیں غیر معمولی چمکیلی تھیں۔ ایسی چمکیلی کہ اگر کوئی اجنبی اُن کی گردش کی زد میں آجائے تو کم از کم تھوڑی دیر کے لئے تو ضرور حیران و مبہوت انہیں دیکھتا ہی رہ جائے بس یہی حال میرا ہوا میں نے دیکھا کہ اس کی نقل و حرکت رفتار و گفتار میں ایک پنہاں شوخی ایک دبی ہوئی چلبلا پن اور چالاکی ہے۔ وہ جوانی کی حدود میں داخل ہو چکی تھی لیکن لڑکپن ابھی اس کے قدموں میں کھیل رہا تھا۔ گرد و پیش کا منظر کچھ ایسا مناسب تھا کہ مجھے وہ لڑکی اسی منظر کا ایک جزو لا ینفک معلوم ہونے لگی جب وہ اپنی شوخ نگاہوں کو یکایک خلا میں کسی غیر معلوم مرکز پر جما دیتی، تو یہ محسوس ہوتا کہ وہ رنگ برنگ فضا میں تحلیل ہو جائے گی۔ یا تمام بیرونی منظر کو اپنی نگاہوں میں جذب کرے گی۔ دفعتاً یہی شوخ نگاہیں مڑیں اور مجھ سے چار ہو گئیں میں اُس کی نگاہوں کی برق آمیزی کا مقابلہ نہ کر سکا۔ اور میں نے نگاہیں نیچی کر لیں وہ پھر اپنی سہیلیوں سے بات چیت میں مشغول ہو گئی۔ وہ برقع تو اوڑھے ہوئے ضرور تھی لیکن شاید اُسے زبردستی کا بوجھ خیال کرتی تھی، چہرہ تو اب بے نقاب، ہاتھ کہنی تک عریاں اور آواز کے معاملہ میں بھی کافی آزاد، وہ صاف بے باک و جری معلوم ہوتی تھی لیکن ان تمام شوخیوں کے باوجود اس کے انداز میں ایک سادگی۔ ایک معصومیت تھی۔ جو دیکھنے والے کے دل پر نقش ہو سکتی تھی، اُس کے حرکات و سکنات اس قدر مطابق فطرت اور تصنع سے بری تھے کہ گویا اس مقام پر اُسے اپنے سوا کسی دوسرے کے وجود کا احساس ہی نہیں تھا۔ اس میں شک نہیں کہ میں نے اُسے پسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھا لیکن ایک بے غرض پسندیدگی۔ یہی سچ ہے کہ جب میں نے ایک مرتبہ اُسے نگاہ بھر کر دیکھ لیا تو پھر بمشکل خود کو اُسے دیکھنے رہنے سے باز رکھ سکا۔ لیکن طبیعت پر کافی جبر کر کے عمداً دوسری سمت چل دیا۔

وقت اور مقام ایسے نہیں تھے کہ کسی کے خیالات کو ایک مرکز پر قائم رہنے دیں ہر قدم پر مختلف مناظر اور گوناگوں سامان و اسباب نگاہ کو دعوت دے رہے تھے میں جلد ہی اپنے "ماحولی" دلچسپیوں میں محو ہو گیا۔

لکھنؤ میں اودھ کانگریس کی نمائش و نمائش بھی قیصر باغ ایسے پر فضا مقام میں منظر کی قدرتی دلکشی کے علاوہ انسانی جدت و اختراع کی تمام تازہ کاریاں پیش نظر تھیں آسمان پر ماہ تمام جلوہ گر اور زمین پر بے شمار برقی قمقموں سے رنگین روشنی۔ اس مصنوعی روشنی میں جو موسم و قدرت کے تمام رنگ اپنے اندر لئے تھی آسمان کی خنک و بسیط چاندنی کھوئی ہوئی سی معلوم ہوتی تھی۔ اگر کوئی اپنے گرد و پیش سے آہستہ آہستہ عالم بالا کی طرف نظر اٹھاتا تو اسے محسوس ہوتا کہ یہی ارضی روشنی بلند ہوتے ہوتے سماوی چاندنی میں تبدیل اور اس کے تمام الوان ماہتاب کی بے رنگ شعاعوں میں جذب ہو گئے ہیں۔ پھر اس عالم میں قیصر باغ کی بارہ دری کا عالم وہ اس کی سپید و شفاف سنگ کاری وہ خوشنما بلند برجیاں اور حسین محرابیں جنہیں جذبۂ ستائش سر بسجود نظر آئے، وہ باریک جالیاں جنہیں تار نگاہ الجھ کر رہ جائے بس یہ عمارت بجلیوں کی زنگارنگ مینوں کے لاتعداد ہار پہنے متعدد روشن و رقصاں گل بوٹوں سے مزین سوزن کاری کا دامن زیب سر کئے دور سے ایک ایسی دلہن معلوم ہوتی تھی جو سنہری دھوپ کی چھاؤں میں نہا رہی ہو۔

دوسری طرف قدرت کی صناعیاں اور موشگافیاں اپنے پورے حسن کے ساتھ نمایاں تھیں باغوں میں نرم و خنک سبزے کا فرش، رنگین و خوشنما پھولوں کی کیاریاں صاف و شفاف پانی کی نہریں، بلند و بالا کھجور کے درخت اور سرسبز و شاداب اشجار کی قطاریں سبھی کچھ موجود تھا۔ ان سے بھی باہر زندگی کے زیادہ عملی پہلو پیش نظر تھے۔ ہندوستان کے ہر گوشے سے دیسی مال کی لاتعداد دکانیں کھنچ کر آگئی تھیں اور اُن کی زیب و زینت کا وہ عالم تھا کہ الفاظ میں بیان ممکن نہیں وہ یہی نہیں کہ نظر ایک عام تماشائی کی طرح ان مختلف و متنوع مناظر سے مسحور ہو کر رہ جائے بلکہ یہاں اعلیٰ و ارفع جذبات کو تحریک میں لانے والا سامان بھی موجود تھا کس قدر باعث تسکین تھی یہ حقیقت کہ یہ سب کچھ ہندوستان اور صرف ہندوستان کی کمائی ہے اور کیسی ولولہ انگیز تھی ہر دوکان۔ کی آنکھوں میں توقع اُس امید کی جھلک جو صرف ایک ہموطن کو ایک ہموطن سے ہو سکتی ہے اور اسی نمائش کے دلکش اور جاذب توجہ پہلو ختم نہیں ہوئے صوبے کے مختلف تماشائیوں کی آمد و رفت، ان کی بول چال، ان کی وضع قطع، ان کی صورت شکل یہ سب کچھ ایک محقق جہاں کے لئے مستقل سامان دید تھے یہ گوناگوں کیفیتیں تھوڑی نہ تھیں کہ مجھ کو مجھ سے چھین لیتیں میں جلد ہی ان میں گم ہو گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ لڑکی مجھے پھر ملی۔ میں نے اُسے دیکھا اور دیکھتا رہا ایک نیم نگہ ڈالتی ہوئی گزر گئی یعنی کسی دوست کی محبت کے ایک اجنبی مقام پر۔ پہلے سے جو لبید کی نشاط ہو رہی تھی مجھے اس میں اضافہ سا محسوس ہونے لگا میں نے طبیعت کو اور کسی طرف راغب کرنا چاہا لیکن معلوم ہوتا تھا کہ وہ لڑکی میرے قلب و دماغ پر ایک قبضہ سا کر لیتی ہے۔ میں چل رہا تھا لیکن ایک مشین کی طرح۔ نہیں کہہ سکتا کہ عمداً ایسا تھا یا وہ خود میرے راستہ میں حائل تھی۔ غرض کئی مرتبہ مجھ سے دوچار ہوئی میں نے اُسے دیکھا وہ بھی نگاہوں سے میرا تعاقب کر رہی ہے۔ مگر یہ نہ معلوم کب تک اسی طرح وہ نگاہیں میرا تعاقب کرتا رہا ... تھوڑے وقفہ کے بعد میں نے ایک ... میں ... تنہا ... بیٹھے پایا وہ ... کا ... دیکھتی رہی ... آنکھوں ... مانند ... زبان ... نمونہ ناتمام ... تک ... لگا۔

آدھی رات جا چکی تھی، میں اپنی قیام گاہ پر واپس آ رہا تھا۔ چاندنی اپنے پورے عروج پر تھی ٹھنڈی ہوا آپ سے آپ طبیعت کو گدگدا رہی تھی۔ دفعتاً راستے میں موٹر پر ایک کمنی تک عریاں ہاتھ مجھے نظر پڑا۔ میں نے فوراً پہچان لیا یہ اسی لڑکی کا ہاتھ تھا۔ قریب ہی سے کسی نے جھانک کر دیکھا۔ یہ اسی کا شگفتہ چہرہ تھا۔ مجھے اتفاقات کی اس ستم ظریفی پر ہنسی آگئی . . . .

. . . . جتنا میں بھاگنا تھا اتنا ہی وہ لڑکی اور اس کا چہرہ خیال اور واقعات دونوں میں میرا تعاقب کرتے نظر آتے تھے۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے جگہ تبدیل کی۔ اور قسم کھالی کہ اس کو اس کے گھر تک پہونچا کے دم لوں گا۔ اب وہ اپنے پہلو کا پردہ اٹھائے چہرہ اور ہاتھ کسی اجنبی کے نظارہ کے لئے پیش کئے نہایت آزادانہ بیٹھی تھی شاید پردے سے سخت بیزار تھی۔ سڑک پر سناٹا تھا اور میں تھوڑے فاصلے پر اس کے پیچھے۔ لیکن باوجود کوشش کے بھی ہمت نہ کر سکا کہ پہلو بہ پہلو آکر اسے پوری طرح دیکھ سکوں۔ راستہ بھر میں نے صرف اس کا ہاتھ دیکھا۔ دور تک اس کا موٹر میرے ہی مکان کی سمت چلتا رہا لیکن ایک موڑ پر الگ ہو گیا میرا جذبۂ رندانہ بھی اعتدال پر آچکا تھا اس لئے اپنے گھر کی طرف بڑھا لیکن پھر یکایک بغیر کسی خاص قصد و ارادہ کے موٹر پھیر کر اس کے تعاقب پر از سر نو آمادہ ہو گیا۔ یہ سب میں قطعی مذاق کے طور پر کر رہا تھا۔ ایک موہوم سی دھن کے ماتحت، اور بڑھتا جاتا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرا یہ مذاق تھوڑی ہی دیر میں کافی اہمیت اختیار کرے گا۔

آگے سڑک پتلی تھی اور ایک کھڈ کے پاس سے زاویہ قائمہ بناتی ہوئی مڑی تھی یہ موڑ بہت خطرناک تھا۔ کھڈ اور سڑک کے درمیان کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ نہ معلوم کیوں مجھے یکایک ایک نامعلوم خطرہ کا احساس ہوا، اور میں نے دیکھا کہ آناً فاناً میں آگے کا موٹر الٹ گیا غنیمت یہ ہوا کہ بائیں طرف سڑک تھی۔ رہا میں بالکل قریب ہی تھا اور اگر اپنے موٹر کو فوراً نہ روک دیتا تو شاید خود بھی کسی سانحے سے دوچار ہوتا۔ میں نے دیکھا کہ ڈرائیور بیہوش پڑا ہے اور سواریاں لباس کی بے ترتیبی کے عالم میں پریشان و خستہ سڑک کے کنارے کھڑی ہیں۔ کسی کے زیادہ چوٹ نہیں آئی تھی لیکن سب مضطرب و نوحہ کناں نیچے کھڈ کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ میں نے قریب جاکر دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ایک سواری کھڈ میں گر گئی ہے۔ کچھ پوچھئے نہیں میرا جو حال ہوا جب میں نے کھڈ میں اسی شوخ و بے باک لڑکی کو اس عالم میں دیکھا کہ وہ اپنی ساری تیزی چالاکی بھول کر حسرت و یاس سے کبھی زمین کو دیکھ رہی تھی اور کبھی آسمان کو۔ میں بمشکل اپنے پر قابو پا سکا۔ اس کے ہمراہیوں کی خواہش پر میں کھڈ میں اترا کہ اسے سہارا دیکر اوپر چڑھا دوں۔ وہ ابھی تک کانپ رہی تھی اور شاید اس کے اعضا میں نام کو قوت نہ باقی رہی تھی۔ پہلے تو میں نے اسے ہمت دلائی کہ وہ بغیر میری مدد کے اوپر چڑھے لیکن جب اس میں اسے کئی مرتبہ مضحک طور پر ناکامی ہوئی تو کوئی چارہ کار نہ رہ گیا۔ سوائے اس کے کہ میں آغوش میں لیکر اسے اٹھاؤں اور وہ سڑک تک پہنچ جائے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اس کے بعد تمام سواریوں کو اپنی ٹیکسی میں سوار کرکے میں نے ان کے گھر تک پہونچایا یہاں ایک بزرگ نے نکل کر ضروری انتظام کیا اور میرا شکریہ ادا کیا۔ مجھے "فرشتہ رحمت" اور "مردے از غیب" کے قسم کے القاب دئے۔ اور میرا نام و پتہ وغیرہ بھی پوچھا۔ میں نے صرف اتنا کہا کہ "غریب شہر ہوں اور سخنہائے گفتنی نہیں رکھتا۔ اور رخصت ہو کر چلا آیا۔

(۲)

دوسرے دن میں اپنے وطن لوٹا۔ یہاں ہر صبح میرے لئے یہ تازہ انکشاف لاتی کہ اس لڑکی کی یاد نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا ہے، برابر اس کا چہرہ مجھے ستاتا رہتا۔ اور اس کی آنکھوں کی غیر معمولی چمک تو جیسے مجھے بھولتی ہی نہ تھی۔ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ وہ سیاہ غزالی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی ہے اور اس کی تیز نظریں دل میں اتر کر تمام راز معلوم کئے لیتی ہیں۔ میرا چپ سا ہو گیا۔ یکایک میرا چہرہ تمتما اٹھتا کبھی شعر کہنے کو جی چاہتا اور شاعرانہ خیالات دماغ میں موجزن ہوتے لیکن صرف اپنی کثرت کی وجہ سے موزوں نہ ہو سکتے، یہاں تک کہ میں عاجز آجاتا۔ اور اپنے خیال کو کوئی اہمیت نہ دیتے ہوئے سارے قصے کو ایک بے ربط واقعہ میں گم کر دینا چاہتا لیکن نہ کر سکتا جب اس کی مسکراتی ہوئی آنکھیں پیش نظر ہو جاتیں، اس کی بے اختیار ہنسی یاد آجاتی جس کے ضبط کرنے کی ناکام کوشش میں وہ اپنا سر کسی ہمجولی کے کندھے پر رکھ دیتی تھی اور جس سے یکایک اس کا چہرہ کندن کی طرح دمک اٹھتا تھا جب اس کا وہ پس و پیش جسم میں سنسنی پیدا کر دیتا جس کے ساتھ کھڈ میں اس نے خود کو میری آغوش کے سپرد کیا تھا تو دل میں ایک میٹھی سی خلش جذبات میں ایک ہلکی سی گدگدی ہوتی اور میں بغیر مسکرائے نہ رہ سکتا لیکن پھر ہنس دیتا اور اپنی اس حماقت کو طول دینا بچوں کا سا کھیل سمجھتا۔ کیونکہ اس سب کے باوجود اپنے دل میں اس قدر سنجیدہ خواہش اس کے لئے نہ پاتا تھا کہ کوئی عملی اقدام اس کے حصول کا کروں، اگرچہ اس سال میں نے اپنی تعلیم ختم کر لی تھی۔ لیکن شادی کا ارادہ اس وقت تک کے لئے ملتوی کئے ہوئے تھا جب تک خود مختار زندگی میں نہ داخل ہو جاؤں، پھر اگر یہ بھی ممکن الحصول ہو جاتا تو میں اپنی شادی ہرگز ایسی لڑکی سے کرنے کے لئے تیار نہ تھا جسے میں نے صرف پہلی نظر میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا ہو جس کے عادات و اطوار، خاندان و صفات سے میں قطعاً ناواقف ہوں۔ مجھے یہ بھی علم نہیں تھا کہ وہ کسی کے ساتھ منسوب ہے یا نہیں۔ لیکن یہ ضرور یقین تھا کہ وہ ابھی ازدواجی زندگی میں داخل نہیں ہوئی ہے۔ ایک شادی شدہ عورت اور ایک بن بیاہی لڑکی میں بہت نمایاں فرق ہوتا ہے۔ بہرحال میں دل ہی دل میں اپنے تصورات سے گلو خلاصی حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن ناکامیاب ہوا۔ میں نے ہر چند اسے بھلانا چاہا لیکن نہ بھلا سکا۔ چند ہی دن میں مجھے معلوم ہو گیا کہ "یہ وہ نشہ نہیں جسے ترشی اتار دے" اس نے میرے تصورات پر قبضہ جما رکھا تھا۔ میری زندگی تلخ ہوتی جاتی تھی۔ میرے سارے منصوبے اور شادی کے نظریئے یکسر باطل ہو گئے اور میں نے مجبور ہو کر لکھنو میں اپنے چند احباب کے ذریعہ سے اس کے خاندانی حالات معلوم کئے اور اپنا پیام دلوا دیا۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ میری آواز صدا بصحرا ہو کر رہ گئی میرے واجبات پتھر دلوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گئے اور جو بازگشت پیدا ہوئی اس میں میں نے انکار سنا۔ انکار! اس لئے کہ میرے والدین رئیسانہ حیثیت کے مالک نہیں تھے اور اگرچہ میں بی۔اے پاس تھا لیکن ہنوز آسودہ معاش زندگی میں داخل نہیں ہوا تھا، میرے پاؤں میدان حیات میں کسی مرکز واحد پر نہیں جمے تھے، اگرچہ میرے والدین ایسے بھی کم حیثیت نہیں تھے کہ ایک لڑکی کا بار نہ اٹھا سکیں لیکن یہ خود مجھے بھی منظور نہیں تھا اور شادی کے لئے میں خود بھی پہلے نوکر ہونے کو ضروری سمجھتا تھا لیکن وہاں تو ریاست کی تلاش تھی اور انتظار ناگوار۔ غرضکہ پیغام رد ہو گیا۔ اور مجھے یقین ہے کہ کبھی نہ رد ہوتا اگر معاملہ میں صاحب معاملہ کا بھی دخل ہوتا۔ وہ یقیناً میرے ساتھ رہنا پسند کرتی اگرچہ میری رفاقت غربت و ناداری ہی کی رفاقت کیوں نہ ہوتی۔ اس کا مجھے غیبی یقین تھا۔ یہ میرا ایمان تھا۔ خیر۔ ان باتوں سے کیا ہوتا ہے جو کچھ ہونا تھا ہو گیا یا یوں کہئے کہ جو کچھ نہ ہونا تھا ہو گیا۔ بہرحال ایک بلکہ شاید دو پر ارمان دلوں کو کھلنے سے پیشتر ہی مرجھا دیا گیا۔

میں اپنی حسرت و مایوسی کا کوئی مبالغہ آمیز بیان نہیں دینا چاہتا۔ اتنا تو ضرور باور کر لیجئے کہ یہ زندگی میں میری پہلی ناکامی تھی اور اتنی ہی کارگر ثابت ہوئی جتنا کہ اسے ہونا چاہئے تھا۔ ہاں میری غم کوشیوں میں اس خبر نے اور اضافہ کر دیا تھا کہ اس لڑکی نے بھی اس نسبت کو

پسند کیا تھا مگر اُس بے زبان چڑیا کے اشارے کنائے جبر و استبداد کی دل شکن نگاہوں سے دبا دئے گئے، ٹھکرا دئے گئے۔ ایک عرصہ تک میں اس چوٹ کو سینے سے لگائے رہا۔ یہی غم میری ناکام محبت کی تنہا یادگار تھا۔ لیکن امتداد زمانہ زخم کو مندمل کرتا رہا سوگواری کے دن رفتہ رفتہ پورے ہونے لگے۔ اور آخر میں سوسائٹی کے غلط اصولوں اور بے راہ روی کو رو پیٹ کر بیٹھ رہا۔

(۳)

بی اے پاس کرنے کے بعد ایک سال مجھے کسی "باعزت نوکری" کی تلاش میں گزر چکا تھا آخر میں الہ آباد یونیورسٹی میں ایل ایل بی کلاس میں داخل ہوا اور دو برس میں وکالت پاس کر کے اپنے وطن میں پلٹا۔ اب سوال یہ تھا کہ وکالت کی جائے اور شاہ آباد ایسے مقام میں تو کامیابی معلوم۔ لہذا مناسب سمجھا کہ لکھنؤ میں قیام کروں اور وہیں اپنے پیشے کو انجام دوں۔ لکھنؤ میں میرے عزیز تھے نہ اقارب ہاں ایک دوست تھا "افضل" جو حال ہی میں ولایت سے بیرسٹری پاس کر کے آیا تھا اور پریکٹس شروع کرنے والا تھا۔ اس نے مجھے اصرار کے ساتھ دعوت بھی دی تھی کہ اُسی کے ساتھ آکر پریکٹس شروع کردوں۔

افضل تھا تو صرف میرا دوست لیکن ایسا دوست کہ جو زندگی بھر رفاقت رکھتا تھا وہ خلوص و ہمدردی، ایثار و محبت کا پُتلا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ خوش قسمت ہے وہ شخص جو اس دنیا میں ایسا ایک دوست بھی حاصل کر سکے۔ میں نے اور افضل نے ساتھ ہی انٹرنس ... شروع کی تھی اور ساتھ ہی بی اے پاس کیا تھا۔ اس دوران میں مجھ سے اُس سے اگر کبھی جدائی ہوتی تھی تو بہت قلیل اور عارضی، ہاں ایک طویل تفرقہ جب ہوا تھا کہ میں بی اے پاس کر کے تعلیم کا اختتام کر چکا تھا اور وہ بیرسٹری پاس کرنے ولایت روانہ ہو گیا تھا۔ ... ارادہ تھا کہ اُس کے ولایت میں تعلیم شروع کرنے کے ایک سال بعد میں نے بھی قانون پڑھنا شروع کیا تھا اور جب میں پاس ہوا تو افضل کو وطن لوٹے ہوئے ایک سال ہو چکا تھا لیکن وہ اس سال ہوا ... مشاغل میں ... رہا کہ پریکٹس نہ شروع کر سکا۔ ان میں سے ایک اس کی شادی تھی جو میرے پاس ہونے کے ساتھ ہی اختتام پذیر ہوئی تھی۔ یہ بھی حسن اتفاق کہ افضل کی شادی لکھنؤ میں انہیں دنوں ہوئی تھی جب میں الہ آباد میں ایل ایل بی کا امتحان دے رہا تھا اور افضل کو زندگی بھر یہ صدمہ رہا کہ اُس کا محبوب ترین دوست اس کی سب سے بڑی مسرت میں نہ شامل ہو سکا۔ سب سے بڑی مسرت میں نے اس لئے کہا کہ افضل کو شادی کی بڑی آرزو تھی، اور میرا خیال ہے کہ اُس نوجوان کو ہونا چاہئے جس نے شباب کی طوفانی گھڑیاں اسی دن کے لئے ایک طویل اور پرسکون انتظار میں بسر کی ہوں۔ خصوصاً افضل بی اے پاس کرنے کے بعد ہی شادی کا آرزومند تھا لیکن محض باپ کے اصرار سے ولایت تعلیم حاصل کرنے گیا تھا۔ اکثر لوگوں نے انہیں سمجھایا بھی تھا کہ جوان لڑکے کو اس سرزمین حسن و عشق پر اکیلے بھیجنا مناسب نہیں جہاں کی پریاں اکثر ہندوستان کے آدم زادوں کو بری طرح پھنسا لیتی ہیں اور سائے کی طرح ساتھ ہوئے بغیر نہیں مانتیں لیکن افضل کے والد کو اُس پر بھروسا تھا جس کی اُس نے لاج بھی رکھی تھی۔ اور واپس ہوتے ہی شادی کی نعمت حاصل کر لی تھی۔ ان سب واقعات کا مجھے علم تھا۔ اور افضل سے مجھ سے طے تھا کہ شادی کے بعد پہلا غیر مرد جس کے سامنے وہ اپنی بیوی کو بے نقاب لا سکے گا وہ میں ہوں گا۔ اس لئے جب میں نے افضل کو اپنی کامیابی اور تہنیت شادی کا ساتھ ہی تار دیا تو اُس نے اس خلوص و درد کے ساتھ مجھ سے لکھنؤ آنے اور ساتھ ہی پریکٹس شروع کرنے کی التجا کی جسے کوئی صاحب دل رد نہیں کر سکتا تھا۔ میں افضل کا جگری دوست تھا

(۴)

لکھنؤ اسٹیشن پر افضل میرے خیر مقدم کے لئے موجود تھا میں نے اُسے تین سال کے بعد دیکھا تھا۔ اس دوران میں وہ ذرا بھی نہ بدلا تھا۔ اگرچہ انگلستان ہو آیا تھا لیکن وہ اب بھی پہلا سا افضل تھا۔ مشرقی وضع و لباس، مشرقی تہذیب و تمدن کا دلدادہ افضل۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی "یو اولڈ بائے" کے بجائے وہی پیارا "جمیل" کہا اور گرمجوشی سے معانقہ کیا۔ اتنے عرصہ کے بعد ملنے پر ہم دونوں کچھ بے قرار تھے۔ جذبات کے ماتحت ایک دوسرے سے بات چیت نہ کر سکے دونوں کی آنکھوں میں مسرت کے آنسو جھلک رہے تھے لیکن تھوڑی دیر بعد جب ہم موٹر میں روانہ ہوئے تو گفتگو کا وہ لامتناہی سلسلہ چھڑ گیا جو گھر پہنچنے پر صرف اس وقت ختم ہوا جب افضل مجھے تنہا چھوڑ کر تھوڑی دیر کے لئے زنانخانہ میں گیا۔

میں افضل کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا جہاں ... کا سامان رکھا تھا۔ سامنے ایک قد آدم آئینہ لگا تھا جس میں میرا پورا عکس پڑ رہا تھا۔ اور جس کی اہمیت مجھ پر اُس وقت ظاہر ہوئی جب میں نے اُس میں ایک خاتون کا پیکر خراماں دیکھا۔ ... ہوا تھا کہ پیچھے سے ایک شفقت کی آواز آئی اور افضل مع اپنی بیوی کے کمرے میں داخل ہوا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو میں ایک لمحہ کے لئے مبہوت سا ہو گیا۔ میرے سامنے وہی ... لڑکی تھی جسے تین سال پیشتر میں نے پہلی مرتبہ لکھنؤ کی نمائش میں دیکھا تھا۔ افضل تعارفی الفاظ ادا کر کے ... دور کرنا چاہتا تھا جو مجھ میں اور اس کی بیوی میں پیدا ہو جانا لازمی تھا وہ کہہ رہا تھا "افضل میں نے تم کو آئینہ کے سامنے ... دیکھا تھا کہ تم اور ثریا ... سے غائبانہ مل چکے ہو۔ وہ خیر مقبول ... ناخوشگوار جھجک نہ محسوس کرو ... پیدا ہو جانا لازمی ہے۔" لیکن میں اس سب باتوں سے بے خبر تھا ثریا اب وہ ثریا نہ تھی جسے آج سے تین سال پیشتر میں نے دیکھا تھا وہ اب شباب و صحت ... ایک ... مجسمہ تھی جسے دیکھ کر نگاہیں مسحور ہو جاتی ہیں۔ بہرحال جلدی میں نے اپنے اوپر قابو پالیا اور ثریا سے ہاتھ ملانے کے لئے آگے بڑھا جس نے ہاتھ ہی نہیں ... بڑھایا خوش ہو کر مسکرائے اور میں نے افضل سے کہنا شروع کر دیا "مجھ سے اور تمہاری بیوی سے تو بہت پیشتر ہی ایک غائبانہ اور ناکامیابی تعارف ہو چکا ہے۔" ... اس نمائش ... کا بیان تھا ... میری داستان ... ثریا کا چہرہ ... تھا اور افضل ... غصہ ... بیان کبھی دوستوں میں ... ہوا ... مذاق ... نصیب تھا۔

(۵)

... میں افضل کا مہمان رہا اور مجھے ... معلوم ... ایک خدمت ... اور قیمت ... مخلص دوست کی معیت بھی ... جو ... کیونکہ ... حقیقت ... ہوتی دنیا میں اگر ... حقیقی مسرت کی جھلک ... خلوص ... کے بعد ... افضل سے خواہش کی کہ وہ مجھے ... مکان ... دلا دے تاکہ ... پریکٹس شروع کروں ... افضل ... اجازت ... تھا لیکن آخر کار میں نے اپنی درخواست منظور ... افضل کی کوٹھی کے ... ایک معقول عمارت کا بالائی حصہ تجویز ہوا ... ساز و سامان کے علاوہ ... افضل نے ... اپنی بیوی کی صناعی و دستکاری کے نمونوں سے آراستہ

۲۴۳

گردہا۔ رنگین منقش پردے۔ خوش رنگ خوشنما میز پوش اور نہ معلوم کیا کیا۔ میں بھی چپ دیکھتا رہا۔ اور آخر یہاں آکر مقیم ہوگیا۔

افضل اپنے پیشے کی ضروریات کے علاوہ زیادہ وقت میرے ہی ساتھ گزارتا۔ ٹینس کھیلتا تو میرے ساتھ کسی تفریح گاہ میں جاتا تو میرے ساتھ اور اکثر و بیشتر ان مشاغل میں اُس کی بیوی بھی ہماری شریک ہوتی۔

افضل کا حلقہ احباب نہایت محدود تھا۔ اور اگر کسی کو اُس سے اور اُس کی بیوی دونوں سے برابر کی بے تکلفی حاصل تھی وہ صرف مجھے۔ اب ہم ایک دوسرے سے اس قدر مانوس ہو چکے تھے کہ ہم میں سے کسی کی عارضی جدائی بھی باعث تکلیف تھی۔ جہاں تک افضل کا تعلق تھا یہ کافی بیباک تھا لیکن ثریا کی طرف سے میں بہت ہوشیار تھا اور محسوس کرتا تھا کہ اس میں اس درجہ انہماک احتیاط کا شیوہ نہیں خصوصاً جبکہ میں پیشتر ہی اس کی طرف سے ایک خاص جاذبیت محسوس کر چکا تھا۔

چھ مہینے کامل سکون و اطمینان کیساتھ گزر گئے۔ ہم لوگوں کو لکھنؤ اور اس کی صحبتوں سے کوئی سروکار نہ تھا ہماری دنیا الگ تھی اور ہم تینوں تک محدود۔ میں دو بجے کے قریب اپنی کچہری سے لوٹ آتا اور افضل چار بجے کے بعد گھر واپس آتے۔ چونکہ میں تنہا تھا اس لئے افضل کا حکم تھا کہ ثریا روشی میں میری جیبیں معاون ہو جایا کرے لہذا میں کچہری سے تھکا ماندہ واپس آتا تو اسی کو اپنا منتظر پاتا۔ نہیں کہہ سکتا کہ میرے آنے سے کس قدر قبل وہ وہاں آجاتی۔ میں اکثر اسے اپنی غزلوں کی نوٹ بک جس کے سرورق پر اُس نے اپنا تجویز کردہ نام "جوابہاے بہار" لکھا تھا پڑھتے پاتا۔ وہ کبھی مجھ سے میرے اشعار کی تعریف نہیں کرتی تھی لیکن اُسے ادب میں کافی دخل تھا یہ میں نے اس دن معلوم کیا جب اُس سے اپنے کلام پر تنقید چاہی۔ اُس نے کہا "آپ کی شاعری مجھے صرف اس لئے پسند ہے کہ آپ عام شاعروں کی طرح حسن کے آگے طفلی و یتیم نہیں نظر آتے۔ آپ نے اپنے اشعار میں عشق کی عظمت قائم کرنے کی کوشش کی ہے اور آپ بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں" میں نے مذاق کے طور پر کہا "میری شاعری کا یہ پہلو کم از کم تمہاری صنف کے لئے تو بہت دلشکن اور حوصلہ فرسا ہے" اس نے سنجیدگی سے جواب دیا "نہیں آپ کی کامیابی کا راز تو اس نکتہ میں ہے کہ اس کے باوجود بھی حسن کا وقار مجروح نہیں ہونے پاتا۔ بلکہ خیال ہوتا ہے کہ جب عشق اس قدر پرعظمت و باتمکین ہے تو حسن کیا ہوگا" میں نے کہا "اللہ اللہ گویا عشق کی عظمت و جلالت بھی وقارِ حسن کی رہینِ منت ہے۔ ورنہ بجائے خود ایک بے معنی چیز کیوں نہ ہو۔ جب تک اپنی صنف کی بڑائی کا کوئی پہلو نہ نکالیں آپ اُس کی صحیح نمائندہ ہی کب ہو سکتی ہیں"۔ وہ بولی "نہیں حسن کسی صنف کیلئے مخصوص ہے نہ عشق کسی صنف کا پابند۔ دونوں تو ہر حد سے آزاد ہیں"۔ میں نے گفتگو کو یہیں ختم کر دینا چاہا۔ اس لئے اُسے بھی آگے کچھ کہنے کی جرات نہ ہوئی۔

ایک ضرورت سے مجھے چند روز کے لئے گھر جانا پڑا۔ افضل نے متواتر خطوط سے میرا ناک میں دم کر دیا "جلد آؤ یہاں تمہارے بغیر سناٹا ہے۔ ہماری دلچسپیاں ختم ہوگئی ہیں۔ ثریا گھبرا گئی ہے"۔ اور نہ معلوم کیا کیا میں اس طومار سے عاجز آگیا۔ اور میں نے طے کر لیا کہ لکھنؤ خالی النفس کو نمحیدادوں تاکہ تعلقات خطرناک حد تک نہ بڑھ جائیں۔ لیکن جب میں واپس ہوا تو باوجود کوشش کے اُن سے ایسا نہ کہہ سکا۔ اتنے مخلص دوست سے جس کا دل میری طرف سے اُس آئینہ کی مانند صاف جس میں کسی غبار کی گنجائش ہی نہیں میں ایسی گفتگو کیونکر کر سکتا تھا۔ میں اپنے سے بدگمان تھا لیکن افضل مجھ سے بدگمان نہیں تھا۔ بہرحال میں نے اپنے رویہ میں ہلکی سی تبدیلی پیدا کرنا شروع کی۔ اور اپنے برتاؤ میں تھوڑی سی سردمہری شامل کر لی۔ اور خصوصاً ایسے مواقع رد کر دئے جن میں میں اور ثریا اکیلے ہوتے تھے۔ اوّل اوّل افضل اور اس کی بیوی دونوں میرے اس طرز سلوک پر متحیر ہوئے لیکن میں نے افضل کو تو شک ہی کی منزل میں رکھا۔ ہاں ثریا پر جو بالکل ناتجربہ کار اور معصوم فطرت تھی ظاہر کر دینا چاہا کہ مجھ میں اس درجہ انہماک خطرہ سے خالی نہیں۔

ایک دن جب میں کچہری سے لوٹا اور ثریا نے حسب معمول چائے کی ایک پیالی بنا کر مجھے پیش کی تو میں نے کہا "ثریا اب تم کب تک یہ زحمتیں گوارا کرو گی۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو"۔ مجھے محسوس ہوا کہ میرے اس جملہ سے اُسے چوٹ سی لگی۔ بڑھتا ہوا ہاتھ ایک لمحے کے لئے کانپ گیا اور پھر ثریا اس درد و خلوص کے ساتھ جس نے مجھے ۔ ۔ ۔ آنکھوں میں آنسو بھر لانے پر مجبور کر دیا مجھ سے کہہ رہی تھی "کیا آپ مجھ سے کچھ ناراض ہیں؟" "نہیں" میں نے فوراً یقین دلایا "لیکن میں اُس تکلیف کی پیشقدمی کر رہا ہوں جس سے مجھے اُس وقت دوچار ہونا پڑے گا جب تم میرے ساتھ چائے نہ پی سکو"۔ وہ بڑی معصومیت سے بولی "خدا نہ کرے ایسا کیوں ہونے لگا؟"۔ مجھے اُس کی بھولی باتوں پر ہنسی آگئی۔ لیکن میں نے طے کر لیا تھا کہ اُسے خطرات سے آگاہ کر دوں گا چنانچہ اس کی ہوجوکی سے بے خبر بن کر کیتلی پر نگاہیں جمائے ہوئے میں نے کہنا شروع کیا "ثریا تم ناتجربہ کار ہو۔ تمہیں ان خطرات کا احساس نہیں جو میں تمہاری معیت میں محسوس کرتا ہوں۔ دیکھو ہماری سوسائٹی نے ابھی اتنی ترقی نہیں کی ہے کہ وہ دو غیر عورت و مرد کو چاہے وہ کتنے ہی پاکباز ہوں اور نیک نفس کیوں نہ ہوں اس قدر آزادی کے ساتھ ایک دوسرے سے ملنے کی اجازت دے ضرور کوئی نہ کوئی ناگوار صورت پیش آئے گی اور پھر سوائے پچھتانے کے کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔ اس سے میرا یہ مطلب نہیں کہ تم مجھ سے بالکل منحرف ہو جاؤ۔ اگر تم ایسا کرنا بھی چاہو تو شاید افضل کی زندگی میں ممکن نہیں لیکن بہتر یہ ہے کہ تم مجھ میں اس قدر گہری دلچسپی نہ لیا کرو جو آگے چل کر میرے و تمہارے دونوں کے لئے مہلک ثابت ہو"۔

ثریا خورد تامل کے ساتھ میری تقریر سنتی رہی۔ پھر تھوڑی دیر بعد ایک نیم تبسم کے ساتھ خدا حافظ کہہ کر مجھ سے رخصت ہوگئی۔

(۶)

ایک ہفتہ تک ثریا میری کوٹھی پر نہ آئی۔ اگرچہ اس دوران میں افضل بھی کثرت کار کی وجہ سے مجھ سے کم مل سکا لیکن وہ اس کے ساتھ بھی نہ آئی۔ مجھے معلوم ہوا کہ اُس کی طبیعت کچھ ناساز ہے اور وہ زیادہ تر خاموش رہتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس دوران میں میرا بھی کچھ یہی عالم ہوگیا تھا عادت بری بلا ہوتی ہے، مجھے ثریا کے ساتھ چائے پینے اُس سے ہنسنے بولتے کافی زمانہ گزر گیا تھا۔ یکایک یہ سلسلہ منقطع ہو جانے سے میں اور وہ دونوں مکدر سے ہوگئے۔ لیکن میں نے اُسے کوئی اہمیت نہ دی اور سمجھا کہ کچھ دنوں میں یہ اضمحلال ختم ہو جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہوا بھی۔ ثریا کی غمگینی رفع ہوگئی۔ اور وہ مجھے پھر اُسی طرح بشاش بشاش نظر آنے لگی جیسی کبھی پہلے تھی۔ درحقیقت وہ ابھی اُس عمر ہی کو نہ پہونچی تھی جس کے بعد ایک عورت اپنے دل میں کوئی دیرپا خیال یا فکر قائم کر سکتی ہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ صرف ہنسنے ہنسانے کے لئے پیدا ہوئی ہے۔ خوش مزاجی اور بشاشت کی چلتی پھرتی تصویر ۔۔۔ وہ ہر وقت مسکرایا کرتی۔ اُس کی آنکھیں مسکراتیں اُس کی پیشانی مسکراتی اور اُس کا رواں رواں مسکراتا۔ ناممکن تھا کہ کوئی اس کے روبرو ہو اور اپنا رنج و غم فراموش نہ کر دے لیکن میری کبیدگی خاطر اتنے دنوں کے بعد بھی نہ گئی اور مجھے محسوس ہونے لگا کہ چند نہیں عائد کر کے تو میں نے اپنے حق میں اور کانٹے بوئے ہیں۔ اب ثریا مجھ سے گفتگو میں اس حد تک بے تکلف نہ تھی جتنا

کہ پہلے۔ وہ مجھ سے نگاہیں چار کرتی گھبراتی تھی اور اکیلے تو جب کبھی ہوتی کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے چلدیتی مجھے بہر طور اپنے اوپر کافی اعتماد تھا۔ اور میں اُس کی ان گریز پائیوں سے لطف اٹھانے کے لئے ابھی کبھی۔ اُسے چھیڑتا جس پر وہ ایک بے اختیار قہقہہ لگا دیتی۔ لیکن اب کہ زیادہ تر اس سے علیحدگی ہی رہتی تھی میں بُری طرح تنہائی محسوس کرتا تھا۔ اس سے پیشتر چونکہ وہ اکثر میرے سامنے ہی رہتی تھی مجھے اُس کے خیال کا موقع نہ ملتا تھا۔ لیکن اب بیشتر میں اُس کے خیال میں غرق رہتا۔ اس کی دلچسپ باتیں یاد آتیں۔ اُس کا مُسکراتا ہوا چہرہ پیش نظر رہتا اور سب سے بڑھ کر اُس کی بلند فطرت اور اعلیٰ ذہانت دل پر سکہ جمائے رہتی۔ میں نے ان تصورات سے سبکدوشی حاصل کرنا چاہی لیکن نہ کر سکا۔

آخر کار میں افضل کی کوٹھی پر گیا۔ صبح کا وقت تھا۔ افضل چائے کی میز پر بیٹھے ثریا کے منتظر تھے۔ مجھے دیکھتے ہی اُٹھ کھڑے ہوئے اور پہلو میں بٹھالیا۔ اتنے میں ثریا بھی آگئی اور میں نے اُس سے بغیر کسی تمہید کے کہنا شروع کر دیا۔ "دیکھو تم نے میرے یہاں آکر مجھے چائے پلانا چھوڑ دیا ہے اور اس سے ایک شریف آدمی کی زحمتوں میں اضافہ ہے۔ تم اپنی صفائی میں کوئی معقول عذر پیش کر سکتی ہو؟" وہ میری اس دلیری پر بے اختیار ہنسنے لگی اور افضل نے گھبرا کر اپنی برأت ظاہر کی۔ آخر کو ثریا نے الزام اپنے سر لے لیا اور کہا۔ "اعترافِ قصور کے بعد اس کے سوا کیا کہہ سکتی ہوں کہ اب انشاء اللہ تلافی کی کوشش کروں گی۔"

دوسرے دن ثریا چائے کے وقت میرے یہاں موجود تھی۔ ہم دونوں اپنی گزشتہ باتوں پر خوب ہنسے اور میں نے اُسے یقین دلایا۔ "ثریا میں ہمیشہ میں رہوں گا۔ تم ہمیشہ تم میرے اوپر اعتماد کرو۔ اور مجھ سے اتنا نہ ڈرا کرو۔"

وہ ہر طرح سے مطمئن نظر آتی تھی اور میں بھی اپنے جی پر بوجھ ہلکا ہوتے ہوئے محسوس کرتا تھا اس کے بعد ثریا روز تو نہیں لیکن ہفتہ میں ایک آدھ مرتبہ ضرور چائے پر میرے ساتھ شریک ہو جایا کرتی۔ اور اُس کے اس طرز عمل پر مجھے بھی کسی اندیشے کی گنجائش نہ تھی۔ ایک زمانہ یوں ہی گزر گیا۔

(۳)

دُنیا اس ہنگامہ پرست دنیا میں اتنی بھی گنجائش نہیں کہ دو دل یکجا رہ سکیں۔ مجھے ثریا اور افضل سے اور ثریا اور افضل کو مجھ سے محبت تھی۔ ایک بے لوث بے غرض محبت۔ جہاں تک ثریا کا تعلق تھا میرا صرف یہی چاہتا تھا کہ میں اُسے اُس کے شوہر کے ساتھ خوش و خرم دیکھوں اور بس۔ اور یہی وجہ تھی کہ ایک مرتبہ میں نے اپنی خواہش کو بھی ترک کر کے دیکھ لیا تھا اور تجربہ کیا تھا کہ اگر سامان تسلی اس حد تک بھی نہ بہم پہنچے تو کہیں ایک دن دبی ہوئی چنگاری مشتعل ہو کر شعلہ فشاں نہ ہو جائے لیکن سوسائٹی اس صورت حال کو کب ٹھنڈے دل سے دیکھ سکتی تھی۔ میری اور ثریا کی بابت چرچے ہونے لگے۔ کوئی مجھے بُرا کہتا تھا کہ افضل کا اتنا مخلص دوست ہو کر اُس کے ساتھ دغا کر رہا ہوں۔ کوئی ثریا کو سارے فساد کا باعث ٹھہراتا اور ان دونوں صنفوں میں زیادہ تعداد اس گروہ کی تھی جو افضل کو قابل الزام ٹھہراتا۔ "نہ اس حد تک آزادی برتی جاتی نہ یہ انجام ہوتا۔" اس قسم کے جملوں سے فضا ملوث نظر آنے لگی۔ حالانکہ ابھی تک خدا نہ کردہ کسی انجام سے ہم تینوں اُسی طرح بے خبر تھے جس طرح یہ الہام دینے والے۔

ہوتے ہوتے بات افضل کے کان تک پہونچی۔ اُس نے ان بے خود غلط افواہوں کو اسی بے توجہی اور حقارت سے سُنا جس کے لئے ایسے آزاد خیال ہمیشہ پہلے ہی سے تیار رہتے ہیں وہ ان باتوں کو اس قابل بھی نہ سمجھتا کہ ایک حقارت آمیز مسکراہٹ سے اُن کا خیر مقدم کرتا۔

اکثر انسان کو وہی کرنا پڑتا ہے جو وہ نہ چاہے۔ نوبت یہاں تک پہونچی کہ اُس کے ان نام نہاد دوستوں کا حسد و عناد جنہیں ثریا کے ساتھ زیادہ بے تکلفی حاصل نہ تھی طعن و تشنیع کی صورت میں ظاہر ہونے لگا۔ اکثر میرے اور اُس کے دونوں کے سامنے کوئی نہ کوئی دلخراش جملہ کہہ دیا جاتا اور صرف افضل کے حلم و اخلاق کی بدولت واقعات ناگوار صورت اختیار کرتے کرتے رہ جاتے۔

اِن سب باتوں کا اثر کہاں تک نہ ہوتا۔ افضل غیور تھا۔ باعزت تھا اور مالی و خاندانی دونوں حیثیتوں سے ایک معزز پوزیشن کا مالک۔ اس میں شک نہیں کہ وہ ایک حد تک ان ناخوشگوار نتائج کا ذمہ دار بھی تھا۔ آخر کار اُسے اپنی بدنامی کا خطرہ ہونے لگا۔ اگرچہ اُسے مجھ پر اور اپنی بیوی دونوں پر کامل اعتماد تھا اور وہ ہمارے تعلقات میں خفیف سے خفیف رکاوٹ بھی غیر منصفانہ ہی نہیں بلکہ ایک بہیمانہ اور ظالمانہ حرکت خیال کرتا تھا۔ لیکن زمانہ اُسے موجودہ رویہ میں تبدیلی کرنے پر مجبور کر رہا تھا۔ ایک مدت تک وہ ایسا کرنا گناہ سمجھتا رہا۔ اخلاق اور خلوص کا گناہ۔ وہ جانتا تھا کہ ایسا کرنے سے دو پاک دل مجروح ہو جائیں گے۔ جب وہ عرصہ تک کوئی عملی اقدام نہ کر سکا اور میں نے اُس کے پس و پیش کی یہ کیفیت دیکھی تو خود اُسے ہمت دلائی اور آمادہ کیا کہ وہ اپنے ارادوں کو عملی جامہ پہنائے۔ میں نے اُسے سمجھایا کہ ہم تینوں کے مفاد کے لئے ایسا ضروری تھا۔ ثریا کو بھی اب کافی سمجھ آچکی تھی۔ اس لئے وہ بھی راضی ہوگئی کہ میرے ساتھ برتاؤ میں وہ کشیدگی اختیار کرے جو غیریت کے مرادف ہے۔

اس میں شک نہیں کہ شروع میں اس تبدیلی سے ہم سب کو کافی تکلیف ہوئی لیکن نوجوان طبیعتوں کا خاصہ ہے کہ جب وہ خود اپنے اوپر کوئی تکلیف عائد کرتی ہیں تو اُسے طول دینے میں انہیں ایک لذت سی محسوس ہونے لگتی ہے اور اُسے روز بروز سخت تر بناتی چلی جاتی ہیں حتیٰ کہ یہی لذت آزار اکثر خودکشی کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ اُن سختیوں میں جو ہم نے اپنے اوپر عائد کر لی تھیں ایک حد تک یہی جذبہ کارفرما تھا۔ میں نے افضل کے مکان سے دور ایک مکان کرایہ پر لیا۔ اب کئی کئی مہینہ گزر جاتے کہ میں افضل سے نہ ملتا۔ ثریا تو بالکل پردہ نشین ہوگئی تھی۔ افضل کو بھی چونکہ دوستوں میں سے کسی پر اعتماد نہ تھا۔ اس لئے اب وہ باہر نکلنے میں اُس کی ہمت افزائی نہ کرتا۔ میری ہمراہی میں وہ اُسے ہر خطرہ سے آزاد خیال کرتا تھا۔ لیکن اب ایسا نہ تھا۔

دنوں نے ہفتوں اور ہفتوں نے مہینوں کی شکل اختیار کر لی۔ لیکن ہمارے رویہ میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ بیشک ہماری طبیعتیں مکدر سی رہنے لگیں۔ افضل بھی اب پہلا سا خوش مزاج افضل نہیں تھا۔ اس کا باعث یہ تھا کہ ثریا کی صحت خراب رہنے لگی تھی۔ اُس کا ایک حمل ساقط ہو گیا تھا جس کے بعد سے وہ کمزور ہوتی چلی گئی اور بیمار رہنے لگی۔ گرمیوں میں مجھے معلوم ہوا کہ افضل ثریا کو لیکر پہاڑ گیا ہے اور ایک ہوٹل میں مقیم ہے۔ وہاں اُس کے خطوط سے مجھے آگاہی ہوئی کہ ثریا کی حالت روز بروز نازک ہوتی چلی جاتی ہے۔ مجھے بہت تشویش رہتی اور میں اُس کے لئے دُعا کیا کرتا۔ آخر ایک دن مجھے افضل کا ایک خط ملا لکھا تھا کہ ثریا کی حالت سنبھل چلی ہے مجھے کچھ اطمینان سا ہو گیا لیکن دوسرے ہفتہ میں ہوٹل کے منیجر کا تار میرے نام آیا لکھا تھا "ثریا کی حالت غیر ہے مسٹر افضل کے دماغ پر فکر و صدمہ سے خطرناک اثر پڑا ہے۔ جلد از جلد آیئے۔"

میں پہاڑ پر پہنچا تو مجھے اپنے دوست کا وہ منظر نظر پڑا جو خدا کسی دوست کو نہ دکھائے۔ ہوٹل کے دروازہ پر افضل ملا۔ اُس کے بال پریشان تھے لباس میلا اور بے ترتیب۔ وہ جنونانہ طور سے دوڑ کر مجھ سے لپٹ گیا اور اُس نے کہنا شروع کیا۔ "خلیل میں تباہ ہو گیا۔ ثریا مجھے چھوڑے جاتی ہے چلو چلو اندر چلو اس کی حالت دیکھو۔"

میں اُسے تسلی دیتا ہوا دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اندر گیا تو مجھے ایک مسہری پر ثریا

۲۳۶

نظر پڑی۔ نہیں ثریا نہیں کوئی اور۔ شاید اُس کا سایہ گزشتہ حسین و تندرست ثریا کا ایک موہوم سا نقش، بگڑی ہوئی صحت کا ایک دلخراش مرقع، مٹی ہوئی جوانی کی ایک دردناک تصویر وہ اپنے بستر پر نیم بیداری کی حالت میں دراز تھی۔ اُس کی آنکھوں میں حلقے پڑ گئے تھے، رخساروں پر سیاہی دوڑ گئی تھی اور وہ صرف پوست و استخواں کا ڈھانچہ تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اُس کے ہونٹوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ آ گئی ایک غمگین و سوگوار مسکراہٹ اور میں باوجود کوشش کے آنسو نہ ضبط کر سکا لیکن میں نے خود کو سنبھالا اور پاس بیٹھ کر تسلی آمیز باتیں شروع کیں۔ میں نے طے کر لیا کہ جب تک اُسے صحت نہ ہو جائے گی پہاڑ سے نہ اُتروں گا۔

میں نے ثریا کی تیمارداری میں جان لڑا دی۔ مشہور ڈاکٹروں کے مشورے سے علاج کیا اور اپنی پوری توجہ ثریا کی دلجپسی میں صرف کر دی۔ دن بھر اُس کے سرہانے بیٹھا اُس سے خوشگوار باتیں کیا کرتا۔ اُسے نئے نئے قصے سُناتا، اخبار اور رسائل پڑھتا۔ تاش کھیلتا۔ غرضکہ ہر طرح سے اُس کا جی بہلاتا اور صحت کا یقین دلاتا۔ میں نے محسوس کیا کہ دواؤں سے زیادہ وہ میری توجہ کی محتاج تھی۔ جب میں ضربات نبض شمار کرنے کے لئے اُس کی نازک کلائی ہاتھ میں لیے ہوتا تو محسوس کرتا کہ زندگی کا خون اس کی آنکھوں میں دوڑ رہا ہے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں اس کی طبیعت اصلاح پر آنے لگی۔ ایک مہینہ بعد وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی اب وہ قریب قریب صحتمند ہو چکی تھی۔ حرارت زائل ہو گئی تھی۔ قوت آنا باقی تھی۔ دوسرے پندرہ روزوں میں یہ کمی بھی پوری ہو گئی۔ پہاڑ کی فرحت بخش ہوا نے انفاسِ مسیحا کا کام کیا اور اُس کی حالت پورے طور سے قابل اطمینان ہو گئی۔ میں اس کی طرف سے بے فکر ہوا ہی تھا کہ ایک دن اُس نے ایک وحشتناک خواب بیان کر کے میرے سکون و طمانیت کو پھر لوٹ لیا۔ وہ اپنی مسہری پر لیٹی کہہ رہی تھی

"میں نے دیکھا کہ میں ایک رنگین و خنک شام کو ٹہلتے ٹہلتے دور نکل گئی ہوں۔ دور اِس کارگاہِ حیات کے اس ہنگامہ زار بستی سے بہت دور مجھے ایک باغ نظر پڑا۔ فرحت بار اور تسکین بخش۔ میری روح پر نیند سی طاری ہونے لگی۔ میں نے تھوڑی دیر وہاں گلگشت کی کلیوں کو مسکراتے ~~~ پھولوں کو کھلتے اور شاخوں کو لچکتے دیکھا۔ ابھی اس عجیب نظارہ کو زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ ابھی میں اُس باغ سے پورے طور پر لطف اندوز بھی نہیں ہونے پائی تھی کہ میں یکایک باغ کے بالکل کنارے پر آ گئی۔ ایسے کنارے پر کہ زمین میرے قدموں سے نکلنے لگی میں نے لاکھ پاؤں جمانا چاہا لیکن نہ سنبھل سکی دفعتاً میں ایک ہولناک اور مہیب غار میں گر گئی ہاں غار کی نامحدود گہرائیوں میں جہاں سوائے تاریکی اور موت کے کچھ نہیں تھا" میں دہل گیا ثریا کی آنکھوں میں ایک آسمانی چمک تھی "ہاں تو میں اس عمیق اور پُرہول غار میں گر گئی اور اس میں سے مجھے آپ بھی نہیں نکال سکے۔" میں نے اپنی تشویش اُس پر نہ ظاہر ہونے دی۔ اور یہ کہکر اُسے تسلی دی کہ اکثر گزشتہ واقعات خواب کی شکل میں پیش نظر ہو جاتے ہیں۔ یہ وہی لکھنؤ والا واقعہ تھا جب تم کھڈ میں گر گئی تھیں اور میں نے تمہیں نکالا تھا جس نے پھر خواب میں آ کر تمہیں ڈرا دیا۔ وہ قائل سی ہو گئی اور میں نے بھی پھر اس خواب پر کچھ زیادہ دھیان نہیں دیا۔

(۸)

افضل جو ثریا کی طرف سے مایوس ہو کر قریب قریب اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا۔ اب اچھا تھا۔ تاہم وہ اُس سے بہت کم بولتا۔ وہ اُس کی صحت کے لئے مجھے زیادہ ضروری سمجھتا تھا۔ روزِ سہ پہر کو میں اور ثریا تنہا ٹہلنے جاتے اور وہ باوجود اصرار کے کبھی ساتھ نہ ہوتا۔ نہ معلوم کیوں وہ ثریا سے ڈرنے سا لگا تھا اور اُس سے علیحدہ رہتا تھا۔ وہ ابھی اس کی طرف سے کچھ مطمئن نہیں تھا۔ اور اس کے اس رویّہ پر میری بار بار کی پرسش کا بھی اس کے پاس کچھ جواب نہیں تھا۔

ایک شام کو جبکہ مطلع معمول سے زیادہ صاف تھا۔ ہوا میں ایک لطیف سی خنکی تھی اور دور برفپوش پہاڑوں کی چوٹیاں آفتاب کی سُنہری شعاعوں سے جگمگا رہی تھیں۔ ثریا میرے ہمراہ ٹہل رہی تھی۔ وہ اب اپنی صحتِ رفتہ کا بیشتر حصہ حاصل کر چکی تھی اور آج ایک سپید ململ کی ساری میں ملبوس جس میں سے اُس کا شیام رنگ حُسن پھوٹا نکلتا تھا، اپنے اعضا میں روشن آثار شکستگی اپنے حرکات میں نمایاں درد و خستگی لئے ٹہل رہی تھی۔ وہ آثار شکستگی اور وہ درد و خستگی جس کی داد میرے خیال میں صرف افضل دے سکتا تھا، لیکن وہ وہاں نہیں تھا اور ثریا کو اس کی پروا بھی نہیں تھی۔ وہ بھی اس کی طرف سے غافل تھی، ہم دونوں یونہی ٹہلتے ٹہلتے ایک بے خبری کے عالم میں نہ معلوم کتنی دور نکل گئے۔ پھر ایک آبشار کے کنارے اور وہاں بیٹھ کر ثریا نے بڑی پُرسوز دھن میں گانا شروع کیا۔ اس کی نرم و شیریں آواز کی ہلکی موسیقی آبشار کے فطری نغمہ میں مل کر روح کو سُلائے دیتی تھی۔ قرب و جوار کے پہاڑوں سے آواز بازگشت پیدا ہوئی، یہاں تک کہ ساری فضا ترانوں سے بھر گئی، کائنات کا چپہ چپہ موسیقی سے لبریز ہو گیا۔ ثریا میرے روبرو بیٹھی تھی وہ مجھے آج خدا معلوم کن نظروں سے دیکھ رہی تھی اور میں نہیں کہہ سکتا کہ مجھے بھی وہ کیا معلوم ہو رہی تھی، میرا ہاتھ اُس کے ہاتھ میں تھا، اور وہ آنکھوں میں آنسو بھرے اپنی روح کی تمام بیتابیاں اپنی آواز میں منتقل کیے گا رہی تھی

"کیا بتائیں عشق ظالم کیا قیامت ڈھائے ہے
یہ سمجھ لو جیسے دل سینے سے نکلا جائے ہے
کس طرف جائیں کدھر دیکھیں کسے آواز دیں
اے ہجومِ نامرادی جی بہت گھبرائے ہے"

میرے سارے جسم میں بجلیاں دوڑنے لگیں، میں نے گھبرا کر اپنا ہاتھ چھڑا لیا، وہ میری اس حرکت پر مسکرائی، پھر آہستہ آہستہ نظریں میرے رُخ سے ہٹاتے ہوئے آبشار پر نظریں جما کر وہ شعر گانے لگی جس کا دوسرا مصرع یہ ہے

"جو کرے ہے عشق سنتے ہیں جواں مر جائے ہے"

میں کانپ گیا دفعتاً اُٹھ کھڑا ہوا اور بولا "ثریا! لِلّٰہ ختم کرو! میں تمہاری اس بیداد موسیقی کا حریف نہیں یہ میرے تباہ کر دینے کو کافی ہے۔" اُس نے دامن پکڑ کر مجھے بٹھا لیا اور کہا "لیجئے آپ کو اپنی تباہی کا ڈر ہے تو میں ختم کیے دیتی ہوں، ذرا بیٹھ تو جائیے کہ اس طرح آپ کے اُن مہلک احسانات میں ایک اور جانستاں اضافہ ہو جو مجھے مدت سے ہلاک کر رہے ہیں اور کر رہے ہیں چکے۔" میں بغیر کچھ جواب دئے بیٹھ گیا۔ اور میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں خمار آلود ہیں، اس وقت اُن میں کئی نشے موجود تھے موسیقی کا نشہ، جوانی کا نشہ اور محبت کا نشہ۔ تب میں نے جان لیا کہ اس کی ساری ہستی، اس کا سارا وجود، میری آغوش کے لیے اُس قطرۂ شبنم کی طرح مضطر و لرزاں ہے، جو پھول کی ایک پنکھڑی کے نئے فضا میں دھڑکا کرتا ہے۔ میری ایک ہلکی سی جنبش پر وہ اپنا سب کچھ نثار کر دینے کو تیار تھی، فراوانی جذبات سے جھوم جھوم کر وہ میرے ہاتھ کو مروڑے ڈالتی تھی، میں نے اس عالم میں اُسے کبھی نہیں دیکھا اور یہ وقت میرے لئے بہت سخت تھا، تاہم میں نے اپنے اوپر بڑا جبر کیا اور کہا "دیکھو ثریا یہ لذتیں ہماری برداشت سے باہر ہیں، ان کو یہیں پر ختم کر دو۔ ورنہ مجھے ڈر معلوم ہوتا ہے کہ اگر ہم اِن کو طول دیں تو فطرت ہم سے انتقام لینے پر نہ آمادہ ہو جائے" لیکن وہ اس روز اپنی اور میری دونوں کی ہستی تباہ کر دینے کی قسم کھائے ہوئے تھی، اُس نے کہا اور اس کے لہجہ میں شباب و سرمستی کی وہ کھنک موجود تھی جو ایک پُرارمان دل کو آپے سے باہر کر دینے کے لئے کافی ہے۔ "کیا یہ لذتیں اس قابل نہیں کہ ان کی قیمت کسی شے سے ادا کی جائے، جان سے"

عزت سے، ایمان سے اور ابھی تو اُس کا وقت بھی نہیں آیا ہے۔ ابھی تو ہم خود فطرت سے انعام لے رہے ہیں۔" میں نے دل پتھر کا کر لیا اور کہا "دیکھو ثریا ہم کو اپنی حدود سے آگے نہیں بڑھنا چاہیے تمہارا جسم میرے لئے نہیں ہے۔ لہٰذا مجھے یونہی محروم رہنے دو کہ یہی محرومی میرے لئے ہزار کامرانیوں سے زیادہ قاتل و مہلک ہے مجھے اس لمس سے باز رکھو کہ دنیا اُسے گناہ سے تعبیر کرتی ہے۔" "گناہ" ثریا نے ایک قہقہہ لگایا جس میں فطرت کا زہر خند شامل تھا "بےشک گناہ، اپنا گناہ، تمہارا گناہ اور نفس کا گناہ، لیکن آہ یہ دنیا کیا ہے، یکسر گناہ، سراسر معصیت، ہماری ہر سانس معصیت ہے ہمارا وجود گناہ ہے۔ پھر کیوں میں اپنے گناہ کا کفارہ ادا کروں گی۔ خدا کے لئے عقیل میرا حال سن لو پھر تمہیں اختیار ہے۔ چاہے مجھے ایک نگہ التفات سے ہلاک کر دینا چاہے ایک نگاہ کرم سے جینے دو دونوں برابر ہیں۔" اُس نے میری دونوں کلائیاں اپنی مٹھیوں میں مضبوط پکڑ لیں اور کہنا شروع کیا "میں تم سے محبت کرتی ہوں، اُس دن سے محبت کرتی ہوں جس دن میں نے تمہیں پہلی مرتبہ نمائش میں دیکھا۔ ایک غیر فانی اور بے زبان محبت، میں نے اس کو ہمیشہ مغلوب کرنے کی کوشش کی۔ لیکن نہیں کر سکی اور خوش ہوں کہ نہیں کر سکی اس کا مجھے کوئی صدمہ نہیں زیادہ سے زیادہ یہ ہوا کہ میری زندگی تباہ ہو گئی لیکن کیا پرواہ ہے زندگی کا مقصد، ایک عورت کی زندگی کا مقصد حاصل ہو گیا۔ تمہیں کیا نہیں معلوم کہ میں نے اپنی محبت پر فتح پانے کی کیسی کیسی کوششیں کیں۔ طویل راتوں کی خونابہ اور مایوس تنہائی میں میں نے اس کا گلا گھونٹنا چاہا لیکن ناکام رہی۔ میں اس آگ کو نہیں بجھا سکی۔ میں عورت ہوں کمزور عورت، محبت میرے لئے بہت قوی ثابت ہوئی یہ سب یاد ہے، تم نے بھی دیکھا ہوگا، تمہیں بھی خبر ہوگی کہ میں نے کتنے دنوں اس آگ کو اپنے سینے میں دبائے رکھا، اور ظاہر نہیں ہونے دیا لیکن میں مجبور ہو گئی۔ یہ میری [illegible] پھر میں بیمار ہو گئی اور مرنے لگی، لیکن تم نے آکر مجھے بچا لیا، ایک مرتبہ مارنے کے لئے جلا لیا۔ اور آہ اب زندگی میری برداشت سے باہر ہے میں اب جی نہیں سکتی۔ یہ زندگی میرے واسطے زندہ موت ہے، یہ دنیا جہنم ہے لیکن ہاں یہی جہنم ابھی رشک فردوس ہو جائے اگر تم آج صرف ایک مرتبہ مجھے نگاہ محبت سے دیکھ لو۔ ہائے میں آج تک [illegible] نہیں پایا" یہ کہتے کہتے اُس نے مجھے ان پر مطلب نظروں سے دیکھا کہ میں دیوانہ ہو گیا دیوانہ وار میرا جی چاہا کہ میں اُسے سمیٹ کر اپنے سینے میں چھپا لوں، اُس کے ہونٹوں پر، اُس کے رخساروں پر اُس کے بالوں پر بے شمار بوسے دوں، تشنہ اور پُرشوق بوسے اور اپنی ہستی کو اس کی ہستی میں [illegible] روح کو اُس کے سینے میں جذب کر دوں لیکن میں نے ایسا نہیں کیا، ایک غیبی قوت نے مجھے ایسا کرنے سے باز رکھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور منہ اس کی طرف سے پھیر لیا [illegible] کہ وہ بالکل سنجیدہ ہو گئی اور مجھ سے کہنے لگی "عقیل سنو، میری ایک بات سنو نہ معلوم کیوں مجھے ڈر معلوم ہو رہا ہے شاید میں زیادہ زندہ نہیں رہوں گی، یہ لمحے مجھے ختم کر دیں گے۔ یہ لمحے بہت مختصر اور قیمتی ہیں میری ایک بات سن لو اگر میں مر جاؤں تو تم رنج نہ کرنا۔ اور خدا کے لئے کوئی ایسا اقدام نہ کر بیٹھنا کہ میری روح کو صدمہ ہو" میں نے کہا "ثریا تم ابھی بہت جیو گی، یہ کیسی باتیں کرتی ہو۔ ان اوہام کو بھلا دو۔ اس وقت تو کم از کم فطرت ہم پر مہربان ہے کیوں نہ ہم گزشتہ اور آئندہ دونوں کو حال کی مسرت بخش لہروں میں بہا دیں۔" وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مجھے دیکھ رہی تھی میں نے بڑی محبت سے اُسے دیکھا اور اُس کے بالوں پر ہاتھ پھیرا، وہ فراوانی جذبات سے یکایک نیم بیہوش سی ہو کر میری آغوش میں گر پڑی میں گھبرا گیا، یکایک وہ خود چونک پڑی۔ اُس نے میری پشت پر قدموں کی آہٹ سن لی تھی اُس نے سر اٹھا کر دیکھا اور دفعتاً اُس کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی، اس نے میرے عقب میں کسی کو دیکھ لیا تھا۔ ہاں خود کو میری آغوش میں اور کسی کو میرے عقب میں دیکھ لیا تھا۔ میں بھی مڑا کہ دیکھوں پیچھے کون ہے بس اُس لمحۂ مختصر میں کہ شعلۂ برق سے بھی مختصر تھا اُس نے ایک نسبتاً ایک بلند اور وحشیانہ [illegible] اور میں نے دیکھا کہ ہوا نے اُسے اپنے بازوؤں پر اٹھا لیا وہ اڑی اور ہوا میں اس کا لباس اڑا۔ پھر بعینہٖ اس طرح جس طرح کہ آسمان سے کبھی کبھی کوئی روشن ستارہ ٹوٹتا ہے اور خود بخود فضائے بسیط میں غائب ہو جاتا ہے۔ ثریا [illegible] ہمیشہ کے لئے غائب ہو گئی۔

میں بھی چاہتا اُس سے ہمیشہ کے لئے مل جاؤں لیکن آہ میری قسمت میں زندگی اس منحوس زندگی کی تلخیاں کچھ باقی تھیں [illegible] اُسی لمحے کسی نے دوڑ کر مجھے اپنے بازوؤں کی مضبوط گرفت میں لے لیا میں نے آنکھ اٹھا کر دیکھا وہ میرا قاتل یعنی الفضل تھا شاید موت بھی مجھ سے متنفر ہو گئی۔ اس نے مجھے قبول نہیں کیا۔

اب یہ کہنا بیکار ہے کہ اس کے بعد بھی میں نے کئی مرتبہ کوشش کی [illegible] مل جاؤں لیکن مجھے ہمیشہ ایسے اقدام سے اُس کی وصیت نے باز رکھا ورنہ [illegible] اُس کے بغیر زندہ بھی نہیں رہ سکتا تھا مجھے زندہ رہنا چاہئے تھا اور زندہ ہوں لیکن آہ [illegible] یہ کیسی زندگی ہے "زندگی نام ہے مر مر کے جئے جانے کا"

ہاں اگر زندگی میں کوئی چیز ہے تو فضل کی دوستی، اس کی شرافت اُس کی بے نفسی مجھے آغوش میں تھامے جاتے وقت اس نے سچ کہا تھا "فضل [illegible] بہت عجیب [illegible] کی پرواہ نہیں کرتی!"

([illegible])

پنگھٹ کی رانی

آئی وہ پنگھٹ کی دیوی، وہ پنگھٹ کی رانی — دُنیا ہے متوالی جس کی اور فطرت دیوانی
ماتھے پر سیندوری ٹیکا رنگین و نورانی — سورج ہے آکاش میں جسکی ضو سے پانی پانی
چھم چھم اسکے بچھوے بولیں ہر دم چھلکے پانی
آئی وہ پنگھٹ کی دیوی وہ پنگھٹ کی رانی

کانوں میں بیلے کے جھمکے آنکھیں مے کے کٹورے — گورے رُخ پر تل ہیں یا ہیں بھاگن کے دو بھونرے
کومل کومل اُس کی کلائی جیسے کنول کے ڈنٹھل — نورِ سحر مستی میں اُٹھائے جس کا بھیگا آنچل
فطرت کے میخانے کی وہ چلتی پھرتی بوتل
آئی وہ پنگھٹ کی دیوی، وہ پنگھٹ کی رانی

رگ رگ جسکی ہے اک باجہ اور نس نس زنجیر — کرشن مُراری کی بنسی ہے یا ارجن کا تیر
پنگھٹ مضطر جسکی خاطر، چنچل جمنا نیر — جس کا رستہ ٹک ٹک دیکھے سورج سا رہگیر
سر سے پا تک شوخی کی وہ اک رنگین تصویر
آئی وہ پنگھٹ کی دیوی وہ پنگھٹ کی رانی

سر پر اک پیتل کی گاگر زہرہ کو شرمائے — پابوسی کے شوق میں جس سے پانی چھلکا جائے
پریم کا ساگر بوندیں بن کر جھوما اُمڈا آئے — سر سے برسے اور سینے کے درپن کو چمکائے
اُس درپن کو جس سے جوانی جھانکے اور شرمائے
آئی وہ پنگھٹ کی دیوی، وہ پنگھٹ کی رانی

سقراط کی موت

"فیڈو" (دوسری قسط)

زہر کا پیالہ پینے سے پہلے اپنے دوستوں سے سقراط اعظم کی گفتگو

(مترجمہ مہرلال سونی ضیا فتح آبادی ایم اے)

ایکی کریٹس:- فیڈو! کیا اس روز تم خود سقراط کے پاس موجود تھے جب اس نے زہر کا پیالہ پیا یا یہ کہانی تم نے کسی دوسرے شخص سے سنی۔

فیڈو:- میں خود وہاں موجود تھا ایکی کریٹس!

ایکی کریٹس:- تو ہمارے آقا نے مرنے سے پیشتر کیا کہا اور وہ کس طرح مرا؟ میں بہت خوش ہوں گا اگر تم مجھے ان باتوں سے آگاہ کرو گے۔ کیونکہ ہمارے ملک کا کوئی باشندہ اب ایتھنز نہیں جاتا اور نہ وہاں سے کوئی اس طرف آتا ہے۔ جس سے یہ تمام باتیں بالتفصیل معلوم ہوتیں۔ اس سے زیادہ ہمیں کچھ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ زہر پی کر مر گیا۔

فیڈو:- تو کیا تم نے مقدمہ کی سماعت کے متعلق بھی کچھ نہیں سنا؟

ایکی کریٹس:- ہاں ہم مقدمہ کی بابت سن چکے ہیں اور یہ عجیب بات ہے کہ فیصلہ کے بعد بہت دیر تک وہ زندہ رہا۔ آخر ایسا کیونکر ہوا۔

فیڈو:- ایک حادثہ کی وجہ سے ایکی کریٹس۔ مقدمہ سے ایک روز پیشتر اس جہاز کو تاج پہنایا گیا جو اہل ایتھنز نے ڈیلاس روانہ کیا تھا۔

ایکی کریٹس:- اور اس جہاز سے کیا مراد ہے؟

فیڈو:- اہل ایتھنز سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جہاز میں تھی سیس سات جوانوں اور سات دوشیزہ لڑکیوں کو کریٹ (Crete) لے گیا تھا اور ان کو موت سے بچانے کے بعد خود بھی محفوظ ہو گیا تھا۔ تب روایت کے مطابق اہل ایتھنز نے اپالو (Apollo یونانی دیوتا) کے سامنے قسم کھائی کہ اپنی حفاظت کے لئے وہ ہر سال ڈیلاس کو ایک پاک مشن روانہ کریں گے اور اس وقت آج تک ہر سال ایک مشن دیوتا کی خدمت میں روانہ کیا جاتا ہے۔ ان کی حکومت کا ایک قانون ہے کہ مشن کے روانہ ہونے کے بعد تمام شہر کو پاک صاف رکھا جائے اور اس وقت تک سزائے موت نہ دی جائے جب تک ڈیلاس سے جہاز واپس نہ آ جائے۔ اور جب کبھی مخالف ہواؤں کی وجہ سے جہاز کے پہنچنے میں دیر ہو جاتی ہے تو سزا کو بھی ملتوی کرنا پڑتا ہے۔ اپالو کے پجاری نے جہاز کو تاج پہنانے کے بعد مشن روانہ ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ رسم اس روز ادا کی گئی جب مقدمہ شروع ہونے والا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سقراط کو مقدمہ اور سزا کے درمیان بہت عرصہ تک قید خانے میں رہنا پڑا۔

ایکی کریٹس:- لیکن مجھے اس کی موت کے متعلق بتاؤ فیڈو کیا کہا گیا اور کیا کیا گیا؟ اور ہمارے آقا کے پاس اس کے دوستوں میں سے کون کون تھا؟ کیا حکام نے کسی دوست کو ایسا کرنے کی اجازت نہیں دی اور کیا وہ موت کے وقت اکیلا ہی تھا؟

فیڈو:- نہیں اس کے بعض احباب اس کے نزدیک موجود تھے۔

ایکی کریٹس:- اگر تمہیں فرصت ہو تو از راہ کرم تمام واقعات بجنسہٖ بیان کرو۔

فیڈو:- ہاں مجھے فرصت ہے اور میں تمام واقعات سناتا ہوں کیونکہ اس سے زیادہ کسی چیز سے مجھے خوشی نہیں ہوتی کہ میں خود سقراط کا ذکر کروں یا کسی شخص سے اس کا ذکر سنوں۔

ایکی کریٹس:- یقیناً فیڈو تمہارے سامعین بھی تمہاری طرح ہیں لہذا کوئی بات صحیح صحیح بیان کرنے کی کوشش کرو۔

فیڈو:- میں خود اس روز غیر معمولی طور پر متاثر ہوا۔ میں یہ محسوس نہیں کرتا تھا کہ میں اپنے ایک عزیز دوست کی موت کے وقت موجود ہوں مجھے اس پر رحم نہیں آیا کیونکہ اطوار و گفتار کے لحاظ سے وہ خوش نظر آتا تھا ایکی کریٹس اس نے نہایت بے خوفی سے تسلیم رضا کی۔ میں یہ سوچنے سے باز نہ رہ سکا کہ ہنوز فرشتے دوسری دنیا تک اس کے ہم سفر ہوں گے اور اگر دوسری دنیا کسی شخص کے

حق میں مسرت بخش ہو سکتی ہے تو وہ شخص یہی ہوگا۔ اس لئے جذبۂ رحم میرے دل میں قطعی نہ تھا جیسا کہ ایسے مغموم موقع پر تم توقع کرتے ہو۔ نہ میں نے وہ خوشی محسوس کی جو ہم اکثر اپنی فلسفیانہ بحثوں میں محسوس کیا کرتے تھے۔ کیونکہ ہماری گفتگو فلسفیانہ ہی تھی یہ خیال کر کے کہ اسے جلد ہی مرجانا ہے میرے دل میں ایک عجیب احساس پیدا ہوتا تھا جس میں غم و شادی کے دونوں جذبے موجزن ہوتے ہیں۔ ہم سب جو وہاں موجود تھے ایک ہی کیفیت ... سے گزر رہے تھے کبھی ہنستے تھے اور کبھی چلاتے تھے۔ اپالوڈرس پر یہ کیفیت شدید حاوی تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ تم اس شخص کو اور اس کے اطوار کو جانتے ہو۔

ایکی کریٹس: بے شک میں جانتا ہوں۔

فیڈو: اس نے خود کو قابو میں نہیں رکھا، اور میں اور دوسرے بھی بہت پریشان تھے۔

ایکی کریٹس: وہاں کون کون تھے فیڈو؟

فیڈو: اہل ایتھنز سے اپالوڈرس۔ کریٹو بوس اس کا باپ کریٹو۔ ہرموجینیز، اپی جینیز اور اینٹی ستھینیز تھے۔ اور پئینیا کا رہنے والا ٹیسیپس اور مینکسنرمس اور کئی دوسرے اہل ایتھنز بھی تھے۔ افلاطون میرے خیال میں بیمار تھا۔

ایکی کریٹس: کیا کوئی اجنبی بھی وہاں تھا؟

فیڈو: ہاں اجنبیوں میں تھیبز کا سیمیاس، سیبیس، فیڈونڈیس اور میگارا سے ایوکلیڈیز اور ٹرپسین تھے۔

ایکی کریٹس: لیکن اریس ٹی پس اور کلیومبروٹس؟ کیا یہ بھی حاضر تھے؟

فیڈو: نہیں یہ حاضر نہیں تھے کیونکہ وہ ایجینا گئے ہوئے تھے۔

ایکی کریٹس: کیا وہاں کوئی اور بھی تھا۔

فیڈو: نہیں میرے خیال میں ان کے علاوہ اور کوئی بھی نہیں تھا۔

ایکی کریٹس: تو اب ہمیں اپنی گفتگو سناؤ

فیڈو: میں شروع ہی سے تمام واقعات سناتا ہوں۔ آغاز میں قید خانے کے نزدیک ہی اس عدالت میں جہاں مقدمہ کی سماعت ہوتی تھی۔ ہر روز صبح کے وقت ہم سب جمع ہوا کرتے تھے۔ اور پھر سقراط کے پاس جاتے تھے۔ قید خانہ کھلنے سے پیشتر ہمارا بہت سا وقت گفتگو میں صرف ہوتا کیونکہ قید خانہ دیر سے کھلتا تھا۔ اس کے کھلنے پر ہم اندر سقراط کے پاس جاتے اور اکثر تمام دن اس کے ساتھ رہتے لیکن اس روز ہم معمول سے پہلے اس سے ملے کیونکہ گزشتہ شام کو ہمیں معلوم ہو گیا تھا کہ ڈیلاس سے جہاز آگیا ہے۔ پس ہم نے مقررہ جگہ پر جلد سے جلد پہنچنے کا انتظام کر لیا۔ جب ہم قید خانہ کے دروازہ پر پہنچے تو پورٹر نے ہمیں ذرا انتظار کرنے کے لئے کہا اور یہ بھی کہا کہ جب تک وہ خود ہمیں نہ بلائے ہم اندر نہ جائیں۔ "کیونکہ گیارہ اشخاص" اس نے بتایا "سقراط کو زنجیروں سے رہا کر رہے ہیں اور اس کی موت کے متعلق ہدایات دے رہے ہیں۔" تھوڑے ہی عرصہ میں اس نے واپس آکر ہمیں اندر بلایا۔ اندر جا کر ہم نے دیکھا کہ سقراط کو آزاد کیا جا چکا ہے اور xanthippe جسے تم جانتے ہو اس کے بچے کو گود میں لئے اس کے قریب ہی بیٹھی ہے۔ جب (xanthippe) نے ہمیں دیکھا تو وہ عورتوں کی طرح زور سے چلائی "یہ آخری وقت ہے سقراط کہ تم اپنے دوستوں سے گفتگو کرو گے یا وہ تم سے کچھ کہیں گے۔" اور سقراط نے کریٹو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا کریٹو اس کو مکان پر لیجاؤ۔ پس کریٹو کے چند ملازمین اسے لیگئے اور وہ دھاڑیں مار کر سر پیٹ رہی تھی۔ لیکن سقراط اپنے بستر پر بیٹھ گیا اور اپنی ٹانگ کو جھکا کر اپنے ہاتھ سے ملنے لگا اور اسی حالت میں اس نے کہا کہ وہ چیز بھی کتنی عجیب چیز ہے جسے لوگ مسرت کہتے ہیں۔ اپنے مخالف رنج سے اس کا تعلق کتنا حیرتناک ہے یہ کبھی ایک ساتھ کسی آدمی کے پاس نہیں آتے لیکن اگر کوئی ایک کا تعاقب کرے اور اس کو پکڑ لے تو اسے دوسرے کو قبول کرنے پر بھی مجبور کیا جاتا ہے گویا کہ یہ دو مختلف چیزیں ہیں جو آخر کار مشترک ہو جاتی ہیں۔ اور میں سمجھتا ہوں اس نے کہا کہ اگر ایسپ کو اس بات کا علم ہو جاتا تو وہ ان سے متعلق ایک قصہ (fable) بنا لیتا جس میں یہ بتایا جاتا کہ جب یہ آپس میں جھگڑ رہے تھے تو خدا نے ان میں صلح کرانی چاہی اور جب وہ ایسا نہ کر سکے تو اس نے ان دونوں کے سرے جوڑ دیئے چنانچہ جب انسان ایک کو حاصل کر لیتا ہے تو دوسرا خود ہی اس کے پاس چلا آتا ہے۔ میرا حال بھی یہی ہے۔ زنجیروں سے میری ٹانگوں میں درد شروع ہو گیا تھا مگر اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسرت غم کا تعاقب کرتے ہوئے آگئی ہے۔

سیبیس نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا میں خوش ہوں سقراط کہ تم نے میری یاددہانی کی۔ اکثر لوگ مجھ سے تمہاری نظموں، اپالو سے خطاب اور ایسپ کے ان قصوں کے متعلق دریافت کرتے ہیں جنہیں تم نظم کا جامہ پہنا رہے ہو اور دو ایک روز ہی گزرے ہیں کہ ایوینس نے مجھ سے دریافت کیا تھا کہ یہاں آکر تمہارا نظم کہنا چہ معنی دارد جب اس سے پیشتر تم نے ایک مصرع بھی نہیں کہا۔ اس لئے تم مجھے بتاؤ کہ میں اسے کیا جواب دوں جب دوبارہ وہ یہ سوال کرے کیونکہ میں جانتا ہوں کہ وہ ایسا کرے گا

تو جو حقیقت ہے اس سے کہہ دو سیبیس اس نے کہا۔ اس کو بتا دو کہ میں نے اس کا یا اس کی نظموں کا مخالف بننے کے لئے ایسا نہیں کیا۔ میں جانتا تھا کہ ایسا کرنا آسان نہیں۔ میں اپنے چند خوابوں کی تعبیر کا محض امتحان لے رہا تھا اور اس صورت میں کہ وہ مجھے اس قسم کا ترنم پیدا کرنے پر مجبور کریں۔ میں اپنے ضمیر کو توہمات سے آزاد کر رہا تھا۔ بس یہ ہے حقیقت۔ یہی خواب گزشتہ زندگی میں بھی میں نے مختلف اوقات پر مختلف صورتوں میں دیکھے ہیں لیکن یہ آواز میں ہر وقت سنتا رہا ہوں کہ "سقراط شاعری سیکھو اور شعر کہو۔" اس زمانے میں میرا خیال تھا کہ یہ خواب مجھے اسی چیز کی طرف لے جا رہا ہے جو میری زندگی کا مطمح نظر ہے ٹھیک اس طرح جیسے دوڑنے والوں کی ناظرین ہمت افزائی کرتے ہیں۔ میں سمجھتا تھا کہ یہ خواب مجھے اس موسیقی کی تخلیق کی تلقین کرتا تھا جو میں شروع ہی سے خلق کر رہا تھا کیونکہ میرے نقطۂ نظر کے مطابق فلسفہ بلند ترین موسیقی ہے اور میری زندگی فلسفہ کی خدمت ہی میں صرف ہوتی تھی۔ لیکن جب مقدمہ کی سماعت کے بعد دیوتاؤں کی دعوت نے میری موت کو ملتوی کر دیا تو مجھے خیال ہوا کہ یہ خواب مجھ سے ایسا نغمہ پیدا کرنا چاہتا ہے جو عام طور پر نغمہ کے نام کا مستحق ہے اور اس حالت میں مجھے حکم عدولی نہ کرتے ہوئے ایسا کرنا ہی واجب ہے۔ میں نے سوچا کہ ضمیر کو مطمئن کرنے کے لئے مجھے مرنے سے پیشتر خواب کی فرمانبرداری میں شعر کہنا چاہئیں۔ پس میں نے سب سے پہلے اس دیوتا پر

نظم کہی جس کی دعوت منائی جاتی تھی۔ اور پھر میں نے الیسپ کے اُن قصوں کو نظم کیا جن سے میں واقف تھا اور جن کا نظم کرنا زیادہ مشکل نہ تھا۔ کیونکہ میں غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ اُس شخص کے لئے جو شاعر بننا چاہتا ہے اپنی نظموں میں واقعات نہیں بلکہ قصّے استعمال کرنے ضروری ہیں اور میں قصّے نہیں گھڑ سکتا تھا

ایونیس سے یہ کہو کہ سیبیس اور میری طرف سے الوداع کہو اور اُس سے یہ بھی کہدو کہ اگر وہ عقلمند ہے تو جتنی جلد ممکن ہو میری راہ پر روانہ ہو جائے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مجھے آج ہی روانہ ہو جانا ہے کیونکہ اہل ایتھنز کی یہی خواہش ہے۔

اور سیمیاس نے کہا ایونیس کے حق میں یہ کتنی عجیب نصیحت ہے سقراط! میں اُس سے اکثر ملا ہوں اور جو کچھ میں نے دیکھا ہے اُس سے میں سمجھتا ہوں کہ وہ ایسا آدمی نہیں ہے کہ اس نصیحت سے ناراض ہو۔

کیا اُس نے کہا۔ کیا ایونیس ایک فلسفی نہیں ہے؟

ہاں میں ایسا سمجھتا ہوں۔ سیمیاس نے جواب دیا۔

تو ایونیس مرجانا ہی پسند کرے گا۔ اُس نے کہا ہر وہ شخص جو اس فن میں ذرا بھی دسترس رکھتا ہے ایسا ہی کرے گا۔ لیکن وہ اپنی ذات پر تشدد نہیں کرے گا کیونکہ کہا جاتا ہے کہ یہ ثواب سے خارج ہے اور یہ کہتے ہوئے اُس نے اپنے پیر بستر سے اُٹھا کر فرش پر رکھدئے اور آخر گفتگو تک اسی پوزیشن میں بیٹھا رہا۔

تب سیبیس نے اُس سے دریافت کیا کہ یہ کہنے سے تمھارا کیا مطلب ہے سقراط کہ ایک شخص کے لئے اپنی ذات پر تشدد کرنا تو عیب میں داخل ہے لیکن ایک فلسفی ایک ... مرنے والے کی پیروی کرے گا۔

کیا کہا سیبیس؟ کیا تم اور سیمیاس فی لولاس کے ساتھ رہے ہو اور تم نے اس کے متعلق ایک لفظ بھی سُنا۔

صحیح طور پر کچھ بھی نہیں سُنا سقراط۔

میں خود وہ باتیں کہہ رہا ہوں جو میں نے سُنی ہیں لیکن اس سے یہ مُراد نہیں کہ جو کچھ میں نے سنا ہے وہ تمہیں نہ بتاؤں۔ جبکہ میں اس دنیا سے سفر کرنے والا ہوں تو یقینا میرے لئے اس سے اور کیا بہتر ہو سکتا ہے کہ میں اپنے سفر کے متعلق گفتگو کروں اور یہ سوچوں کہ ہم اُس کی ماہیت کے متعلق کیا خیال رکھتے ہیں۔ سورج غروب ہونے میں جو وقت باقی ہے اُس کا اس سے زیادہ صحیح مصرف اور کیا ہو گا؟

تو پھر سقراط وہ اِس بات کے ثبوت میں کیا دلیل پیش کرتے ہیں کہ خودکشی معیوب ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں نے خود فی لولس کو جب وہ تھیبیس میں زندہ تھا یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ یہ حرکت زیبا نہیں اور دوسروں سے بھی میں نے ایسا سنا ہے لیکن کسی نے صحیح طور پر مجھے کچھ بھی نہیں بتایا

تمہیں ہمت نہیں ہارنا چاہیئے۔ اُس نے کہا ممکن ہے کہ کسی نہ کسی دن تم کو کچھ معلوم ہو جائے۔ لیکن شاید تم کو یہ سُن کر تعجب ہو گا کہ یہ قانون دوسرے قوانین کے برعکس مطلق اور قطعی ہے اور یہ غلط ہے کہ بعض لوگوں کے لئے موت زندگی سے بہتر ہوتی ہے۔ اور تم کو اس سے بھی زیادہ حیرت ہو گی جب میں تمہیں بتاؤں گا کہ وہ لوگ جن کے حق میں موت بہتر ہے اپنے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتے اور کسی مہربان کے نگران رہتے ہیں۔

بے شک سیبیس نے مسکراتے ہوئے اپنی ملکی زبان میں تائید کی۔ سقراط نے کہا یہ بیان بہت عجیب معلوم ہوتا ہے لیکن اس کے حق میں ایک آدھ ثبوت بھی پیش کیا جا سکتا ہے وہ ثبوت جو پوشیدہ تعلیم (The Esoteric system of Pythagoreans) نے پیش کیا ہے کہ انسان ایک قسم کی قید میں بند ہے اور وہ اُس سے آزاد ہو سکتا ہے نہ بھاگ کر کہیں جا سکتا ہے۔ میرے خیال میں نہایت عمیق اور مشکل ہے سمجھ میں آنے والا ہے۔ لیکن میں یہ ضرور سمجھتا ہوں سیبیس کہ دیوتا ہمارے نگران ہیں اور ہم انسان اُنکی ملکیت کا ایک جزو ہیں کیا تم بھی ایسا ہی سمجھتے ہو؟

بے شک سیبیس نے کہا۔

تو اس نے کہا کہ تمھارے اشارے کے بغیر اگر تمھاری ملکیت میں سے کوئی چیز خودکشی پر آمادہ ہو تو کیا تم اُس پر ناراض نہیں ہو گے اور اگر سزا ممکن ہو تو کیا تم اُسے سزا نہ دو گے!

یقیناً اُس نے جواب دیا۔

بس اس طریقہ سے یہ کہنا شاید غلط نہیں ہے کہ خودکشی کا کسی انسان کو حق نہیں پہنچتا۔ اور اُس کو اُس ضرورت کا انتظار کرنا چاہیئے۔ جو خدا کی طرف سے پیدا کی جائے جس طرح کہ میری ضرورت۔ ہاں سیبیس نے کہا یہ فطری معلوم ہوتا ہے لیکن ابھی ابھی تم کہہ رہے تھے کہ ایک فلسفی مرنا پسند کرے گا کیا یہ غلط نہیں ہے؟ سقراط اگر یہ صحیح ہے جو ہم ابھی کہہ رہے تھے کہ خدا ہمارا نگران ہے اور ہم اُس کی ملکیت ہیں یہ صحیح نہیں ہے کہ ایک عقلمند شخص اُس خدمت سے جدا رہنے ہی میں مطمئن ہو گا جو بہترین حکمران دیوتا اُس سے لینا چاہتے ہیں۔ وہ مشکل اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ آزاد ہونے کے بعد وہ اپنی حفاظت خداؤں سے زیادہ کر سکتا ہے۔ البتہ ایک بیوقوف شخص ایسا خیال کر سکتا ہے اور کہہ سکتا ہے کہ اپنے آقا سے بھاگ جانا ہی عین دانشمندی ہے وہ یہ نہیں سوچے گا کہ اُس ایک اچھے آقا سے نہیں بھاگنا چاہیئے جتنے عرصہ وہ اُس کے نزدیک رہ سکے اُسے رہنا چاہیئے۔ اس طرح غیر دانشمندانہ طور پر وہ بھاگ سکتا ہے۔ لیکن ایک عقلمند شخص یقینا ایسے شخص کی قربت کو پسند کرے گا۔ جو اُس سے بلند و بہتر ہے اور اگر یہ صحیح ہے سقراط تو نتیجہ تمھارے قول کے بالکل برعکس نکلتا ہے عقلمند مرنے سے گھبرائے گا اور بیوقوف خوش ہو گا۔

میں سمجھا کہ سقراط سیبیس کے دلائل سے خوش ہوا۔ اُس نے ہماری جانب دیکھا اور کہا سیبیس ہمیشہ دلائل کا امتحان لیتا رہتا ہے وہ کسی کے قول کو ایک دم بھی تسلیم نہیں کرتا۔

بے شک سقراط سیمیاس نے کہا لیکن میں اب سمجھتا ہوں کہ جو کچھ سیبیس نے کہا وہ بہت حد تک درست ہے ایک عقلمند شخص کو اپنے سے بہتر آقا کی خدمت کو چھوڑ کر کیوں بھاگ جانا چاہیئے اور میرا خیال ہے کہ سیبیس کی دلیل کا اشارہ تمھاری طرف ہے کیونکہ تم ہمیں چھوڑ رہے ہو اور اُن دیوتاؤں کو بھی جو تم تسلیم کرتے ہو کہ اچھے حاکم ہیں۔

تم ٹھیک کہتے ہو اُس نے کہا میں جانتا ہوں تم چاہتے ہو کہ میں تمھارے اس

الزام کے خلاف اور اپنی تائید میں کچھ کہوں گویا کہ میں ایک قانونی عدالت میں کھڑا ہوں۔

ہمارا یہی مطلب ہے سیمیاس نے کہا۔

اچھا اُس نے جواب دیا تو میں تمھارے سامنے اپنی تائید اُس سے بھی زیادہ کامیاب طریقے سے کروں گا جس طریقے سے میں نے عدالت کے سامنے کی میں غلطی پر ہوں گا سیبیس اور سیمیاس اُس نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا اگر میں موت سے نہ گھبراؤں بشرطیکہ میں یہ نہیں سمجھتا ہوں کہ میں اُن دوسرے دیوتاؤں کے ساتھ جو نیک و عقلمند ہیں اُن مرحومین کے ساتھ جو زندہ انسانوں سے بہتر ہیں جاکر رہنے والا ہوں لیکن تم کو معلوم ہونا چاہیئے کہ میں اُمید رکھتا ہوں کہ اچھے آدمیوں کے ساتھ جاکر رہوں گا اگرچہ مجھے اس کا یقین نہیں ہے۔ لیکن مجھے اس بات کا یقین ہے اور ان حالات میں ہونا بھی چاہیئے کہ میں اچھے دیوتاؤں کے ساتھ جاکر رہنے والا ہوں۔ اسی لئے میں موت سے نہیں گھبراتا۔ مجھے یقین ہے کہ موت کے بعد بھی وجود قائم رہتا ہے جو بد انسانوں کی بہ نسبت نیک انسانوں کے لئے بہت زیادہ مفید ہے

تو سقراط سیمیاس نے کہا کیا تم رخصت ہو کر یہ عقیدہ اپنے ساتھ ہی لیجانا چاہتے ہو یا تم یہ بھی چاہتے ہو کہ ہم اس خیال میں تمھارے شریک ہوں؟ میں سمجھتا ہوں کہ اس مفاد سے ہم بھی دلچسپی رکھتے ہیں، اور اگر تم اس معاملے میں ہم کو مطمئن کر دو گے تو خود بخود تمھاری تائید ہو جائے گی۔

میں کوشش کرونگا اُس نے کہا لیکن میرا خیال ہے کہ کریٹو مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔ ہمیں سب سے پہلے اُس کی بات پر توجہ دینی چاہیئے۔

میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں سقراط کریٹو نے کہا کہ اُس شخص نے جو تمھیں زہر دیگا مجھ سے کہا ہے کہ تم کو زیادہ گفتگو کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔ وہ کہتا ہے کہ گفتگو سے انسان کے جسم میں حرارت پیدا ہو جاتی ہے اور ڈر ہے کہ کہیں حرارت زہر کے اثر کو زائل نہ کر دے۔ جو شخص یہ حرارت پیدا کر لیتا ہے اُس کو دو تین مرتبہ زہر پینا پڑتا ہے۔ ایسا ہی ہونے دو سقراط نے کہا اُس کو صرف اپنے کام کا خیال رکھنا چاہیئے اور دو یا ضرورت پڑنے پر تین مرتبہ مجھے زہر دینے پر تیار رہنا چاہیئے۔

میں جانتا تھا کہ تمھارا جواب یہی ہوگا کریٹو نے جواب دیا لیکن وہ بہت ضد کر رہا تھا۔

اُس کو نظر انداز کر دو اُس نے جواب دیا لیکن اب میں تمھیں بتانا چاہتا ہوں میرے منصفو! کہ میرے خیال میں وہ شخص جس نے حقیقی طور پر اپنی زندگی فلسفہ کی خدمت میں صرف کی ہے موت کے وقت بھی خوش رہنے کا کیوں حقدار ہے اور وہ مرجانے کے بعد دوسری دنیا میں بہترین فائدے کی امید کیوں رکھتا ہے میں یہ سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں سیمیاس اور سیبیس کہ یہ کیسا کیوں کر ہو سکتا ہے۔

شاید دنیا نہیں جانتی کہ فلسفی ہمیشہ حیات و ممات کی تحقیق میں مصروف رہتے ہیں۔ اور اگر یہ صحیح ہے تو بہت حیرت ہوگی اگر وہ شخص جو تمام عمر موت کا خواہشمند رہا ہے موت آنے پر پریشان ہو جائے بلکہ ایک مدت تک وہ اسی کی تحقیق اور آرزو میں گم رہا ہے۔

سیمیاس نے ہنس کر کہا یقیناً سقراط تم مجھے ہنسنے پر مجبور کرتے ہو حالانکہ اس وقت ایسی حالت میں نہیں ہوں کہ ہنس سکوں۔ اگر تم یہ باتیں عوام سے بیان کرتے تو میرا خیال ہے کہ وہ مان لیتے کہ فلسفیوں کے متعلق تمھارا نظریہ بالکل درست ہے اور میرے ہموطن تم سے متفق ہونگے کہ فلسفی مرجانا چاہتے ہیں اور وہ یہ بھی بخوبی جانتے ہیں کہ فلسفیوں کو موت کے گھاٹ اتار دینا ہی عین دانشمندی ہے۔

اور وہ حق بجانب ہوں گے سیمیاس بجز اِس دعوی کے کہ وہ اس بات کو جانتے ہیں کیونکہ وہ نہیں جانتے کہ ایک سچا فلسفی کس طریقہ سے مرجانا چاہتا ہے یا وہ کس قسم کی موت کا مستحق ہے یا وہ کس صورت سے مستحق ہے۔ ہمیں عوام کو نظر انداز کر کے خود اِس معاملے پر غور کرنا چاہیئے۔ کیا ہم سمجھتے ہیں کہ موت کوئی حقیقت ہے؟

بے شک سیمیاس نے جواب دیا۔

اور کیا ہم کو اس بات پر یقین نہیں کہ موت جسم سے روح کے جدا ہو جانے کا نام ہے؟ کیا موت سے مراد یہ نہیں کہ جسم خود بخود وجود میں آتا ہے بغیر کسی روح کی مدد کے اور روح جسم سے جدا ہو کر بھی زندہ رہتی ہے؟ موت اس کے علاوہ اور کس چیز کو کہتے ہیں؟

تم ٹھیک کہتے ہو اُس نے کہا۔

اب غور کرو میرے اچھے دوست کہ کیا ہم اُس دوسرے نکتہ پر بھی متفق الرائے ہیں جو میرے خیال میں ہم کو یہ مسئلہ حل کرنے میں بڑی مدد دیگا کیا تم سمجھتے ہو کہ ایک فلسفی زمانے کے عیش و نشاط کو بڑی اہمیت دیگا مثلاً خور و نوش کو۔

یقیناً نہیں سقراط سیمیاس نے کہا۔

یا جنسی خواہشات کو؟

بے شک نہیں۔

اور کیا تمھارے خیال میں وہ جسم باقی جسمانی مسرتوں کو بہت بلند سمجھتا ہے کہ وہ خواہش کریگا کہ نفیس ملبوس چپل اور زیورات... حاصل کرے یا وہ ان سے نفرت کریگا حتی کہ اُس کو انکے استعمال کرنے پر مجبور نہ کر دیا جائے؟

میرے خیال میں ایک حقیقی فلسفی اِن سے نفرت کریگا اُس نے جواب دیا مختصراً اُس نے کہا کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ جسمانی ضرورتوں کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ وہ حتی الوسع مادیت سے دور رہتا ہوا روح سے نزدیک تر ہونے کی کوشش کرتا ہے؟

میں ایسا ہی سمجھتا ہوں۔

تو اس معاملہ میں پہلے یہ ظاہر ہے کہ فلسفی اپنی روح کو جسم سے بے تعلق کر لیتا ہے اور حتی الامکان دوسرے انسانوں سے بھی؟

بے شک

اور کیا دنیا نہیں سمجھتی سیمیاس کہ اگر انسان مادی لذتوں سے دلچسپی نہیں رکھتا ہو اور اُن سے اپنا حصہ طلب نہیں کرتا ہے تو اُسے زندہ نہیں رہنا چاہیئے کیا وہ یہ نہیں جانتی کہ وہ جو ان چیزوں سے بے نیاز ہے ایک مردہ شخص سے بہتر نہیں؟

تم ٹھیک کہتے ہو۔

لیکن عقل کو صحیح طور پر حاصل کرنے کے متعلق تمھارا کیا خیال ہے؟ اگر عقل

کی تلاش میں جسم کو درست بنایا جائے کہ تو کیا وہ سدر وثابت ہوگا۔ مثلاً کیا بینائی اور سماعت کے ذریعہ کوئی حقیقی سچائی انسان تک پہنچتی ہے؟ کیا شاعر ہمیشہ سے ہمیں کہتے ہیں کہ کسی چیز کو صحیح طور پر دیکھتے ہیں نہ صحیح طور پر سنتے ہیں۔ لیکن اگر جسم کی حسی طاقتیں درست اور صاف نہیں ہیں تو پھر دوسری کیونکر ایسی ہو سکتی ہیں کیونکہ وہ ان کے مقابلہ میں نامکمل ہیں۔
کیا ایسا نہیں ہے؟

ہاں میں ایسا ہی سمجھتا ہوں اُس نے کہا۔

تو پھر روح حقیقت کو کب پاتی ہے؟ اُس نے پوچھا ہم دیکھتے ہیں کہ جب کبھی وہ جسم کے ساتھ حقیقت کی تلاش کرتی ہے تو جسم اُسے گمراہ کر دیتا ہے۔

بے شک

کیا یہ عقل ہی کے ذریعہ نہیں ہے کہ اُس پر کسی حقیقت کا اظہار ہوتا ہے۔

بجا ہے۔

اور عقل صرف اُسی وقت کام کرتی ہے جب تمام حسی طاقتیں سماعت بینائی رنج و خوشی وغیرہ روح کو پریشان نہیں کرتی جب وہ جسم کو طلاق دیکر حتی الامکان خود کو اُس کے ساتھ ہر رشتہ سے آزاد کر لیتی ہے اور صرف خود پر بھروسہ کرتے ہوئے خود کو تلاش کرتی ہے؟

ایسا ہی ہے۔

اور اس حالت میں بھی فلسفی کی روح جسم سے بہت زیادہ نفرت کرتی ہے

اُس سے دور بھاگتی ہے اور تنہا رہنا چاہتی ہے کیوں وہ ایسا نہیں چاہتی؟

یعنی وہ ایسا ہی چاہتی ہے۔

اور سیمیاس تم دوسرے نکتے کے متعلق کیا کہتے ہو؟ کیا ہم سمجھتے ہیں کہ کوئی ایسی چیز بھی ہے جسے کامل انصاف کہا جاتا ہے یا نہیں؟

بے شک ہم یہی سمجھتے ہیں۔

اور کامل حسن اور کامل نیکی؟

ہاں ہاں۔

کیا تم نے ان میں سے کسی کو کبھی اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے؟

بالکل نہیں اُس نے جواب دیا۔

کیا تم نے کبھی اپنی کسی جسمانی حس سے ان کا اندازہ کیا ہے؟

میں اُن تمام مطلق (Absolute) چیزوں کا ذکر کر رہا ہوں جو وسعت صحت اور طاقت سے متعلق ہیں۔ کیا جسم کے ذریعے چیزوں کی حقیقت معلوم کی جا سکتی ہے؟ کیا ایسا نہیں ہے کہ وہ شخص جو اپنی عقل کے ذریعہ زیر نظر چیزوں کی اہمیت اور ماہیت کو سمجھنے کی محتاط کوشش کرتا ہے اُن کی حقیقت سے بہت نزدیک آجاتا ہے؟

بے شک۔

تین اشارے

اِدھر مذہب اُدھر انساں کی فطرت کا تقاضہ ہے وہ دامانِ مہِ کنعاں ہے یہ دستِ زلیخا ہے

کھلونا تو نہایت شوخ و رنگیں ہے تمدّن کا معرّف میں بھی ہوں لیکن کھلونا پھر کھلونا ہے

مشیّت کھیلنا زیبا نہیں میری بصیرت سے

اُٹھا لے ان کھلونوں کو یہ دنیا ہے یہ عقبیٰ ہے

جوشؔ

کرشن گوپال سے!

بندرا کے گھاٹ ہیں یہ تمہارے منتظر   موجِ آب منتظر ہیں ستارے منتظر
درد سے بھری ہوئی ہیں فضائیں منتظر   مندروں کے سائے میں ہیں گھٹائیں منتظر
گوپیوں کی خاک میں سوزِ انتظار ہے   ہر کنول کے جام میں خونِ صد بہار ہے
کوئلوں کی کوک میں گیت کا مزار ہے   موسمِ بہار اک دکھ بھری پکار ہے

ہر قدم پہ بادۂ زندگی بہاؤ پھر

اے گوپال جھوم کر بنسری بجاؤ پھر

بنسری کی تان سے صبح و شام مست ہوں   رقص و چرخ مست ہوں بے نظام مست ہوں
وجد میں ہو عقل و دیں بیخودی ہو رقص میں   بنسری کی تان پر زندگی ہو رقص میں
بنسری کے کیف سے اک جہاں ہو رقص میں   اک جہاں کا ذکر کیا لامکاں ہو رقص میں

ہاں اٹھاؤ بنسری بنسری اٹھاؤ پھر

اے گوپال جھوم کر بنسری بجاؤ پھر

تیرگی کی ڈیں میں تم مثلِ ماہتاب تھے   مثلِ ماہتاب کیا اصل آفتاب تھے
حسن کی شراب تھے عشق کا شباب تھے   اپنی خود نظیر تھے اپنا خود جواب تھے
سر بسر جمال تھے راز ہر جلال تھے   حسن کا کمال تھے عشق کا مآل تھے
اپنے رخ سے پردۂ ظاہری اٹھاؤ پھر   اک جہاں کو حسن کا حیرتی بناؤ پھر

برج کی فضاؤں کو نشّے میں چاؤ پھر

اے گوپال جھوم کر بنسری بجاؤ پھر

فطرت یقین میں اب سوزِ تشنگی نہیں   چشمِ شوق ہر طرف تم کو دیکھتی نہیں
آنکھ ہے نہ جوش ہے جلوہ ہے نہ طور ہے   نورِ باطنی ہے ایک اور وہ بھی دور ہے
موت غمزدہ سی ہے زندگی نزار ہے   حسن ہے برہنہ سر عشق سوگوار ہے
صبح و شام گونج اٹھے اور رات گونج اٹھے   کائنات گونج اٹھے اور حیات گونج اٹھے

مسکرا کے گاؤ پھر گا کے مسکراؤ پھر

اے گوپال جھوم کر بانسری بجاؤ پھر

بانسری کے کیف سے دل کو گدگداؤ پھر   پریم اور پریت کی ریت کو جگاؤ پھر
زمزموں کی گود سے نکہتیں برس پڑیں   بانسری کی لے سے پھر جنتیں برس پڑیں
نجم و کوکب و قمر سدِّ راہ ہیں تو کیا   آسمان و لامکاں سدِّ راہ ہیں تو کیا
خود ہی تم کنول بنو خود ہی مسکراؤ پھر   بوئے گل کے روپ میں سج کے پاس آؤ پھر

بانسری بجاؤ پھر دو جہاں پہ چھاؤ پھر

اے گوپال جھوم کر بانسری بجاؤ پھر

موج کا ستار ہو بانسری کے زمزمے   ساحلِ چمن ہو اور زندگی کے زمزمے
مست گنگنو ہوں پھر یاسمن کی جھاڑیاں   طورِ عاشقی بنیں برج کی پہاڑیاں
بیخودی کے رنگ میں ڈوب جائے زندگی   عاشقی کے رنگ میں ڈوب جائے زندگی
روحِ بانقاب کا ہر نقاب پھونک دو   موت و زندگی ہی کیا سب حجاب پھونک دو

جس طرح بھی ہو سکے ایک بار آؤ پھر

اے گوپال جھوم کر بانسری بجاؤ پھر

ماہ و آفتاب کو حکمِ انصرام دو   پھر شبِ حیات کو اذنِ صبح و شام دو
روحِ منفعل کو پھر عشرتِ دوام دو   عشق کی شراب کا تند و تیز جام دو
کُل فضا خموش ہے عزّتِ کلام دو   حرّیت کا درس دو جنگ کا پیام دو
ایشیا غلام ہے اس غلام کی سنو   ہند ڈوبنے کو ہے ڈوبتے کو تھام لو

ساحلِ مراد تک بندیوں کو لاؤ پھر

اے گوپال جھوم کر بانسری بجاؤ پھر

ساغر نظامی

بغیر ڈرائیور کی ٹرین

(سیّد عنایت علی رضوی بی اے (علیگ)

لندن کی سڑکوں کے نیچے ہر گھنٹہ چالیس گاڑیاں (ٹرینیں) بغیر ڈرائیور اور گارڈ کے ادھر سے ادھر گھڑگھڑاتی رہتی ہیں۔ محکمۂ ڈاکخانہ (لندن) کی ٹیوب ریلوے کے نام سے منسوب ہے اور سطحِ زمین سے اسّی فٹ نیچے ساڑھے چھ میل لانبی سرنگ میں چلتی رہتی ہیں۔ اور روزانہ تیس ہزار (۳۰۰۰۰) ڈاک کے تھیلے لیجاتی ہیں۔ یہ ریلوے اپنی قسم کی دنیا بھر میں انوکھی ہے۔ اور محکمۂ ڈاک کی متواتر ضرورت کی بنا پر کہ ڈاک کے لیجانے اور پہنچانے میں ہر ممکن جلدی کی جائے۔ یہ تعمیر کی گئی ہے لیکن مزید برآں اس کے وجود نے لندن کی سڑکوں پر گاڑیوں کے ہجوم اور شور میں ایک نمایاں کمی پیدا کر دی ہے اور ڈاکخانوں میں ڈاک کا توازن قائم کرنے میں بڑی مدد کی ہے

صفحۂ ہذا کے مطبوعہ نقشوں میں اس ریلوے کا طول، اس کا راستہ، اس کے آٹھ اسٹیشن نیز ڈاک لیجانے والی گاڑیوں کی سڑکیں جن کا اس سے ملان ہوتا ہے بتائی گئی ہیں۔

اس ریلوے کا اصلی مقصد خطوں کی ڈاک کو جلد سے پہونچانا ہے۔ بمقابلہ سڑکوں کے اس ریلوے کے ذریعہ ڈاک لیجانے میں جو وقت کی بچت ہوتی ہے وہ ایک حد تک سڑکوں کی حالت پر منحصر ہے۔ عام طور پر ایک سرے سے دوسرے سرے تک جانے میں اٹھارہ منٹ لگتے ہیں البتہ کہر کی حالت میں یا بڑے دن (کرسمس) سے قبل جب آمد و رفت گاڑیوں کی زوروں پر ہوتی ہے یہ بچت اور بھی زیادہ ہوتی ہے۔

اسٹیشنوں کے علاوہ سب جگہ اس ریلوے کی گاڑیاں صرف ایک ہی سرنگ میں چلتی ہیں جو نو فٹ کے قطر میں ہے اور جس میں دو فٹ چوڑے ریل کے دو راستے ہیں۔ ہر راستے پر تین آہنی ریلیں ہوتی ہیں جن پر ہو کر ٹرین گزرتی ہے۔ اسٹیشن کے قریب سرنگ کی دو شاخیں سات فٹ قطر کی ہیں اور ان میں ریل کا صرف ایک ہی راستہ ہوتا ہے۔

اسٹیشن کا پلیٹ فارم مسافروں کی زیر زمین (Passengers Underground Ry) ریلوے کے پلیٹ فارموں کی طرح نہیں ہیں۔ اسٹیشن کی ہر ایک سرنگ میں ایک پلیٹ فارم اور دو ریل کے راستہ ہوتے ہیں۔ ایک راستہ گاڑی کو ٹھہرانے کے لئے اور دوسرا ایسی گاڑیوں کے لئے جو سیدھی (بغیر رکے) چلی جائیں۔ پلیٹ فارم نوّے فٹ (ویسٹرن ڈسٹرکٹ آفس) سے لیکر ۳۱۳ (تین سو تیرہ) فیٹ (ماؤنٹ پلیزنٹ اسٹیشن) تک کی لمبائی کے ہیں۔ ٹرینیں بجلی کے ذریعہ چلتی ہیں۔ اور بجلی گھر سے ان کی رفتار وغیرہ کی نگرانی کی جاتی ہے۔ ایک ٹرین میں ایک یا دو سے تا ۲۷ فٹ لانبا مال کا ڈبہ ہوتا ہے جس میں چار تھیلے ہوتے ہیں اور ہر تھیلے میں پندرہ ۱۵ خطوں کے اور چھ ڈاک کے تھیلے آ سکتے ہیں جہاں تک ممکن ہو سکتا ہے ان تھیلوں کے اٹھانے رکھنے میں انسان کا بہت کم ہاتھ لگتا ہے کیونکہ ہر اسٹیشن پر وزن اٹھانے کی مشینیں اور تھیلوں کے پھسلنے کے سلامی راستے

اور بعض اسٹیشنوں پر بجلی سے چلنے والی بارکش مشینیں اور تھیلا اٹھانے والی مشینیں لگی ہوئی ہیں۔

اوپر دفتر سے تھیلے ان سلامی پھسلنے والے راستوں اور تھیلے اٹھانے والی مشینوں کے ذریعہ اسٹیشن پلیٹ فارم پر آپڑتے ہیں جہاں کہ یہ تھیلوں پر مشینوں کے ذریعہ لادے جاتے ہیں یہ تھیلے اٹھانے والی مشینوں کے ذریعہ وہاں الٹے جاتے ہیں جہاں تھیلے اٹھانے والی مشینیں لگی رہتی ہیں جو ان کو اوپر دفتر میں لیجاتی ہیں۔

پیڈنگٹن (Paddington stn) اسٹیشن پر ایسی مشینیں لگائی گئی ہیں جو ڈاکخانہ کے دفتر سے گریٹ ویسٹرن ریلوے (W. Ry) کے پلیٹ فارم پر ان تھیلوں کو لیجاتی ہیں۔ اس اسٹیشن پر اور لورپول اسٹریٹ کے ریلوے اسٹیشن پر ڈاک بے تحاشا موصول ہوتی ہے یہاں سے سلامی راستے چلے گئے ہیں جو یوسٹن ریلوے کے پلیٹ فارم پر پہونچتے ہیں۔

اس ریلوے کی ٹرینیں چار سو دس مختلف کنٹرولوں سے بجلی کے بٹن دبا کر چلائی جاتی ہیں اور اسی طرح روکی جاتی ہیں۔ یہ گاڑیاں پینتیس ۳۵ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلتی ہیں اور کچھ ایسا انتظام کیا گیا ہے کہ جوں جوں گاڑی اسٹیشن کے قریب ہوتی ہے راستہ کی سطح میں چڑھاؤ دیدیا ہے جس سے لازمی طور پر اس کی رفتار خود بخود کم ہو جاتی ہے یہاں تک کہ اسٹیشن کے کچھ قریب پہونچکر یہ خود بخود رک جاتی ہے اور تھوڑے منٹ انتظار کے بعد آٹھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چل کر اسٹیشن پلیٹ فارم پر پہنچ جاتی ہے۔ اگر یہ ٹھہرنے والی گاڑی ہوتی ہے تو یہ اس پلیٹ فارم پر پہونچتی ہے جہاں راستہ آگے کو بند ہوتا ہے اور اس سے یہ خود بخود رک جاتی ہے ورنہ گاڑی دوسرے راستہ سے چلی جاتی ہے اور یہاں سے یہ راستہ کچھ فاصلہ تک پھر سلامی ہوتا ہے

خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو زندگی کے ہر شعبہ میں سہولتیں پیدا کرنے کے لئے بڑی بڑی کوششیں اور ایجادیں کرتے ہیں اور دولت کو پانی کی طرح بہا دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دولت، آسانی اور عشرت سب یکجا ہوتی ہیں۔ یہ تو بیچارے ڈاک (خطوط اور پارسلوں) کا حال ہے۔ اگر حضرت انسان کے لئے جو سہولتیں مغرب نے مہیا کی ہیں سب کا بیان لیا جائے تو نامہ اعمال انہی کے بیان سے بھر جائے۔

آزادی

مزیّن تیرے اسمِ پاک سے طغرائے آزادی
منوّر تیرے نورِ محض سے سیمائے آزادی

تخیّل ہے ترا مشاطۂ منشائے آزادی
تصوّر ہے ترا رنگِ رُخِ زیبائے آزادی

کیا تو نے مقدّر اپنے پاکیزہ ارادے سے
پئے صبحِ ازل اِک جلوۂ رعنائے آزادی

امینِ جلوہ کو پھر بخش دی اک نعمتِ عالی
بنایا رونقِ ہستی و بزم آرائے آزادی

شرف دیکر کیا مبعوث اک انسانِ اعظمؐ کو
مرتّب جس نے آخر کردیے اجزائے آزادی

پیامِ حرّیت جس نے سُنایا سارے عالم کو
بنا الہامِ یکسر وہ نوا پیرائے آزادی

دیا انسانیت کو درس اُس نے سرفرازی کا
منظّم جس نے کردی اک نئی دنیائے آزادی

وہ نغمہ جو ہوا در آفریں طائف کی چوٹی سے
ابھی تک روح میں ہے کیفیت افزائے آزادی

رہے گی تا ابد جاری ازل کی کارفرمائی
کمالِ شورشِ امروز ہے فردائے آزادی

ہے قائم حق و استحکام پر بنیاد انساں کی
کبھی باطل نہ ہوگی فطرتِ آزاد انساں کی

وہ آزادی جو انسانوں کی عظمت کو بڑھاتی ہے
وہ آزادی غلامی جس کے آگے تھرتھراتی ہے

وہ آزادی جو انسانوں کا اک پیدائشی حق ہے
وہ آزادی جو استبداد کے قلعوں کو ڈھاتی ہے

وہ آزادی کہ جو عزتِ اقوام کی ضامن
وہ آزادی جو بامِ کامیابی پر چڑھاتی ہے

وہ آزادی جو ہر ذرّے کو خود بخشی ہے قدرت نے — وہ آزادی پرندوں کو ہوا میں جو اڑاتی ہے

وہ آزادی کہ جسکے نور سے ہیں دو جہاں روشن — وہ آزادی جو ہر ذرّہ میں اک مشعل جلاتی ہے

وہ آزادی پیمبر جس کو لائے آسمانوں سے — وہ آزادی جو ہر انسان کو پیغمبر بناتی ہے

وہ آزادی حکومت جسکی ہے فطرت کی وسعت میں — ستاروں کی طرح جو بحر و بر پہ جگمگاتی ہے

وہ آزادی قوی تر جسکے بازو ہیں مصیبت میں — وہ آزادی جو واماندوں کو شانوں پر اٹھاتی ہے

وہ آزادی حفاظت جس سے ہے ناموس قومی کی — وہ آزادی جو ظلم و جور کی بنیاد ڈھاتی ہے

وہ آزادی الٰہی خستہ کاموں کو بھی مل جائے
وہ آزادی الٰہی ہم غلاموں کو بھی مل جائے

سروں پر ہو ہمارے سایۂ دامانِ آزادی — ہماری جان آزادی ہو ہم ہوں جانِ آزادی

شہادت دے رہے ہیں خود ہمارے خون کے قطرے — کہ ہم سے ہے جہاں میں رونقِ دامانِ آزادی

وہ دن آئے وہ وقت آئے وہ لمحے جلد تر آئیں — کہ سینچا جائے تازہ خون سے بستانِ آزادی

الٰہی موسمِ گل میں کچھ ایسا انقلاب آئے — یکایک باغ میں ہو ایک دن اعلانِ آزادی

ہر اک موجِ چمن بنجائے اک سیلابِ حریت — نہ اپنے روکنے سے بھی رکے طوفانِ آزادی

زمیں سے آسماں تک حریت کا بول بالا ہو — ہمارے ہاتھ میں ہو نقشۂ ارکانِ آزادی

ہر اک ذرّہ کو سجدہ گاہِ آزادی بنادیں ہم — جبینِ شوق ہو اور منزلِ عرفانِ آزادی

مساوات و اخوت ہو محبت کی حکومت ہو — ہمارا پرچمِ عظمت ہو اور میدانِ آزادی

غریب آبادیاں زرخیز خطوں سے بدل جائیں
غلامی کی بلائیں "ایشیا" کے سر سے ٹل جائیں

کتب موصولہ پر ایک نظر

یہ عجیب و غریب حقیقت بھی نہایت دلچسپ ہے کہ گو اب پنجاب بہتر متغزلین اور نظم نگار شعرا کا مرکز ہے لیکن جن لوگوں کو فی الحقیقت شہرت اور ترقی کے بام پر ہونا چاہئے تھا وہ گو ایک خاص سطح پر ضرور اپنی انفرادی حیثیت کے ساتھ مشہور ہیں لیکن ان کو زیادہ مشہور ہو جانے والوں کے مقابلہ میں شہرت حاصل نہیں ہو سکی اور نہ پنجاب ہی نے ان کو وہ مرتبت بخشی جس کے حقیقی طور پر وہ حقدار تھے۔ اس کی وجہ صرف یہی ہو سکتی ہے کہ وہ بلند سوسائٹی سے تعلق رکھتے ہیں اور اپنے ماحول کی سطح سے اتر کر کوئی سعی اپنی شاعرانہ زندگی کے متعلق نہیں کر سکتے دوسرے ان کے اشغال میں مختلف ہیں یعنی انہوں نے کبھی ایسے ذرائع اختیار نہیں کئے جو دوسروں نے بہ آسانی اپنی ماحولی مجبوریوں اور جذباتی پریشانیوں کی وجہ سے اختیار کئے اور اس قسم کی جدوجہد کو جاری رکھا جس کو یہ لوگ جاری رکھنا تو درکنار شروع بھی نہیں کر سکتے تھے یعنی جو راہیں اپنی حیثیت کے مطابق اوقات گزاری حیات کے متعلق اُن حضرات نے تجویز کی تھیں ان کو پختہ کیا اور پھر اُن راہوں پر سفر کرتے ہوئے اُن لوگوں سے علیحدہ بالکل مختلف فضاؤں میں گم ہو گئے جو ہمہ تن "شاعری کے اسٹیج" پر اپنی بانسری بجا رہے تھے۔

میری مراد پنجاب میں عابد علی بی اے اثر صہبائی، حامد علی خاں لطیفی اور میر منظور ولی وغیرہ سے ہے۔

جہاں تک ڈاکٹر سر اقبال مدظلہ اور مولانا ظفر علی خاں کی ذات کا تعلق ہے ان دونوں کو اس مقابلہ میں شریک کرنا مقصود نہیں لیکن جزوی طور پر جہاں تک اس طرح تغزل کا تعلق ہے جس کو شاعری کا اصل اصول خیال کیا جاتا ہے میں کہہ سکتا ہوں کہ متذکرہ نوجوانوں میں سے بعض میں ان دونوں استادوں سے نسبتاً زیادہ پائی جاتی ہے موازنہ کا صرف یہی جزو ان دو شخصیتوں سے تعلق رکھتا ہے باقی سے بحث نہیں۔

شہرت اور اس سے پیدا شدہ منافع و فوائد دراصل اس بے ضمیری کا نتیجہ ہوا کرتے ہیں جو ایک خاص مرتب ہو جانے والی جماعت میں افراد کو شہرت کے حصول کے لئے اختیار کرنی پڑتی ہے۔ اس کے علاوہ بعض ایسے حرکات بھی کرنے پڑتے ہیں جن کو اگر علانیہ اختیار کیا جائے تو وہ تمام شیرازہ بکھر جائے جو انسانی افضلیتوں کے نام سے آدمی عوام کے سامنے مجتمع کرتا ہے اگر یہ نہیں تو اس کے "خبطی" یا "ارذل" ہونے میں تو شک باقی نہیں رہتا۔

لیکن وہ پائدار شہرت جو شاعر کی روحانی عروج و ارتقاء کے اثرات سے پیدا ہو۔ دوامی ہوتی ہے اور قطعی ابدی۔ میرا فیصلہ ہے کہ شاعر کا ارتقاء کبھی پروپیگنڈے سے نہیں ہو سکتا اس کا ارتقا خود اس کی دماغی اور روحانی ریاضت سے تعلق رکھتا ہے۔ شاعر کا کام یہ ہے کہ وہ دلوں کو متاثر کرے اور دل دلسوزی کے بعد ہی متاثر ہو سکتے ہیں۔ اسی لئے میں کہہ سکتا ہوں کہ جو تزکیہ روح اور انجلائے قلب نہیں کر سکتا اس سے کہدو کہ وہ اپنی موت کا یقین کرے۔

سوسائٹی میں آج یا مستقل طور پر شاعر کا درجہ کیا ہے؟ یہ ایک سوال ہے جو مجھے اس وقت سے پریشان کئے ہوئے ہے جس وقت سے میں نے اپنی تمام حیات کو شعر کی روحانیت اور وجدان کے مقدس آستاں پر سرنگوں دیکھا۔ شاعر جس وقت فکر کرتا ہے اپنے خیال میں بادشاہوں سے بلند اور پیغمبروں سے قریب ہوتا ہے لیکن جب وہ اپنی اس فکر کو لیکر اور افکار کدے سے نکل کر سوسائٹی میں داخل ہوتا ہے تو سوسائٹی اُس سے اپنے عشرت کدوں، اپنے درباروں، اپنے جلسوں (ان میں حکام کے ایڈریس اور تبادلاتی جلسے خاص طور پر شامل متصور کیجئے) میں متوقع ہوتی ہے کہ وہ قصیدہ، نظم، غزل، تہنیت نامہ اور جو کچھ اُس نے لکھا ہے وہ سنائے خصوصاً "ترنم" کے ساتھ اور اپنے فرض سے سبکدوشی حاصل کرے۔ اس وقت بحث میں قصیدہ نگار، ایڈریس اور تہنیت نامی قسم کے شعرا شریک نہیں ہیں اور اس لئے نہیں ہیں کہ میرے نزدیک وہ ہرگز شاعر نہیں۔ بلکہ مراد اُن شعرا سے ہے جو فطرت اور انسان کی ترجمانی کرتے ہیں پھر بھی سوسائٹی ان کو صرف اپنی انجمن آرائیوں کے قابل خیال کرتی ہے اور یہی نہیں بلکہ اُن کو انجمن آرا کرنے کے بعد سمجھتی ہے کہ میں نے شاعر کی عزت افزائی کی۔

اب جو سوسائٹی کے مطالبات کی تکمیل کرتے ہیں وہ [illegible] باقی مردود۔ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ وہ لوگ جو شاعرانہ پوزیشن میں ہوتے ہوئے بھی بڑی سے بڑی بارگاہ میں اپنی غیرت اور خودداری کا ثبوت دیتے ہیں جری اور آزاد واقع ہوتے ہیں ان سے سوسائٹی خوش نہیں ہوتی بلکہ وہ خیال کرتی ہے کہ یہ اپنی حیثیت سے بڑھا جا رہا ہے اور سامنے بیٹھے ہوئے "ارباب نشاط" جیسی "تہذیب و اطاعت" ۔۔ کا ثبوت نہیں دے رہے ہیں۔

سوسائٹی کا اطلاق گو حکومت پر بھی ہوتا ہے لیکن جو بھی سوسائٹی سے ہم اس کو کچھ تمیز کر سکتے ہیں۔ رہی حکومت تو اس کو بھی شعرا سے کوئی خوف نہیں اور گو وہ شکسپیئر، کیٹس، شیلے..... بائرن اور ٹینی سن کی قوم سے ہے۔ مگر وہ اردو شعرا کو کوئی درجہ نہیں دیتی۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اُسے یقین ہے کہ اس غلام ساز اور ٹوڈی طبقے سے کوئی نقصان نہیں پہونچ سکتا۔ کیا وجہ ہے کہ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا جائے پھر وہ تیمور و بابر کی طرح شرقی دارالفنون سے نہیں آئی ہے نہ اس کی زبان فارسی و اردو ہے نہ اس کا گھر ایشیا وہ ایک تجارتی قوم ہے اگر شاعر مانچسٹر کے کپڑے اور مغربی مصنوعات کا پروپیگنڈہ اپنی شاعری میں کرتے اور اس سے "تحریک بائیکاٹ" کو دبایا جا سکتا تو یقیناً شعرا کو کوئی چھوٹا موٹا منصب یا خطاب حکومت سے عطا ہو سکتا تھا۔

اس بحث کا یہ گوشہ بھی نہایت دردناک ہے کہ میرے علم میں شعرا کا ایسا طبقہ بھی ہے جس نے بعض ذمہ دار حکام کی تحریک پر وطن فروشی کا "مقدس" فرض ادا کیا۔ اور جو یہ کام نہیں کرتے ہیں وہ بھی میرے علم میں ہیں جن کی گردنیں حکام اور امرا کے سامنے گھورے پر پیدا ہونے والے درختوں کی طرح جھکی رہتی ہیں اور وہ اس ذلالت کو معراج خیال کرتے ہیں۔

سوسائٹی کے متعلق اظہار کرنے کے بعد مجھے کوئی باک اس حقیقت کے اعتراف میں نہیں

کہ اردو شعراء نے اپنی پوزیشن کو خود اس قابل نہیں بنایا کہ لوگ شاعرانہ عظمت کا اہل خیال کرتے بلکہ ہمیشہ گرایا اور ثابت کر دیا کہ ہم ڈوموں میراثیوں اور گویّوں سے زیادہ ارذل ہیں۔
آج سے چالیس برس پہلے ہندوستان کی مسلم سوسائٹی کا ہمارے صوبے میں یہ حال تھا کہ ازدواجی تعلقات کے سلسلہ میں جن محاسن کا مائین ت۔ [illegible] رہتا تھا ان میں سے ایک خوبصورتی شاعر ہونا بھی تھا۔ پھر ایک دور آیا کہ وہ افراد بداخلاق خیال کئے جانے لگے جو شعر کہتے تھے اور گو اثرات [illegible] نہیں مٹے ہیں لیکن کوئی شک نہیں کہ فضا بہت بدل چکی ہے تاہم سوسائٹی میں بلند سے بلند تر مرد محض شاعر ہونے کی حیثیت سے ازدواجی تعلق کا اہل خیال نہیں کیا جاتا۔
میرا مقصد اس [illegible] تمام رام کہانی سے صرف یہ ہے کہ سوسائٹی خودغرض اور بےحس بے درد نہیں، افراد کی قدر کرتی ہے جو اس کے معیار پر پورے اترتے ہوں لیکن جو خوددار انسان بن کر اس کے سامنے آسے یا ہم [illegible] کمرانی، ادبی عظمت کے احساس کے ساتھ آئے، اپنے منصب کی خودی کے ہمراہ ظاہر ہو، وہ اس کے لئے قابل پذیرائی نہیں۔ یہ لوگ جن کی تصانیف اور شاعری کے بارے میں اظہار خیال کر رہا ہوں وہ پنجاب کے اس شاعر طبقے سے تعلق نہیں رکھتے جو سوسائٹی کے غلام ہیں بلکہ یہ لوگ خود بلند سوسائٹی کے اس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جو ہر ایک کے منصب کو [illegible] کرتی ہے اور جنہوں نے اچھے ماحول میں تربیت پائی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے [illegible] میں ایک قسم کی بلندی کی روح کارفرما ہے۔ میری زندگی کی سب سے پہلی اور آخری خواہش یہ ہے کہ شعراء پنجابی اور محنت کو شعار کریں اور وہ حکومت و سماج دونوں کے [illegible] ہلا ہیں۔ اگر [illegible] ان کا ساتھ دے تو دنیا [illegible] زندگی کو بلند کریں۔ اور نہ ساتھ دے [illegible]

بہارِ جاوداں

مصنفہ خان صاحب نصیبی اور میر منظور دہلی وارثی

تین سو چوالیس صفحات کی یہ مجلّد و خوبصورت منظوم تصنیف پنجاب اکاڈمی نے شائع کی ہے جس کا کتب خانہ امرتسر میں لاہور کے ترقی یافتہ کتب خانوں سے مقابلہ کرتا ہے اور کوئی شک نہیں کہ یہ تمام کی کتاب پنجاب اکاڈمی ہال بازار امرتسر سے بیک وقت حاصل ہو سکتی ہے۔

تقریب بہارِ جاوداں

بہارِ جاوداں کی تقریب جوان سال و جوان فکر ادیب اور ہمارے عزیز دوست حضرت اختر شیرانی کے قلم کی ہے جو اپنے بسط اور اعادۂ تاریخ اور ادبیت کے لحاظ سے نہایت داد کے قابل ہے۔ لیکن تین سو چوالیس صفحات میں ۴۴ صفحوں کی یہ تقریب کتاب سے زیادہ نقد و نظر کی اہمیت رکھتی ہے۔ اور میں اسی تقریب بہارِ جاوداں پر سرسری اظہار خیال کرتا ہوں۔ میرا انتقاد سے ہرگز مقصود یہ نہیں ہے کہ اپنے دوست کی تکذیب کی جائے بلکہ ان حقائق کو بیان کر دینا ہے جو ان کے قلم سے رہ گئے ہیں یا جن سے [illegible] ایک صوبی خلاف ہے۔

[illegible] صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ:

اردو میں نیچرل شاعری کا آغاز سے مغربی ادبیات کے اثر کا ممنون ہے۔

مجھے اس سے اختلاف ہے بلکہ میرا [illegible] حقیقت اب بحث و تمحیص کی محتاج نہیں کہ اردو میں "نیچرل شاعری" کا آغاز کرنے والی مقدس ہستی نظیر اکبر آبادی کی ہستی ہے اس نے نہ صرف آغاز کیا بلکہ ایک اسکول کی تخلیق کی اور پھر اس کو اس درجہ پر پہنچا دیا جس کو "تکمیل" کا درجہ کہتے ہیں۔ اس لئے صرف نظیری ہی [illegible] کو اردو کی حقیقی نیچرل شاعری کا "خدا" کہا جا سکتا ہے یعنی تاج محل کی آغوش میں ٹوٹے ہوئے مزار کے اندر سونے والا یہ صوفی اپنے وجود کے بعد ابد تک پیدا ہونے والے ان شعراء کا جو رنگ جدید اختیار کرتے اور ان میں نئے نئے رنگ بھرتے جائینگے تنہا معبود ہے کوئی تاریخ باوجود کوشش اس کے تقدم اور خالقیت کے ارفع ترین درجہ سے گرا کر موثرین نے یا عقیدت کا مرتبہ دینے کی گستاخی نہیں کر سکتی۔
لیکن وہ کیا اسباب و حوادث ہیں جن کی بنا پر نظیر کو نظر انداز کیا جاتا رہا ——— ؟
اس کی سب سے پہلی وجہ اس زمانہ کے شاعرانہ ذوق کی غیر ہم آہنگی تھی اور یہ کہ اردو میں اعلیٰ اور ممتاز طریقے سے نظیر کو پیش نہیں کیا گیا۔ یہی وجہ ہوئی کہ غزل کے مقابلے میں نظیر کی نظم کی تقلید نہیں ہو سکی۔ لیکن جہاں تک شاعری کے اسلوب کا تعلق ہے وہ انگریزی زبان کے رجحانات اور موثرات سے قبل معرض تخلیق اور بہ صورت تکمیل میں نمودار ہو چکا تھا یہ دعوی تسلیم کے قابل نہیں کہ انگریزی ادب کی ترویج سے پہلے اردو زبان میں "نظم" اپنی تکمیل کی صورت میں موجود نہ تھی۔ عرصے سے پہلے نظیر پیدا ہو چکا تھا۔
آگے چل کر اختر صاحب نے تحریر فرمایا ہے جس کو پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ۔
"تحریک اصلاح کے بانی ہونے کی حیثیت سے پروفیسر آزاد مرحوم کا کلام ایک مخصوص توجہ کا طلب گار ہے کیونکہ" وہ ہماری جدید شاعری کا سب سے پہلا نمونہ اور نقش اول کی حیثیت رکھتا ہے"۔
یہ تحریر کرنے کے بعد وہ آزاد کی شاعری پر تنقید [illegible] کرتے ہوئے خاتمہ پر فرماتے ہیں:
"پروفیسر آزاد مرحوم کی کاوش و [illegible] ان کے منظومات کی تشنگی کو مدنظر رکھتے ہوئے ہمیں اس فیصلہ پر آمادہ ہونا چاہیئے کہ اردو میں نیچرل شاعری یا جدید شاعری کا سنگ بنیاد آزاد نے ضرور رکھا۔ مگر عمارت کی تعمیر ان کے دست و بازو کی ممنون نہیں یہ فخر قدرت نے ایک اور ہی پیکر کے لئے مخصوص کر رکھا تھا جو حقیقتاً شاعر تھا اور روح شعریت کا رازداں"

229

حالی

"ناظرین تعجب کریں گے [illegible] ذرا غور کریں گے کہ حالی شاعر کے حقیقی ترجمان حالی کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا"
مندرجہ بالا سطور کے مطالعہ کے بعد یقیناً آپ حیرت کریں گے کہ اختر صاحب کے [illegible] ایک [illegible] دیا جاتا ہے جیسے کہ دکھلایا جائے تو [illegible] [illegible] کی حیثیت [illegible] ہوں۔ اول تو وہ جدید شاعری کا [illegible]
[illegible] صورت میں [illegible] بعد خود [illegible] کی تکذیب [illegible]
آزاد کے [illegible] حالی [illegible] مستقل [illegible]
لیکن ہمارے [illegible] بات [illegible] نہایت [illegible]
کہ علاوہ [illegible] تاریخ کے خلاف [illegible] آزاد ہوں [illegible]

حالی دونوں نظیر اکبرآبادی کے مقلد ہیں اور اگر سچ پوچھئے تو اردو میں نظم نگاری کا بنیادی خیال پیدا ہونے کی وجہ نظیر اور صرف نظیر ہے۔ مولانا حالی، مولانا آزاد اور مولوی اسمٰعیل یہ تینوں ہستیاں اپنی اپنی جگہ اردو ادب میں نہایت بلند درجہ رکھتی ہیں وہ اگر ان کے متعلق اختر یہ کہتے کہ مولانا آزاد اور مولانا حالی نے اسلوب نہیں بلکہ خیال کا انقلاب کیا تو یہ دعویٰ تسلیم کے قابل تھا مگر یہ ہرگز نہیں کہ مولانا حالی نظم جدید کے خالق ہیں۔ بانی اور حقیقی بانی وہی ہے جس کے نام کو اختر شیرانی نہایت قابلیت سے ادبیت کی شراب بکھیرتے اور دماغوں کو مست کرتے ہوئے چپکے سے پی گئے۔ مگر چھپ کر چھپ پی جانے کی نمایاں ہوگی۔ یہ تاریخی حقیقت کبھی غلط نہیں ہو سکتی کہ نظیر اکبرآبادی جدید شاعری کا بانی اول اور اپنے رنگ کا بادشاہ تھا۔ آزاد و حالی اور اسمٰعیل تینوں محترم ہستیاں نظیر کا انعکاس ہیں جب کسی نور کا پرتو کسی شے پر پڑتا ہے تو ظاہر ہے کہ اصل شے کے ذاتی جوہر بھی کھل اٹھتے ہیں۔ چنانچہ نظیر کا پرتو جب آزاد و حالی اور اسمٰعیل پر پڑا تو ان کی خلاقی کے جوہر بھی کھل کر رہے اور شاعری کو اخلاقی رنگ دینے کی جو کامیاب کوشش مولانا حالی و آزاد نے کی اس سے ہرگز انکار نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ یہ بجائے خود بحث طلب موضوع ہے کہ شاعری کو اخلاقی بنا دینا فن کے لحاظ سے خطابت کا درجہ رکھتا ہے یا شاعری کا۔

مولانا حالی کے قیام لاہور کا تذکرہ کرتے ہوئے ہمارے دوست کہتے ہیں کہ :-

"کلام حالی کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ ان عنوانی مشاعروں میں بحر خیالات حالی نے کیسے کیسے آبدار موتی اگلے ہیں۔ حب وطن۔ برکھا رت۔ نشاط امید۔ یہ اردو کی جدید شاعری کے وہ نو طلوع ستارے تھے جو غروب کی تاریکی سے آج تک آشنا نہیں ہوئے۔"

کیونکہ اختر سے محبت ہے اور میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ انتقاد کے معیار صحیح سے گزر کر جذباتی نہ بن جاؤں اس لئے بہت پیچ پیچ اور گھٹ گھٹ کر لکھ رہا ہوں لیکن مجھکو حیرت ہے کہ ہر گام پر وہ اس ہادی اور اس رہبر کو فراموش کرتے جاتے ہیں جس نے جدید شاعری کی ہدایت دی اور جس کے مجموعۂ کلام نے جو انتہائی فرسودگی اور بے انتخابی کے ساتھ ضخیم صورت میں چھپا ہوا اردو کی لائبریری میں پڑا تھا۔ ان عظیم منزل نو کی طرف رہبری کی جس پر آج ہم گامزن ہیں۔

میں سخت تعجب کرتا ہوں کہ حالی کی برکھا رت کا ذکر کرتے ہوئے وہ نظیر اکبرآبادی کی شاہکار برسات کو بھولے جاتے ہیں اور بھلائے دیتے ہیں۔ کیا اختر اس باب میں بحث کر سکتے ہیں کہ برسات پر جیسی نظم نظیر نے کہی اس وقت تک اردو میں کسی نے کہی ہے۔ نظیر حقیقی طور پر مصور فطرت تھا اور اس کے زمانے سے اس وقت تک شعراء میں سے وہ حق کسی کو نہیں دیا جا سکتا جس کا حقدار نظیر اور صرف نظیر رہے۔ جو اختر صاحب نے اردو کی "نیچرل شاعری" کا اولین دور فرض کیا ہے وہ خیالات کے انقلاب اور تحریک کے لحاظ سے پہلا دور فرض کیا جا سکتا ہے لیکن پہلا دور وہی ہے۔ جو نظیر اور اس کی مکمل شاعری سے تعلق رکھتا ہے۔

اپنے خیال میں نظیر کے مزار کے ذرات باقی بھی ہوائیں اڑا کر اختر

آگے بڑھتے ہیں اور پورے ایک صفحہ پر حالی و آزاد کے زمانے میں ہندوستانیوں کی مغرب زدگی ادب اردو اور ایشیائی شاعری سے اجتناب پر تبصرہ فرماتے ہیں جس کا ماحصل یہ ہے کہ ایک عام بدمذاقی اردو شاعری کی طرف سے ملک میں پھیلی ہوئی تھی کوئی شک نہیں مگر ہم ان کو بتانا چاہتے ہیں کہ بہی وہ اوقات بھی تھے کہ شیلے، ڈکنس اور انگریزی شعراء کا مطالعہ نہایت خاموش انداز میں مشرقی شعراء اور خصوصاً اردو شعراء کو نامحسوس طور پر عرفاں کرنے کی دعوت دے رہا تھا اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ غالب کو حیات جاوید حاصل ہوئی، اور ہر وہ شے جو وزن نہیں رکھتی تھی ہوا میں اڑ گئی، اور باوزن اشیاء اپنے مرکزوں پر قائم ہو گئیں

اس کے بعد وہ اکبر و اقبال و نادر کاکوروی سرور جہاں آبادی شبلی مولوی اسمٰعیل میرٹھی محسن کاکوروی میر نیرنگ مولوی ظفر علی خاں طالب بنارسی کا بیان کرتے ہوئے اس مقام تک آتے ہیں جہاں انھوں نے تیسرا دور قائم کیا ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں انھوں نے طالب بنارسی کا ذکر کرتے ہوئے نظیر اکبرآبادی کا ذکر مندرجۂ ذیل الفاظ میں کیا ہے کہ :-

طالب بنارسی جو آمد سخن کے بہتے دریا تھے۔ گو ان کے کلام پر کبھی کبھی نظیر اکبرآبادی کی "آزادانہ" بولی ٹھولی کا شبہ ہو جاتا ہے۔

"یعنی عامیانہ" بازاری بولی ٹھولی۔ یہ بھی کیا کم احسان نظیر کی روح پر اختر نے کیا کہ اس کو جدید شاعری کے مقلدین کا ذکر کرتے ہوئے یاد فرما لیا ورنہ وہ تو اس مقام پر بھی یاد کرنے کے قابل نہ تھا۔

تیسرے دور میں ان کو صرف ایک قابل ذکر شاعر بدقت تمام حاصل ہو سکا اور اس کا نام جوش ہے ——— !

حضرت جوش ملیح آبادی میرے بے تکلف دوست گہرے مخلص ہم قوم، ہم خیال ہم مزاج، ہم ذوق اور ہم عصر ہیں۔ اور یہ سعادت مجھ ہی کو حاصل ہوئی تھی کہ میں نے اپنے دوست اختر کو محترم جوش سے متعارف کرایا اس لئے اختہ ہوں یا جوش فنی اظہار خیال اور انتقاد ادبی کے سلسلے میں کوئی بات ذاتیات پر موثر نہیں ہونی چاہیئے۔

اس شکایت کے اور کہ انھوں نے "حق بحقدار رسید" کے اصول سے آنکھ بند کر لی میں اس اہتمام کو اتنی کک ماننے پر ... مت چپکا دینا چاہتا ہوں کہ وہ بعض مسلم الثبوت استادوں کو عمداً نظر انداز کر گئے اور جوش صاحب کے متعلق انھوں نے جو کچھ تحریر فرمایا وہ مجھے معاف فرمائیں اس کے الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ تکلف سے کام لیا جا رہا ہے بجائے اس کے کہ :-

"تشریح مناظر کے ساتھ ساتھ تصریح جذبات میں بھی اپنے پیشرو شاعروں کی بہ نسبت کامیابی سے زیادہ قریب ہیں۔"

یہ کیوں نہیں کہتے کہ جوش اپنی شاعرانہ خصوصیات جو صناعیٔ الفاظ رنگینی فطرت نگاری اور خلاقی پر مشتمل ہیں اقبال سے زیادہ کامیاب شاعر ہے۔

تکلف کی کیا ضرورت ہے جری اور بے درق پرست اور آزاد ہو بیجا پی نہیں: نیا صفحۂ عالم سے حق کے پیچھے تمہارا نام مٹا۔ بنا چاہے تو مٹا دینے دو مگر حق کے مرکز سے نہ ہٹو

سب سے بڑی عبادت حق پرستی ہے۔ حالی کے ساتھ اکبر اور اکبر الہ آبادی کے ساتھ سر اقبال کو بٹھایا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اکبر الہ آبادی سے ایک دور قائم ہوتا ہے۔ جو منتج ہے۔ جوش اور ان لوگوں پر جن کو دہ دیدہ دلیری کے ساتھ نظر انداز کر گئے۔

.. ..

.. ..

اقبال کے بعد نادر کاکوروی سرور جہان آبادی کا ذکر ہمارے خیال میں تاریخی طور پر غلط ہے سرور جہان آبادی کے انتقال کو تقریباً ۲۰ برس ہو گئے اور اسی طرح نادر کاکوروی بھی نظم نگاری کی نئے مذہب کے پیرو تھے۔

سر اقبال کو ان لوگوں میں تشخص اور امتیاز حاصل ہونے کی وجہ محض یہ ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری کو "اسلامی" بنایا یا وہ ان کے تقاضائے فطرت سے مذہبی بن گئی اس کے علاوہ ان کی شہرت کا اصلی سبب اُن کا اسلامی رنگ تھا۔ یعنی خیال کی وحدت و اجتہاد اور عدم اس کا ثبات۔ ان کی شاعری ان کی فکر کا نتیجہ ہے ظاہر ہے کہ مفکر ہر شخص نہیں ہو سکتا۔ "خیو بانگ درا" میں بہت دور تک فکر کا ثبات نہیں پایا جاتا۔ اور وہ "متذبذب" نظر آتے ہیں اس کے بعد ان کو ایک راہ بعد تلاش مل جاتی ہے جو "پان اسلامزم" کی راہ ہے اور آج تک وہ اسی راہ پر چلے جا رہے ہیں دوسرے شعرا کا مطالعہ اردو یا زیادہ سے زیادہ قدیم فارسی عربی شاعروں تک محدود تھا۔ اقبال نے مغربی و مشرقی شعرا سب کو دیکھا اور مغربی خیال کے لحاظ سے "پیغام" کو ترتیب دیا۔ اگر وہ کامیاب ہیں تو ان کی کامیابی کی سب سے بڑی وجہ ان کے پیغام کی مسلسل یکسانیت ہے اور اگر وہ ناکام ہیں تو اس کی حقیقی وجہ بھی ان کا یہی پیغام ہے جو ان کو ملی زمین خصیب کا مرتبہ عنایت کئے ہوئے ہے۔ جوش صاحب کا ذکر غالباً اختر کے قلم نے اس لئے ناگزیر خیال کیا کہ وہ ان سے بہت متاثر ہیں ورنہ انداز تو یہ بتاتے ہیں کہ اگر ممکن ہوتا تو وہ ان کو بھی پی جاتے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ نصف گلاس کے برابر وہ ان کو یقیناً چڑھا گئے ہیں ہمارے خیال میں جوش کا مرتبہ اس سے بلند تر ہے جو مرتبہ ان کو "بہار جاوداں" کی تقریب میں دیا گیا ہے۔

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ :-

"جو رنگ سخن عصر حاضرہ کے نوجوان اور "غنائی" شعرا کا موضوع فکر بنا ہوا ہے وہ روح ادب کا بھی ممنون تقلید ہے۔

جوش صاحب کے بعد باقی نوجوان شعرا اختر کے نزدیک تمام کے تمام جوش اور ان کے "معاصرین" کے مقلد ہیں اور کیونکہ

"وہ دنیائے ادب میں مصروف ہیں اور رکھے ... ان کے متعلق رائے زنی قبل از وقت ہوگی۔ بنا برین ان کا فیصلہ ان کے ... مستقبل کے حوالے ... ان میں بعض معترضین کے تتبع میں ... بیشتر اقبال کے مقلد ہیں۔

یعنی ان کی ہستی صفر کے برابر ہے ... نوجوان شعرا ... ہمارے دوست کا شکریہ ... معلوم ان کی شاعری کا کیا مستقبل ہوتا ...؟

بیشتر اقبال کے مقلد ہیں ——— اس فقرے کے بعد سے "بہار جاوداں" کے مصنفین کے متعلق اظہار خیال کیا گیا ہے اور اس سے ہمیں بحث نہیں ہے۔

آخر میں ہم اپنے دوست کی خدمت میں باادب عرض کرنا چاہتے ہیں کہ "تقریب" کا طریقہ بہت کچھ "ڈپلومیٹک" ہو گیا یہ محض اس لئے کہ وہ جزئیات میں الجھ کر رہ گئے ان کے لئے سیدھی راہ یہ تھی کہ وہ دلی اور صابر کے اصل کلام پر اظہار رائے کرتے اور یہی عافیت کی راہ تھی دلچسپ ترین بات یہ ہے کہ ہم نے ۲۴ صفحات میں غور رگور صفحات سطور بین السطور الفاظ اور ان کے دوائر سب کو دیکھا مگر یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ خود اختر صاحب نے اپنے لیے کون سا دور اور کون سا منصب فرض کیا غریب "غنائی" شاعر تو تین چار ہی ہیں۔ اور ان سے انہیں کیا مطلب جبکہ آپ اپنا کلام "نثر" میں بھی نہیں فرماتے۔ پھر کیا حضور نے اپنی ہستی کو خدانخواستہ "مستقبل کے حوالے" کر دیا؟

"بہارِ جاوداں"

تقریب نگار کا نظریہ | لیکن بہر حال ہمارے دوست اختر شیرانی نے تقریب نگاری کا حق ادا کر دیا ہے اور جو پلاٹ اپنی تقریب کا ترتیب دیا ہے وہ صورت رکھتا ہے ہمیں جن "خطوط" کی کمی محسوس ہوئی آزادانہ اور دوستانہ طور پر کھینچ دئے اب آگے بڑھنے کے لئے ضرورت پڑ گئی ہے کہ ہم تقریب نگار کے نظریہ سے بحث کریں تو الیس اختر صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ :-

اقبال کے متبعین کی تعداد کافی وسعت رکھتی ہے لیکن اس طویل بحث کی دشواریوں سے عہدہ برآ ہونا درحقیقت اقبال کے مقدمہ نگار کا فرض ہے"۔

ان سطور کے معنی یہی ہو سکتے ہیں کہ اپنی تقریب میں وہ جن افراد کا ذکر نہیں فرمانا چاہتے۔ وہ تمام کے تمام اقبال کے متبعین یعنی "عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے"۔ اس وقت ان کو صرف دلی و صابر کی متبعانہ پوزیشن سے بحث کرنی ہے اور وہ بقیہ مقلدین کا نام نہیں لینا چاہتے۔ میرا خیال ہے کہ اس باب میں اختر کی پوزیشن خطرہ میں پڑ جاتی ہے وہ اپنے ماحول کو ... کرنے کے لئے اس غلط راہ پر جا پڑے ہیں جو ان کی مرتبت کے خلاف ہے اور بے راہ روی ان پر تین الزام عائد کرتی ہے (۱) یہ کہ خدانخواستہ عمداً وہ لوگوں کو نظر انداز کر رہے ہیں (۲) یہ کہ وہ ان شخصیتوں کو جن کی مجتہدانہ پوزیشن مسلم ہے "متبع" سمجھتے ہیں (۳) یہ کہ وہ سنگدلانہ طور پر حقوق غصب کر رہے ہیں (۴) یہ کہ (توبہ توبہ) ان کی ... معلومات بہت ہی محدود ہیں اور حافظہ بہت کمزور ... جہاں تک ... کا تعلق ہے میں اپنے دوست کو محدود علم و وقوف کا ... خیال نہیں کرتا اس لئے یہ الزام تو ختم ہوا۔ رہے باقی الزامات ... متعلق بھی ... نہیں چاہتا کہ ... قلب ... متعلق ... الزامات ... جائیں ... یقین ہو جائے۔

لیکن ... آغا حشر ... مرحوم ... آبادی کی

پوزیشن اُن کی نگاہ میں اقبال کے متبعین کی ہے یا بجائے خود وہ کوئی درجہ جدید شاعری میں رکھتے ہیں؟ ان کے علاوہ بھی بعض شعراء ہیں جن کی انفرادیت سے بحث کی جاسکتی ہے گر میں جزئیات میں الجھ کر رہ جانا پسند نہیں کرتا۔ یہاں یہ واضح کر دینے کی ضرورت ہے کہ اردو کے حالیہ متغزلین کا اس بحث سے کوئی تعلق نہیں ہے جیسا کہ خود اختر کی تقریب سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔

اس مقام پر چند لمحے رک کر یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ "قوم" کا اطلاق کس اجتماعیت پر ہوتا ہے اس کی نمائندگی کس طرح کی جاسکتی ہے اور "قومی شاعری" کی حقیقی تعریف کیا ہے؟؟

قوم اور اُس کی تعریف

قوم افراد کے مجموعہ کا نام ہے نہ صرف افراد بلکہ جدید تصور کے لحاظ سے قوم نام ہے ان تمام فرقوں کے مجموعہ کا جو کسی ملک میں بستے ہوں۔ ایران میں مسلمان بھی ہیں جن میں شیعہ بھی ہیں سنی بھی اور ان کے علاوہ زرتشتی عقائد رکھنے والے پارسی بھی لیکن لفظ قوم کا اطلاق ان تمام فرقوں پر ہوگا جو "ایرانی" ہیں اور جب ہم "ایرانی قوم کی" بحیثیت سے بحث کریں گے تو ایران کا ایک ایک فرد بغیر مذہب و ملت ایک "قوم" تصور کیا جائے گا۔

اسی طرح جب ہم "ہندوستانی قوم" کا تصور کریں گے تو صرف ۷ کروڑ ۷ لاکھ ۴۴ ہزار ۹ سو ۲۸ مسلمان ہمارے پیش نظر نہیں ہو سکتے بلکہ "ہندوستانی قومیت" کا تخیل اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک ہم ۲۳ کروڑ ۸ لاکھ ۳ ہزار ۹ سو ۲۷ ہندوؤں ۴ لاکھ ۶ ہزار ۱ سو ۲۴ سکھوں اور ۵۹ لاکھ ۶۰ ہزار ۸ سو ۲۷ عیسائیوں کو بھی شریک نہ کر لیں۔

"قومی شاعری" اور اس کی تعریف

کوئی شاعر ہو یا لیڈر ادیب ہو یا مورخ جو اس حقیقت کے تحت نمائندگی قوم کے فرائض ادا نہیں کرتا وہ "قومی شاعر" "قومی لیڈر" "قومی ادیب" اور "قومی مورخ" نہیں ہے۔ بلکہ "فرقہ پرست" ہے اب مجھے فاضل تقریب نگار بتائیں کہ کیا مولانا حالی نے اس حیثیت سے ۳۵ کروڑ ۲۹ لاکھ ۸۹ ہزار ۸ سو ۷۶ افراد یعنی قوم کی نمائندگی اپنی قومی شاعری میں کی ہے یا ڈاکٹر اقبال اس معیار کی کسوٹی پر پورے اترتے ہیں؟؟ اختر صاحب کے الفاظ میں بالکل بجا لکھا ہے کہ اس لحاظ سے "مسدس حالی" کا درجہ ایک فرقہ پرستانہ نظم کا درجہ ہے۔ اس میں محض مسلمانوں کی نمائندگی کی گئی ہے۔ ممکن ہے میرے وقوف میں نقص ہو اور محدود علم کا احساس حصول واقفیت کے لئے آپ جیسے ادیب سے یہ دریافت کرنے کا حق رکھتا ہے کہ اقبال کا پیغام صرف ایک قوم کے لئے ہے یا نہیں؟؟ اور کیا وہ اس فرقہ پرستانہ نمائندگی کے لحاظ سے ہندوستان کا قومی شاعر کہلانے کا حق رکھتا ہے میرے خیال میں اسے خالص اسلامی شاعر کہنا چاہیے اور وہ واقعی طور پر خالص اور رفیع ترین اسلامی شاعر ہے۔ اس کا پیغام "اسلامی قومیت" کے نام سے ہے جو یقیناً ملک و لباس اور کسی ایک زبان و کلچر میں مقید و محدود نہیں۔ مگر وہ قومیت ہے کہاں؟

فرقہ پرستانہ شاعری

موجودہ دور میں فرقہ پرستانہ شاعری دشمنی امن ہے اس لئے نہایت بے موقع اور غلط چیز ہے اور شاعر کے بلند درجہ پر متمکن ہوتے ہوئے "پوپ" اور "مفتی اعظم" بن جانا انتہائی درجہ کی پستی ہے۔ ہمارے تقریب نگار بلند درجہ کے خالص شاعر ہیں اس لئے وہ جانتے ہیں کہ شاعر مذاہب سے بلند ہوتا ہے اور یہ ساری کائنات اس کے ایک نغمہ ہو میں رقص کرتی ہے۔ اس کو فرقوں اور افراد کے جھگڑے سے کیا غرض اس کو مذاہب اور کفر و ایمان کی اعتباری و متصورہ حد بندیوں سے کیا تعلق؟ وہ تو ایک آزاد فرشتہ ہے کبھی یہاں کبھی وہاں سومنات میں بھی اس کے لئے وہی جلوہ ہے جو جامع مسجد دہلی میں، ناقوس سے جو آواز نکلتی ہے وہ اسے اذان معلوم ہوتی ہے اور اذان میں جس کی ثنا ہوتی ہے وہ بتوں میں مسکراتا ہوا نظر آتا ہے۔

اچھا آئیے اب یہ غور کریں کہ اس قسم کی نمائندگی سے کس قسم کی ابتری پھیلی ہے ایک صاحب ۹ کروڑ افراد کی قیادت کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ تم دنیا میں سب سے افضل تھے۔ ہندوستان میں بادشاہ تھے اور اب بھی تمہارا ہی حق ہے کہ دنیا کو فتح کرو اور ہندوستان میں مغل جیسی سلطنت کی بنیاد پھر ڈالو دوسری طرف ایک صاحب ۲۳ کروڑ افراد سے کہتے ہیں کہ ہندوستان تمہارا قدیمی وطن ہے اور تم اتنے افضل ہو کہ جب دنیا تاریک تھی تو فلسفہ زندگی تم نے مرتب کر کے پھینک دیا تھا اور انسانی تہذیب کی بنا ڈالدی تھی تمہارا حق ہے کہ تم ہندوستان کے واحد حاکم ہو۔ قدیم کلچر کو پھر زندہ کرو اور ایک نئے آریہ ورت کی بنا ڈالو۔

مجھ کو بتایا جائے کہ ان دونوں "پیغمبروں" کو کس درجہ کا مجرم خیال کیا جائے گا جب تمام اقوام میں ان کے پیغامات وہ زہریلی بنائے مخاصمت ڈالدیں گے۔ جس کے نتائج نہایت ہی مہلک اور ظالم ثابت ہو سکتے ہیں۔

خیر یہ تو تھی ایک ضمنی بحث لیکن کوئی شک نہیں کہ حشر مرحوم کے ساتھ اختر شیرانی نے باوجود ان کے سمجھتے ہوئے ظلم کیا اور جکبست کے ساتھ ان کی ناانصافی معاف نہیں کی جاسکتی مجھکو کہنے دیا جائے کہ صرف چکبست ہی اپنے زمانہ تک ہندوستان کا حقیقی قومی شاعر کہلائے جانے کا مستحق ہے اس لئے کہ اس نے "قوم" کی نمائندگی کی ہے اور اس کے کلام سے جو محدود وقت کی فکر کا نتیجہ ہے (کیونکہ اس کا انتقال جوانی ہی میں ہوگیا) تو میت کی روح جھلکتی پڑتی ہے وہ اسی طرح قومی شاعر ہے جس طرح ترکی میں قومی شاعر ہیں جس طرح ایران میں قومی شاعر ہیں جس طرح افغانستان میں قومی شاعر ہیں جو ترکی، ایرانی، افغانی قوم کی نمائندگی کرتے ہیں یہ تخیل نہیں رکھتے کہ اگر ۹ کروڑ ہندوستانی ہم سے مل جائیں تو ہم ہمسایہ سلطنت کو فتح کر لیں، وہ خواب نہیں دیکھتے، جہد حیات کی حقیقت کو جانتے ہیں۔

اقبال اور اس کی خصوصیات

میرے نزدیک کسی شاعر کو پرکھنے کے لئے یہ کسوٹی ہی غلط ہے کہ وہ قومی شاعر ہے یا غیر قومی۔ اس کو فنی معیار شاعرانہ پر معلوم کرنا چاہئے۔ یہ دیکھنا چاہئے کہ وہ خیال و بیان پر کس درجہ قادر ہے۔ کس کس قسم کے رنگ اور خوبیاں اس کے اسٹینڈرڈ میں موجود ہیں۔ اور یہ اس کے نقوش دیکھنے چاہئیں کہ وہ فن کے لحاظ سے کیا درجہ رکھتے ہیں۔؟

اقبال کو محض اس لحاظ سے مجتہد اعظم کہنا کہ اس نے "پین اسلامک" عقیدے کی اپنی نظم میں اشاعت کی یا مذہبی خیالات نظم کئے ہیں میرے نزدیک غلط چیز ہے ممکن ہے کہ ۵۰ برس کے بعد "پین اسلامک" عقیدہ کتابوں کے ورق ہی میں پایا جائے اور بہت ممکن ہے ایک صدی

کے بعد مذہب کا کوئی درجہ سوسائٹی میں باقی نہ رہے جب کہ الحاد کی انتہی ہوئی موج سے بلند بھی ہوتا ہے اس وقت اقبالؔ کس نگاہ سے دیکھا جائے گا؟ یقیناً اس کا ہر وہ شعر جس میں آج مذہب کی چینکاری سنگتی محسوس ہوتی ہے ذوقؔ کی شاعری کی طرح بے روح دکھائی دے گا تو کیا اقبالؔ اتنا کم عمر ہے ——————— - ؟؟

میرا ایمان ہے کہ اس کو اس کا یہ سلامک پیغام نہیں بلکہ اس کی شاعری زندہ رکھے گی اس کو اس قسم کے مصرعے زندہ رکھینگے ع

نفسہ وز حُسن کہ غبار ملز سیدا شد

باوجود اس "ملائیت" کے جو اس کو شاعر کے درجہ سے گراتی ہے وہ مکمل بلند اور جامع شاعر ہے، وہ الفاظ کی ایک خاص قسم کی کم رنگ تراش کی ہے کہ اس میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو شاعری میں ہونی چاہئیں اور میرے علم میں ہے کہ اس کا سینہ عشق کے شہد و شکر در شراب و نور سے لبریز ہے اور وہ روحانی طور پر "ملا" نہیں ہے عاشق ہے مگر کیونکہ اس نے بہ حیثیت مفکر ہندوستانی مسلمان کا علاج بھی خیال کیا ہے جو اس کے نسخہ سے ظاہر ہوتا ہے اس لئے وہ خود نہ... در بہ حیثیت طبیب سنبھل سنبھل کر ہوش مندانہ قدم اٹھاتا ہے۔

اس کی طرح اس کے ہم عصر اور ہم عمر مجتہدین کو بھی صرف ان کی خالص شاعری زندہ رکھیگی حقیقت آج یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ کون مجتہد ہے اور کون متبع اردو شاعری تیزی سے ارتقا کی منزلیں طے کر رہی ہے اور تمام افراد ایک دوسرے سے متاثر ہو رہے ہیں یہی نہیں موجودہ ماحول سے متاثر ہو رہے ہیں اگر آج میں مزدور کی نمائندگی کرتا ہوں در کل زید تو زید کو میرے متبع ہونے کا الزام کیونکر دیا جا سکتا ہے دونوں ایک زمانہ سے متاثر ہوئے اور اظہار کیا رہا کیف و کم کا سوال تو یہ اپنی اپنی قوت متاثرہ اور اپنا اپنا ذوق ہے جتنا جو محسوس کرے۔

مجھے معاف فرمایا جائے تو میں عرض کروں کہ آپ کا مجتہد شاعر خود آزاد و حالی در جدید فارسی شاعری کی "مخلوق" ہے، قول اول اس کے کلام میں "وطنیت کی جھنکار" جدید فارسی شاعری کے مجمر ہی سے مستعار لی گئی نہ صرف یہ بلکہ بعض چیزیں اور طرز بیان بھی۔

لیکن بہر حال اس سے بحث نہیں ہے کہ کون کیا ہے مدعا اعتراض کے قابل بات صرف یہ ہے کہ عدل قائم نہیں رہا۔ انتقاد کے معنی یہ نہیں تھے کہ ایک کی آبادی کے لئے دوسروں کے محل اجاڑ دئے جائیں ایک کی زندگی کے لئے دوسروں کا گلا گھونٹ دیا جائے گفتگو کی گنجائش ابھی بہت کچھ ہے لیکن مضمون کافی طویل ہو گیا، دراصل موضوع یعنی "بہار جاوداں" پر اظہار خیال باقی ہے ہر چند کہ جو کچھ میں نے عرض کیا وہ جہاں تقریب پر روشنی ڈال رہا ہے وہاں اس کی شعاعیں "بہار جاوداں" پر بھی پڑ رہی ہیں۔

بہارِ جاوداں

خان صابر خلیلی امرتسری اور میر منظور محمود ولیؔ کی مشترکہ تصنیف ہے پہلا حصہ صفحہ ۲۵ سے ۱۰۸ تک صابر صاحب کی نظموں اور غزلوں پر مشتمل ہے صفحہ ۲۵ سے صفحہ ۱۶۶ تک نظمیں ہیں اور صفحہ ۱۶۷ سے صفحہ ۲۰۸ تک غزلیں دوسرا حصہ ۲۲۱ سے شروع ہو کر صفحہ ۲۴۴ پر ختم ہوتا ہے۔ اور یہ ولی صاحب واثق کی نظموں اور غزلوں پر مشتمل ہے۔

صابر اور ولی کی شاعری کے متعلق جو کچھ اختر صاحب نے تحریر فرمایا اس سے ہم جا بجا متفق ہیں امرتسر کے لئے مندرجہ ذیل فقرے کہ:-

وہ امرتسر کہ سرت رُخ بہ تماشا گلنار آورم

کی روشنی میں حقیقتاً ایک بلدہ شعر و موسیقی ایک مصر حسن و شباب اور ایک بہشت رنگ و بو کی حیثیت رکھتا ہے جس کے ہر ذرہ میں احساس و وجدان پرست اور روح طراز دلوں کے لئے ہزاروں رنگینیاں اور سحر طرازیاں بیقرار ہیں ؎

بہ تسلیم ہوائے آں مین زار از موج گل بہار بستہ زنّار

اختر کی ادبیت کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ اس کے بعد صابر و ولی کے خلوص و ذوق کے متعلق بھی جو کچھ تحریر کیا وہ روشن حقیقت ہے اور ان کے اہل دل ہونے کے متعلق بھی جو کچھ اختر نے لکھا ہے، ہمیں بھی ان کی ندرت کا فخر حاصل ہوا ہے پھر ان کی شاعری کے متعلق اور اس کے محاسن کے بارے میں جو کچھ ارشاد فرمایا اس سے انکار کرنا معصیت ہے۔ لیکن میں نے شروع سے آخر تک "بہار جاوداں" کا مطالعہ کیا تو میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ڈاکٹر اقبال کے تتبع کی حیثیت سے ان حضرات کو اختر صاحب جو کریڈٹ دینا چاہتے ہیں وہ زیادہ اہم نہیں اور میری رائے یہ ہے کہ بہ حیثیت تتبع اقبال وہ اس قدر بلند نہیں ہیں جس قدر کہ وہ دوسری حیثیت سے دیکھے ہیں۔

میرا فیصلہ یہ ہے کہ دونوں شاعر اسلامی نظم نگاری کے لئے پیدا نہیں ہوئے بلکہ نظم نگاری اور خالص شاعری کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ لیکن پنجاب کے اذہان میں ایک یہ بات جم کر رہ گئی ہے کہ حقیقی شاعری وہ ہے جس میں مذہبیت اور اسلامیت ہو اسلئے ان حضرات کی سعی بھی یہی معلوم ہوتی ہے یعنی بجائے اس کے کہ کوئی ان کی روح شاعری کی تعریف کرے یہ "قومی شاعری" میں مخصوص خیال کئے جائیں۔ چنانچہ تقریب نگار نے بھی "قومی شاعری" پر اظہار خیال کرتے ہوئے کافی جگہ لے لی لیکن "جذبات نگاری" کا باب چند سطور پر ختم ہو گیا ہے اسی طرح منظریہ شاعری کو بھی قومی شاعری کے مقابلے میں کوئی زیادہ اہمیت نہیں دی گئی۔ اسکے بعد اختر نے انکی غزل پر بہت ہی کم روشنی ڈالی ہے حالانکہ میری رائے یہ ہے کہ بہ حیثیت متغزل کے یہ دونوں ایک درجہ رکھتے ہیں اور انکی غزل میں کافی عذوبت و شیرینی پائی جاتی ہے تغزل کے معیار پر انکی غزل بہت بڑی حد تک درست اترتی ہے اگرچہ تغزل میں کوئی انفرادیت پیدا نہیں ہوئی تاہم جو رنگ عام ہے اس میں ثبات و لذت کافی سے زیادہ موجود ہے یعنی کسی شاعر کو معلوم کرنے کا جو معیار ہو سکتا ہے اس معیار پر اگر ان کو پرکھا جائے تو یہ صحیح اترتے ہیں ان کا احساس اپنی جگہ پر صادق سہی لیکن ان کی اسلامی نظموں میں وہ حرارت نہیں پائی جاتی جو اقبال کے تتبع کا لازمی نتیجہ ہونا چاہیئے۔ اسی خیال کی بنا پر میرا دعویٰ ہے کہ ہندوستان میں ایک شخص بھی اس باب میں اقبالؔ کا متبع نہیں کیونکہ اقبال کی یہ انفرادیت کہ در حقیقت اسکی فطری خصوصیت ہے جو اس کے جذبۂ مذہبی کا نتیجہ ہے جو اسکے قلب و روح میں آگ لگائے ہوئے ہے اور وہ اسکے بیان کرنے میں اپنی ترکیبات و زبان کی یک نیت و ثبات کے ساتھ اس درجہ مشاق و استاد ہو گیا ہے کہ کوئی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ چنانچہ میں ولی اور صابر کی شاعری کو اس نقطۂ نگاہ سے تو دیکھتا ہی نہیں کہ اقبال کے تتبع میں وہ کس درجہ کامیاب ہیں میں تو ان کو انکے اصلی لباس میں دیکھکر دوسروں کو ان کی خصوصیات شاعرانہ سے بخوبی متعارف کرنا چاہتا ہوں۔

حضرتِ صابر کی نظموں میں صفحہ ۳۵ پر ایک مصرع نظر آتا ہے کہ

"خودی کو ترک کر دے بے خودِ کون و مکاں ہو جا"

یہ سراسر اقبال کے تتبع کے خلاف ہے وہ خودی کا ناشر ہے بیخودی سے اسکو کیا تعلق۔ البتہ صفحہ ۳۸ پر دنیائے عمل کے عنوان سے جو نظم ہے کوئی شک نہیں کہ وہ جیّد نظم ہے اور اکثر شیریں اشعار سے مملو ہے چنانچہ یہ شعر کہ

فسانہ ہے معاملہ دوزخ و بہشت | آغاز ہے یہاں ترا انجام ہے یہاں

بہت ہی خوب کہا ہے اور مصرع اولیٰ میں لفظ "معاملہ" نے جان ڈالدی ہے۔ لیکن اس قسم کی نظموں کو نظر انداز کر دینے کے بعد دوسری نظموں میں صابر و دلی اپنی اصلی صورتوں میں نظر آتے ہیں صفحہ ۴۵ پر دل بہترین نظم ہے جس میں اسلوب۔ بیساختگی اور تاثیر پائی جاتی ہے صفحہ ۵۵ پر فلسفۂ عشق کے عنوان کے ماتحت دوسرا شعر اپنی بلندی، لذت اور گیرائی کا خود اشتہار ہے

خندۂ گل، گریۂ شبنم، فغانِ عندلیب | صفحۂ گلشن ہے سر تا سر بہ عنوانِ عشق

صابر کی کامیاب نظموں میں احساسِ گناہ "... کی رنگین یاد میں" "لالۂ صحرا" "جوئے گلستاں" "پیامِ عشق" "الماس" "جگنو اور چاند" "بچہ اور چاند" احساسِ گناہ چند اشعار پر مختصر ہے لیکن مکمل ہے اور جو جذبات کا وسیع ظاہر کرنے چاہئے تھے وہ ہو گئے ہیں "... کی رنگین یاد میں" خوب نظم ہے اس نظم میں اسلوب تغزل اور شعریت بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے خالص شاعری ہے اور اسکی بنیاد نفسی کیفیات پر ہے۔ اور اسکا پس منظر کشمیر ہے۔ کشمیر کے خالص مناظر کی منظر کشی کے تماشا صابر نے جذبات نگاری کا حق ادا کر دیا ہے۔ نشاط باغ کے متعلق ایک بند خوب ہے کہ

رخِ خمار کیفِ ہریں جانِ نشاط، جانِ آفریں، دعوتِ پیمانۂ نشاط | ذخیرۂ برہمن و کاشانۂ نشاط | جامِ کشمیر اس کی یہ پیمانۂ نشاط

اس دلکش بہار میں یاد آئے نہیں تو تڑپاتے نہیں مجھے تڑپاتے نہیں۔ اسکے بعد کا بند بھی بہت خوب ہے کہ

دلوں کی اسیر اور شکار سے بیں تیرے لیکن "رخ و داغ پر ہے مئے ناب کا اثر۔ کشمیر زادیاں ہیں کہ پریاں بغیر پر ... ...

تیسرا مصرع یقیناً خلاقی کی بہترین مثال ہے۔ لالۂ صحرا میں ایک شعر ایسا ہے کہ میں اسکو نظر انداز کر ہی نہیں سکتا

ریت کے بادل بھی کھنچے ہیں شادابِ حیات۔ ہے سرِ بستاں بھی گویا چشمۂ آبِ حیات — جوئے گلستاں میں کامیاب تصویر کشی کی گئی ہے اور یہ نظم نہایت دلچسپ ہے الماس۔ مجھے موقع ملتا تو میں اس نظم کے متعلق بہت کچھ لکھتا دراصل یہ نظم اپنی نوعیت کی ایک ہی نظم ہے مگر ترمیم و تنسیخ کی اس میں بہت گنجائش ہے یہ نظم تین ابواب میں تقسیم ہے آغازِ عشرت، دورانِ عشرت اور انجامِ عشرت اگر دور النفسی نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو واضح ہو جائیگا کہ بعض مسلمات اخلاقی ایسے ہیں جن پر روشنی نہیں ڈالی جا سکتی بحث نہیں کی جا سکتی تھی وہ اپنی جگہ آغاز و انجام کے لحاظ سے مسلمات ہی رہینگے عشرت ہو یا کبھی عشرت نہیں تا عشرت انجام کبھی گی اور غم ہی ہیں بہ ہر حال میری رائے ہے کہ اس نظم کا تیسرا حصہ یعنی انجامِ عشرت، بہار جاوداں میں شائع نہیں ہونا چاہئے تھا۔ پہلے حصہ میں ایک شباب بہشتی اور بحر کی آتش و شراب کا دریا موجیں مارتا نظر آتا ہے اور بعض جگہ نہایت لطیف محاکات نظم ہوئے ہیں مثلاً۔

جنوں انگیزیاں ہیں میری دنیائے تمنا میں | دلِ وحشی کھنچا جاتا ہے خلوت زارِ صحرا میں

زبانِ خامشی سے وسعتِ ویراں بلاتی ہے | مجھے الماس کی رنگیں جوانی یاد آتی ہے

دورانِ عشرت میں عشرت و عشق کی تیز و تند شراب اس طرح بہائی گئی ہے کہ

ہے میرے بازوؤں کی دنیا میں اسکا جسمِ پیکر | جھکے ہیں عشق کے لب حسن کے رنگین ہونٹوں پر

جوانی کے مزے میں زندگانی کھوئی جاتی ہے | مجھے الماس کیفِ حسن کے ساغر پلاتی ہے

اس حصہ کی معنویت اور لذت ایسی شئے ہے نہیں جسکی تعریف آسانی سے کر دی جائے۔ اسی حصہ کا آخری بند کہ

شرابِ حسن پینے سے فزوں تر تشنہ کامی ہے | امنگوں کی شہنشاہی ہے تاثر کی غلامی ہے

تمنا کی برآری پر تمنا بڑھتی جاتی ہے | مجھے الماس کیفِ حسن کے ساغر پلاتی ہے

تیسرا حصہ احساسِ شباب کی توہین ہے اس کا میں کوئی بند نقل نہیں کرونگا۔ گو اس میں شک نہیں کہ انسان بر انفعال کا دور بھی طاری ہوتا ہے مگر کس قدر یہ انسانیت ہے! جو زندگی کو غیر فلسفیانہ نقطۂ نگاہ سے دیکھنے کے عادی ہیں۔

صابر کی غزل

نظموں کے بعد صابر کی غزل پر بھی اس لئے اظہارِ خیال ناگزیر ہے، کہ بحیثیت غزل گو وہ ایک کامیاب شاعر ہے۔ ادا گوئی، رندیت اور اکثر جگہ شگفتگیِ معانی و الفاظ کا گہرا رنگ، صابر کی غزل میں پایا جاتا ہے۔ سادگی ملاحظہ فرمائیے

جلنے میں ہو جیسے ابتدا ہی بند ... ظلم سے باز آئیں تو باز آئیں کیا | صابر بے صبر ہے گرم فغاں | آخر اس ناداں کو ہم سمجھائیں کیا

قیامت ہیں محبت کی نمازیں۔ جبیں اٹھتی نہیں ہے آستاں سے | تمہاری خوشی کو خوشی جانتے ہیں خدا کی قسم ہم یہی جانتے ہیں

شوکتِ الفاظ و بیان ملاحظہ ہو۔

نغمہ ہائے التفاتِ خوبرویاں کیا کہوں | بربطِ دل کو ہر اک تیرِ مژہ مضراب ہے

صابرِ زنداں نشیں کی اشکباری دیکھنا | حلقۂ زنجیرِ آہن حلقۂ گرداب ہے

دام میں پھنس کے مجھے شاخِ شجر یاد آئی یا بائے کبکِ شکستِ بازو پر یاد آئی — ڈھونڈتا پھرتا ہوں تیرے در و دیوار کو میں پھر مجھے بھی گرانباری سر یاد آئی — آبلے پھوٹ کے خاروں میں پڑتے ہیں گھر ... پھر سرِ دشت تری کاکلِ تر یاد آئی

صابر آزار پنہاں صاف آنکھ سے عیاں داستانِ عشق کی منت کشِ تقریر نہیں — بہر حال مفصل اظہارِ خیال کیلئے صفحات کی کافی گنجائش اور وقت کی ضرورت ہے، صابر اور دلی پنجاب کے ان نو طبع شاعروں میں سے ہیں جو سچا ادب بہترین نمونوں کی طرح پیش کرنے کی پوری اہلیت رکھتے ہیں۔ انکی شاعری جذبات منتوّع اور اعلیٰ خیالات سے مملو ہے۔ بہارِ جاوداں ان کی پہلی تصنیف ہے اور بہت کامیاب ہے۔

میر منظور ولی اور ان کی نظم

میر منظور دلی پنجاب کے ان نوجوانوں میں سے ہیں جو نام و نمود کے جذبہ سے محفوظ گوشہ گیری کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ انکا تمام وقت ادب کے مطالعہ اور تصویر کشی میں گزرتا ہے۔ شاعری اور مصوری کے ذوق نے انکی روح کو اعلیٰ کیفیات اور دماغ کو بلند تصورات کا گہوارہ بنا دیا ہے۔ بہارِ جاوداں کے دوسرے حصہ میں چند صفحات الٹنے کے بعد ہی انکی ایک نظم دامن پکڑ لیتی ہے۔ وحشتِ تصور کے عنوان کے ماتحت فرماتے ہیں کہ

زمانہ جب اندھیری رات میں خاموش ہوتا ہے | جہاں کا ذرہ ذرہ جب فضا کی نیند سوتا ہے۔ محبت میرے خوابیدہ تخیل کو جگاتی ہے۔ خدا جانے نہیں اس وقت کس کی یاد آتی ہے تو مرے دل کو تمہاری یاد رہ رہ کر ستاتی ہے — ان کی کامیاب ترین نظموں میں وحشتِ تصور، پیغامِ عمل، پریت کا گیت، لالہ رخ کی یاد، نانک، برسات، ایک راگنی، سندھ ندی ہے۔ پیغامِ عمل میں ولی نے ہندوستانی کو مؤثر انداز میں خطاب کیا ہے اور خوب کیا ہے کہ اگر اب بھی جاگا حشر تک تارہے گا تو غلامی کی مصیبت گا ہیں و نا رہے گا تو حقیقت و مجاز کا آخری بند، ولی کے دلی خیالات کا آئینہ دار ہے کہ کعبہ میں رہے گر ادا تجھی کی نماز ہو مست جائے تاکہ کا فرو مومن کا امتیاز دیر و حرم میں بولا کریں لوگ بے تری۔ لالہ رخ ولی کی اختراع فائقہ نظم ہے اس میں جو روح ہے وہی ولی کی شاعرانہ انفرادیت ہے۔ یہ نظم اپنے اسلوب، شیرینی، جذبات اور کیفیت کے لحاظ سے اردو زبان میں ایک مخصوص رنگ اور خاص درجہ رکھتی ہے کہ دریا پر برسا اسود بہار وہ آتی تھی حسین منظر فضاؤں کو حسین جادو دکھاتی تھی — وہ تھی شہکارِ قدرت، زینتِ قدرت بہار آتی تھی زہے جیلم کہ جس میں لالہ رخ کشتی چلاتی تھی آخری بند لاجواب ہے اور تعریف و ستائش کا ہوش باقی نہیں رہنے دیتا کہ اسے قدرت کے گوناگوں مناظر یاد کرتے ہیں تو خموشی کی زباں سے نالہ و فریاد کرتے ہیں وہ اس وادی کی معشوقہ تھی معشوق آتی تھی زہے جیلم ہے جس میں لالہ رخ کشتی چلاتی تھی مجھے کہنے دیا جائے کہ ولی اس بلند شاعری کیلئے پیدا ہوئے ہیں۔ اقبال کے تتبع سے نہیں نہیں تیسرا مصرع کس قدر بیتاب اور کسقدر رنگین ہے گا تا ہوا اور جھومتا ہوا لب بھی سیری نہیں ہوتی۔ نانک بھی مطالب کے لحاظ سے بلند و بہتر نظم ہے برسات بھی اپنی جگہ خوب ہے، ترنم اور بارش کی کیفیت یہ نظم بھی خالی نہیں۔ سندھ ندی کا آخری شعر نظم کو بہت بلند کر دیتا ہے اور ایک وجد پیدا ہو جاتا ہے کہ اس سکوں دشمن مسافر کا وطن کوئی نہیں تو ڈھونڈتی ہے جانے کا گھر چھوڑ کر کسقدر یہ دخترِ کہسار کی مستانہ چال ناشناسا غلامی ہے یہ آزاد چال۔ اکثر جگہ نظموں کے قلب میں ایسے نادر ترین اشعار گم گشتہ موتیوں کی طرح مل جاتے ہیں کہ

تیرتی پھرتی ہے ہر سو کیا ہوا میں خامشی | آسمانوں میں زمینوں میں فضا میں خامشی

ولی کی غزل

جو لوگ روح و دل کے ساتھ جاوداں طور پر سلگ نہیں سکتے ان سے کہہ دو کہ شاعری کو بھی ترک کر دیں اور خصوصاً غزل گوئی کی طرف سے قطعی مایوس ہو جائیں۔ غزل کے باب میں سب سے اول ولی دعا کرتا ہے کہ وہ سوز عطا کر کہ جہاں بھر کو جلا دوں۔ وہ درد عطا کر جو زمانے کو رلا دے۔ میری رائے ہے کہ صابر سے ولی کی شراب بہت تیز ہے چنانچہ وہ کہتا ہے کہ

اے ولی دیکھ کسی مست کے دامن کو نہ چھیڑ تو بے خبر اپنا گریباں تجھے کیا یاد نہیں! ترے مٹنے میں اے دل زندگی کا راز پنہاں ہے ہر اس ہستی آغازِ وقتِ امتحاں تک ہے یہ تم نے احساسِ عشق کا کر دیا دل دھڑک جائیگا جو لوگا۔ بہت ہی مست شعر ہے، مست مضمون بلند خیالی کی ایک مثال دیکھئے — یہ پایا مجھکو طوفانِ حوادث کے تھپیڑوں نے خدا محفوظ رکھے ہر بلا سے موجِ طوفاں کو — الفاظ و بیان، جذبات و کیفیت بڑی کو کتنی قدرت ہے ملاحظہ کیجئے کہ ہماری بزم میں رنگ سبو جام لیجئے زمیں یہ چاند ستارے بھی جگمگا گئے — اف! رے کرشمے ترے خیالِ جمالِ دوست ہر شے نے ان کا روپ بدل کر دکھا دیا۔ تیغِ قضا کے واسطے حاضر ہے یہ گلا تو لیکن انہیں گلے سے لگایا نہیں ابھی۔ جو رمز آشنا ہیں وہی جانتے ہیں تو کہ آنکھوں ہی آنکھوں میں کیا ہو رہا ہے — یہ اور اسی قسم کے بے تعداد اشعار ولی کے حصۂ غزل میں پائے جاتے ہیں، جی چاہتا ہے کہ ناظرین کی ضیافتِ طبع کے لئے سب نقل کر دوں لیکن اس سے!

تمہیں کہو!

۱

فلک پہ بادلوں کا اک ہجوم بے شمار ہے
چمن چمن میں جلوہ گر عروسِ نو بہار ہے
تجلیوں کی بارگاہ صحنِ لالہ زار ہے
ترنمہائے نغمہ میں میری آنکھ اشکبار ہے
تمہیں کہو کہ میرے دل کو کس طرح قرار ہو

۲

سجی ہوئی ہیں چار سمت محفلیں شباب کی
رواں ہیں موجہائے کیف آفریں شراب کی
عنایتیں ہیں ضو فشاں شعاعِ ماہتاب کی
نگاہِ آشنا سے چھیڑ ہے ترنمِ رباب کی
تمہیں کہو کہ میرے دل کو کس طرح قرار ہو

۳

جہاں کے میکدے کا ساقی حسیں ہے آسماں
برس رہی ہیں پیاری پیاری ننھی ننھی مینہ کی بوندیاں
ہوئے ہیں فیضیاب سب ہی جاندار بے زباں
میں تشنگیٔ شوق سے ہوں تشنہ کام و نیم جاں
تمہیں کہو کہ میرے دل کو کس طرح قرار ہو؟

۴

زباں پہ ہے بلبلوں کی داستانِ عاشقی
ہے داستاں یہ عاشقوں کی داستانِ عاشقی
نشاط ہے تجلیوں کی داستانِ عاشقی
شراب ہے تشنہ ساقیوں کی داستانِ عاشقی
تمہیں کہو کہ میرے دل کو کس طرح قرار ہو؟

۵

وفائے عشق اور حسن کی جفا بھی یاد ہے؟
سنا تھا جس نے بے قرار وہ ادا بھی یاد ہے؟
نظر سے جو خطا ہوئی تھی وہ خطا بھی یاد ہے؟
تمہارا مسکرا کے مجھ کو دیکھنا بھی یاد ہے؟
تمہیں کہو کہ میرے دل کو کس طرح قرار ہو؟

۶

نظر فروز و جاں فزا سماں ہے کوہسار کا
فضا میں گونجتا ہے نغمہ نغمہ جوئبار کا
بڑھا ہوا ہے حوصلہ ہر ایک نوکِ خار کا
ہیں آبلہ پا جنگلوں کا [illegible] نہ لالہ زار کا
تمہیں کہو کہ میرے دل کو کس طرح قرار ہو؟

۷

تمہاری آنکھ میں وہی شرابِ لالہ فام ہے
وہی ہے قدِ ناز میں، وہی حسیں خرام ہے
تمہارا ایک ایک لفظ حاصلِ کلام ہے
مری شاعئ شوق حرفِ آہ نا تمام ہے
تمہیں کہو کہ میرے دل کو کس طرح قرار ہو!

۸

اسیرِ عشق جاں نثار و دل فروش ہے وہی
جہانِ رنگ و بو میں بے نیازِ ہوش ہے وہی
سکوں سے نا امید اور حشر کوش ہے وہی
تصوراتِ چمن میں جنوں بدوش ہے وہی
تمہیں کہو کہ میرے دل کو کس طرح قرار ہو؟

۹

تمہاری یادِ جاں نواز آ رہی ہے رات دن
جنونِ آرزو مرا بڑھا رہی ہے رات دن
مناظرِ جنوں مجھے دکھا رہی ہے رات دن
دکھا کے منظرِ غم مجھے ستا رہی ہے رات دن
تمہیں کہو کہ میرے دل کو کس طرح قرار ہو؟

۱۰

نہ تم، نہ کوئی نامہ و پیام اور سلام ہے
نہ میرے عشق کا تمہارے دل میں احترام ہے
تمہاری بزمِ ناز میں جفا و فا کا نام ہے
وفا پرست ہوں مجھے فقط وفا سے کام ہے
تمہیں کہو کہ میرے دل کو کس طرح قرار ہو؟

(ضیا فتح آبادی ایم۔اے)

مضمون بقیہ صفحہ ۱۶۴

معلوم ہوتے ہیں مگر یہ تو وہ بھی دیکھتے ہوں گے کہ موجودہ ہندوستان "مہاتما گاندھی ایسی عظیم اور دیوتا صفت ہستی سے بھی گھبرا گیا ہے اور آج وہ جواہر لال کی مکمل رہنمائی چاہتا ہے۔ سامنے کی باتیں تو ایک صحافی کو ضرور معلوم ہونی چاہئیں۔ منظم انقلاب کیلئے بھی انقلابی شعر بے حد ضروری ہے۔ کیا اقبال کے یہاں کسی قسم کا انقلابی پیام ہے؟ کم از کم مجھے تو نہیں ملا۔ یقینی اقبال جاوید نامہ کے بعد ہندوستان کیلئے "مرحوم" ہوگیا۔ دیکھو نادانی اقبال جسکے بانگ درا نے بچہ بچہ کو گرما دیا تھا آج جب "بال جبریل" پیش کرتا ہے تو قوم اُسے دشمنوں کے وطن کی چیز سمجھکر نہیں قبول کرتی۔ تمنے "بال جبریل" تو ضرور دیکھا ہوگا۔ غالباً حضرت اقبال نے تمہارے پاس بھیجا بھی ہو۔ سمت اندازہ کر لینا چاہئے کہ قوم کیا چاہتی ہے۔ اسمیں اپنی خوشامد نہ سمجھنا میں تمہاری خوشامد کیوں کروں؟ دل کی بات کہتا ہوں کہ اس وقت تم اور نذر الاسلام نوجوان ہندوستان کے ہیرو شاعر سمجھے جاتے ہو۔ میں نے اکثر وہ مناظر دیکھے ہیں جب مدارس کی انجمنوں کے جلسوں میں کسی طالب علم نے تمہارا ترانہ آزادی یا معاہدہ پڑھنا چاہا۔ اُسے روکا گیا۔ اس وقت بغاوت پھیل گئی اور ہڑتال ہو گئی۔ بنگال میں نذر اسلام کی مقبولیت کا بھی یہی حال ہے مسٹر زیڈ اسلام ناحق چڑھتے ہیں۔ جب بنگالی ہندوستان میں ٹیگور کے کلام میں "خشکی" محسوس کی جاتی ہے اور نذر الاسلام زندہ باد کے نعرے بلند ہوتے ہیں تو کیوں نہیں اردو ہندوستان میں ساغر نظامی کے جیکارے لگیں۔ کیا مسٹر زیڈ اسلام کو نہیں معلوم کہ موجودہ زمانہ کی باگ سیاست نوجوانوں کے ہاتھوں میں ہے، آخر کب تک نوجوان اپنے فطری ولولوں کو دبانے پر مجبور ہوں گے؟ اقبال کی یہی تو غلطی تھی کہ مسٹر زیڈ اسلام ایسے عقیدتمندوں نے انہیں مفکر سیاسی بنا لیا۔ اسی وقت سے اقبال کا زوال بھی شروع ہوا ہے۔ حقیقی شاعر سیاسیات حاضرہ سے متاثر ضرور ہوتا ہے لیکن سیاسیات کی "آتش سیال" میں وہ کبھی کود نہیں پڑتا۔ اقبال سے یہی لغزش ہوئی کہ وہ گلہ بان بکر بانس کی ایک لاٹھی لے کر قوم کے گلہ کے پیچھے ہو لیا۔ ونیاپو بھی تو انقلابی شاعر تھا۔ آج مسولینی کا وجود ونیاپو ہی کا مرہون منت ہے۔ ونیاپو نے بھی سیاسی افکار پیش کئے لیکن بانس کی لاٹھی لیکر نہیں بلکہ اولمپس کی چوٹیوں پر کھڑے ہو کر بانسری کے نغمات کے ساتھ۔ مجھے بڑی خوشی ہے کہ تم قوم کی نبض پہچان گئے ہو اور اپنے نغموں کے سحر سے ہی اسے ہموار بنانا چاہتے ہو۔ اقبال کی طرح تم کبھی یہ غلطی نہ کرنا کہ خود کو مولانا آزاد یا مہاتما گاندھی سمجھنے لگو۔ اب مسٹر اسلام کا یہ لکھنا کہ تم اقبال کے مقابلہ میں "مفکر سیاسی" نہیں ہو ــــــ صحیح نہیں اور اس لئے کیونکہ انکی سیاسیات خود ایسٹرن ٹائمز اور انڈو انڈین اسٹیٹس وغیرہ نیم سرکاری اخبارات تک محدود ہے۔ بادہ کی اشاعت کے بعد مجھے یقین ہے کہ یہ غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی۔ اور ہندوستانی وہ غلطی نہ کریں گے جو انگریزوں نے نصف صدی پیشتر کی تھی۔ کیٹس مرحوم کی جوان مرگی کے ذمہ دار اس وقت کے بڈھے ناقد ہی تھے۔

۲۵۷

زیڈ اسلام کا یہ کہنا تو درست ہے کہ "پیام مشرق" مشہور معروف تصنیف ہے مگر یہ بعید خیز بات ہے کہ تمہیں اپنے مجموعۂ کلام کا نام "بادۂ مشرق" صرف اسی لئے نہ رکھنا چاہئے۔ پیام مشرق یقینی اقبال کی نہایت کامیاب تصنیف ہے مگر اس میں کلام نہیں کہ "بادۂ مشرق" مشرق کے ہاتھوں میں وہ جام ہے جس میں ہندوستان کے ایک نوجوان شاعر کا "خون دل" ہے۔ بادۂ مشرق نام بہت خوب ہے اور یہاں بہت پسند کیا گیا۔ مجھے یقین ہے کہ تمہارا مجموعہ ہاتھوں ہاتھ جائیگا اور خود اقبال بھی وجد لائینگے۔ اقبال خلیق اور منصف مزاج ہیں۔

ایک جگہ مسٹر اسلام تحریر فرماتے ہیں کہ تمہارے جذبات اقبال کے کلام سے مستعار ہیں۔ یہ تو ایسی ہی بات ہے جو کہ لینن اور مارکس کے متعلق یہ کہا جائے کہ ان کی تحریکات مستعار ہیں حضرت عیسیٰ اور محمدؐ کی تحریکات سے۔ یقینی تمہارا اسلوب بیان نیا ہے اور میں تمہیں اس کے لئے مبارکباد دیتا ہوں۔

اب کچھ رسالہ کے متعلق ــــ مسٹر اسلام تمہیں مشورہ دیتے ہیں کہ تم اپنے رسالہ کو خالص ادبی بناؤ۔ مجھے اس سے اختلاف ہے۔ تمہاری روش نئی ہے۔ مگر مقبول ہونے والی اور قوم کے لئے مفید۔ خالص ادبی پرچے بہت ہیں مگر "ایشیا" امریکہ "بیسویں صدی" "اٹلانٹک" وغیرہ رسائل مغربی کے مقابلہ میں ہندوستان سے تمہارا ہی رسالہ پیش کیا جا سکتا ہے۔

میرے والد محترم ڈاکٹر جعفری کے مضمون کے متعلق بھی انہیں صحیح معلومات حاصل نہیں ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ وہ مضمون انھوں نے تمہیں میرے سامنے دیا تھا۔ اور یقینی وہ فارسی رسم الخط میں خاص تمہارے لئے لکھا گیا تھا۔ ایسٹرن ٹائمز میں انگریزی میں شائع ہوا۔ لیکن اس سے پہلے "ماڈرن اسٹوڈنٹ" "ہند و معارس" وغیرہ نہایت معتبر انگریزی پرچوں میں بھی شائع ہو چکا تھا۔ ترجمہ بھی "خاص" ہو سکتا ہے اور جب مصنف خود ترجمہ کرے تو ترجمہ کا اشارہ ضروری نہیں۔

جوش کے قطعات میں نے بھی دیکھے ہیں اور میں ان کی بلند آہنگی کا قائل ہوں لیکن تمہارے "میخانۂ اقوام" میں تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مدبرین برطانیہ جیسی ڈپلومیسی ہے اور پلاٹ اور انداز بیان میں بھی یکسانیت نہیں ہے۔ مسٹر اسلام انہیں معمولی سے خطاب کرتے ہیں۔ آج مجھے دو سال کے بعد پہلی بار ہنسی آئی ہے۔ مسٹر اسلام نے سر دیتی دیوی والے مضمون کو سراہا ہے لیکن ساتھ ہی شکایت کی ہے کہ ترجمہ میں شعراء کے نام مذکور نہیں ہیں۔ میرے پاس جو پرچہ تم نے بھیجا اس میں تو تھے!

روح کا سوال اگر مشاعروں وغیرہ میں تم نے پڑھا بھی تو کیا ہرج ہو گیا۔ وہ تو تمہاری اپنی تصنیف ہے۔ بے شک تم اپنی تمام چیزیں اسی طرح شائع کرتے رہو ــــــ

پرخلوص امیدوں کے ساتھ تمہارا

فرید

سوتیا داہ

(ایک شاہکار اخلاقی ڈرامہ)

ڈرامہ نگار

سید طالب علی ایم۔اے الہ آبادی

مغرب زدہ ہندوستانی سماج کا آئینہ

جس میں ہندوستان کی موجودہ "ترقی یافتہ" سماج کے ماحول کو نہایت خوبی اور کمال کے ساتھ دکھایا گیا ہے اس کے ساتھ ہی جذبات کی اس کشمکش کو نہایت کامیابی کے ساتھ نازک اور سلیس الفاظ میں بیان کیا گیا ہے جس کا بیان کرنا اکثر ممکن نہیں ہوتا واقعات کی پیچ در پیچ کڑیاں بیحد دلچسپی پیدا کرتی ہیں اور ہندوستانی سوسائٹی کی زندگی کی تصویر آنکھوں میں پھر کر رہ جاتی ہے۔ سب سے بڑی خصوصیت اس ڈرامہ کا ایک حد تک قیاسی اور فطری ہونا ہے۔

افراد

فینا

کسم

موہن

گجراج

سوہن

محل وقوع

"بمبئی"

رام نگر

سوتیا ڈاہ

(ایک شاہکار اخلاقی ڈرامہ)

اثرِ خامہ: سیّد طالب علی طالبؔ ایم۔ اے۔ الہ آبادی

سیّد طالب علی صاحب ایم۔ اے الہ آبادی مجھے اور میں اُن کو اُس وقت سے جانتے ہیں جب ہم دونوں کو عرفان و شعور کی غیر معصوم ادعائی زندگی نے تباہ نہیں کیا تھا اُس وقت سے تا این دم ذہنی و علمی ترقی کے بلند و اعلیٰ مدارج طے کرنا اُن کے علمی شغف اور ذہانت کی دلیل ہے اور اُن کے دوستوں کے لئے فخر و مسرّت کا باعث ہے میں نے بہت دن کے بعد ان کا ڈراما سوتیا ڈاہ دیکھا جو ایک بسیط و مکمّل ڈرامہ ہے اور جس کی دلچسپی کا اندازہ اس حقیقت سے کیا جا سکتا ہے کہ میں نے اس کو اس وقت تک چھوڑا نہیں جب تک کہ کُل نہیں پڑھ لیا۔

ہر چند کہ فن کے لحاظ سے اِس میں تکمیل کی بہت گنجائش ہے تاہم یہ اپنے کلچر کی، وحدانیت، زبان کی سلاست اور جذباتی کشاکش کے لحاظ سے بہت بلند ہے۔ آخری مناظر پر رائے زنی ممکن ہے لیکن گجراج کا جو سنجیدہ اور منضبط کیرکٹر طالبؔ نے شروع سے دکھایا ہے وہ ہونے والے اعتراض کو اُٹھا دیتا ہے اور پورے ڈرامے میں توازن قائم کر دیتا ہے۔ اس ڈرامے کی سب سے بڑی خصوصیت اس کا غیر فطری ادبیت سے معرّیٰ ہونا ہے جب یہ حقیقت ہے کہ ہم بات کرتے وقت صحیح زبان بولنے پر قادر نہیں ہوتے اور ہو نہیں ہو سکتے تو ڈرامہ میں زمین و آسمان کے قلابے ملانا کیا معنی رکھتا ہے۔ خطابت کا صحیح استعمال یہ نہیں ہے کہ آغا حشر کی طرح غیر فطری تقریریں کیرکٹرز سے کرائی جائیں بلکہ یہ ہے کہ ایک لفظ ایک صفحہ کی نمائندگی کرے۔ سوتیا ڈاہ میں جا بجا ایسے مقامات آتے ہیں اور کوئی شک نہیں کہ ہندوستانی ڈرامہ نگاری کی دُنیا میں یہ ایک صحیح قدم ہے جہاں تک آغا حشر مرحوم کا تعلق ہے انہوں نے ڈرامہ کو بہت بڑی حد تک بدلا، لیکن فطرت نگاری صرف ان کے آخری چند ڈراموں میں پائی جاتی ہے اور ایک خرابی یہ ہے کہ شاعری اور خصوصاً استعاراتی رنگ بہت گہرا ہو گیا ہے اتنا گہرا کہ اُس رنگ کی بہار مٹ گئی ہے۔

شاعر کی روزانہ زندگی میں بھی اتنی شاعری نہیں ہوتی جس قدر اُردو ڈرامہ نگار اپنے ڈراموں میں شروع سے آخر تک دکھاتے ہیں واقعات کے صدور کا تنوع اور اس تنوع کے اظہار کے سلسلہ میں الفاظ کا بے ساختہ استعمال ڈرامہ نگار کا کمال ہے نہ کہ نقّالی اور یہ کمال نبّاضِ فطرت ہوئے بغیر حاصل ہونا ممکن نہیں اس سلسلے میں طالبؔ صاحب کو مبارکباد دینا گویا یہ کہنا ہے کہ ہمیں اُن سے اس شاہکار کی توقع نہ تھی ؎

شک نہ کر میری خشک آنکھوں پر
یوں بھی آنسو بہائے جاتے ہیں

ساغرؔ نظامی

سوتیاڈاہ

(ایک شاہکار اخلاقی ڈرامہ)

آئینہ خانہ

(فینا بن سج رہی ہے۔ آئینہ سامنے ہے کنگھا ہاتھ میں ہے کسم ایک سادی سی ساری اور جمپر پہنے ہوئے آتی ہے)

فینا۔ (کسم کا عکس آئینے میں دیکھ کر مسکراتی ہے) کسم آج میں تمہارے ساتھ نہ چل سکوں گی۔)

کسم۔ میرے ساتھ نہ چل سکو گی؟ کیوں، کیا بات ہے، آج تو تاج میں جاز ——

فینا۔ مجھے یاد ہے (ہنسکر) بتاہی دوں، موہن سے ملنے جارہی ہوں

کسم۔ (چہرے پر زردی سی چھاگئی) تم نے تو کہا تھا کہ بس اب ختم ہے

فینا۔ ہاں ہاں۔ میں نے سچ کہا تھا۔ مگر مجبوری ہے (ٹہل ٹہل کر) بے ان کے میں نہیں رہ سکتی، خدا جانے پرسوں سے کیسے جی رہی ہوں، ذرا سوچو تو پورے تین دن ہو چکے آنکھیں ترس رہی ہیں، سنا ہے کہ کل شام کو تاج ہوٹل میں بھئے اور آدھی رات تک میرین کے ساتھ ناچتے رہے۔ بس میں ہو چکی، رات بھر جاگتی رہی۔

(ہاتھوں سے منھ ڈھانپ کر) کاش میں مرگئی ہوتی

کسم۔ (بے رخی سے) اگر گجراج صاحب کو خبر ہو گئی تو؟

فینا۔ (نگاہیں چار کرکے) ہو نہیں سکتی۔ کیسے ہو گی۔ وہ کل صبح آئیں گے، تمہارے سوا اور کوئی جانتا بھی نہیں۔ میں تڑپ رہی ہوں موہن کے لئے بیتاب ہوں، تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہی نہیں تم کیا جانو (دل پر ہاتھ رکھکر) یہ تو چین لینے ہی نہیں دیتا۔

(کسم منھ پھیر کر ذرا سا مسکرا دیتی ہے۔ کیا اس نے کبھی کسی سے محبت نہیں کی! مگر زبان سے کچھ نہیں کہتی۔)

فینا۔ میں وعدہ کرتی ہوں ابھی ابھی آجاؤں گی۔ سیدیا جارہی ہوں، وہاں بالکل سناٹا رہتا ہے اسوقت کوئی نہیں ہوتا۔ کسم تم نہیں جانتیں کہ میں کتنا چاہتی ہوں، میں اس کے پسینے پر اپنا لہو بہانے کو تیار ہوں۔

کسم۔ اگر صاحب کو خبر ہو گئی تو جانتی ہو کیا ہو گا، پتی بھی ہاتھ سے جاتا رہے گا اور ساری عشرت خاک میں مل جائے گی۔

فینا۔ (بوٹ سے گرد جھاڑ کر) مجھے اتنی بھی پرواہ نہیں

کسم۔ (ایک قدم پیچھے ہٹ کر) میں تمہاری جگہ ہوتی تو موہن کے ساتھ کھلے بندوں گھومتی یہ نہیں کہ سب کو دھوکے میں رکھوں۔

فینا۔ تم ایسا کرتیں؟ ضرور کرتیں مگر نہ میں تمہاری طرح مضبوط ہوں نہ بہادر میں تو ڈرتی ہوں۔

کسم۔ ڈر۔ کس بات کا ڈر۔ تم ان کو چاہتی ہو وہ تم کو!!

فینا۔ نان سینس۔ غربت اور محبت ساتھ ساتھ نہیں رہ سکتیں۔ موہن کے پاس ایک جھنجھی کوڑی بھی نہیں۔ اگر میں قیمتی کپڑوں سے بنی سجی نہ رہوں تو ان کو نفرت سی ہو جائے گی اور وہ بھی اپنے آرام کی چیزیں محبت کی قربانگاہ پر آسانی سے نہیں چڑھا سکتے۔ ہم دونوں مجبور ہیں۔

کسم۔ اگر موہن اسی میں خوش ہیں کہ صاحب کی آڑ میں تم سے محبت کی پینگیں بڑھائیں تو وہ الفت کیسی نفرت کے قابل ہے۔

فینا۔ (گبھرا کر) خبردار ان کے خلاف ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکلے۔ میں نہیں سن سکتی۔ وہ اس بھری پوری دنیا میں سب سے اچھے ہیں (نرم ہو کر) پیاری

کسم۔ معاف کر دو، بے اختیار ہوں، دکھی ہوں۔

بک رہی ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ   کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

کسم (مسکرانے کی کوشش کرتی ہے) تم ٹھیک کہتی ہو۔ مجھے اپنی نہیں تمہاری فکر ہے۔ تم ہی سمجھتی ہو کہ یہ طرح محفوظ ہو۔ اب تک یہ معاملہ کئی دفعہ کھل چکا ہوتا مگر خیریت ہو گئی۔ ایک دن صاحب کو یہ راز معلوم ہو کر رہے گا، اسوقت تململا

سے چھوٹا ہوا تیر واپس آئے گا نہ افسوس سے کوئی نتیجہ نکلے گا، تمہیں بتاؤ، میں کب تک تمہیں بچا سکتی ہوں۔

فینا۔ (ہاتھ ملتی ہوئی) بس آج کے بعد پھر تمہیں کوئی شکایت نہ ہوگی۔ میں اپنی عزت کی قسم کھاتی ہوں کہ یہ آخری بالکل آخری موقع ہے۔ میں موہن سے صاف صاف کہدوں گی، میں عہد کرتی ہوں ان سے کہدوں گی کہ اب ہم چوری چھپے کبھی۔ کبھی نہ ملیں گے ——

کسم۔ یہ تو پہلے بھی کہہ چکی ہو۔

فینا۔ مجھے یاد ہے (گلے میں باہیں ڈال کر) مگر ابکی میں نے ٹھ کرلیا ہے، تم جانتی ہو کہ میں کیسی مضبوط دل کی ہوں۔ بس ایک دفعہ کی اجازت اور دیدو۔ اچھا میرا بوسہ لے لو اور کہدو کہ تم خفا نہیں ہو

کسم۔ بھلا میں تم سے خفا ہو سکتی ہوں۔ اور پھر خفگی سے فائدہ۔

فینا۔ کسم تم عورت نہیں حور ہو۔ میں تم کو دنیا میں سب سے زیادہ چاہتی ہوں صرف موہن سے کم آؤ تھوڑی دور میرے ساتھ چلو۔

(فینا ہاتھ میں ہاتھ دیئے سیٹی بجاتی ہوئی اور کسم ساتھ ساتھ پائیں باغ سے ہوتی ہوئی سڑک تک آئیں۔ فینا خوشی سے دیوانی ہو رہی تھی)

کسم۔ فینا نہ جاؤ۔ یا پھر مجھے بھی ساتھ لیتی چلو۔

فینا۔ وہ لو وہ دن گیسے۔ بس آج ہی سے خاتمہ ہے۔ چلی جاتی ہے۔

(موہن نہایت چھبیلا جوان ہے۔ اپنی موٹر لئے ہوئے انتظار میں کھڑا ہے۔)

موہن۔ میں تو سمجھا تھا کہ تم بھول گئیں۔

فینا۔ گاڈ۔ میں اور تمہیں بھول سکتی ہوں، اگر بھول اپنی خوشبو کو، تار اپنی صدا کو، شباب اپنے جوش کو اور شراب اپنے مزے کو بھول جائے تو میں بھی تمہیں بھول سکتی ہوں۔

موہن۔ اچھا چلو، اس تالاب کے کنارے کسی سنسان گوشے میں چل کر بیٹھیں۔

(دونوں موٹر پر بیٹھ جاتے ہیں)

فینا۔ کاش دو برس پہلے تم سے ملاقات ہوئی ہوتی

موہن۔ کیا تم صاحب سے خوش نہیں ہو؟

فینا۔ وہ مجھ سے دس برس بڑے ہیں اور بہت سی باتوں میں اب بھی پرانی لکیر کے فقیر ہیں، ہماری شادی ایک زبردست غلطی تھی جس کا خمیازہ اب بھگت رہی ہوں۔

موہن۔ وہ ہیں کہاں؟

فینا۔ کسی کام سے بمبئی گئے ہیں۔ کل صبح آئینگے۔ اور میری موت کا پیام لائینگے۔

موہن۔ کاش میں اتنا مقروض نہ ہوتا۔ اگر میں تمہاری عیش و عشرت کا کچھ بھی سامان کر سکتا تو کہدیتا کہ میرے ساتھ نکل چلو۔

فینا۔ مگر تم تو کہتے تھے کہ دنیا میں سب سے زیادہ مجھی کو چاہتے ہو؟

(موٹر تالاب کے پاس پہونچ چکا تھا)

موہن۔ اور حقیقت بھی یہی ہے۔

فینا۔ (ایک ہاتھ تکیے پر رکھکر قریب ہو جاتی ہے) ثبوت؟

موہن۔ (ایک ہاتھ سے لپٹا کر بوسہ لیتا ہے) یہ ہے ثبوت!

(اسٹیرنگ بگڑتا ہے گاڑی ادھر ادھر جھٹکے کھاتی ہے مگر سنبھل جاتی ہے۔)

فینا۔ یہ تو بہت کمزور سا ثبوت تھا۔

موہن۔ اچھا تو یہ لو۔ (بھینچ کر بوسے لیتا ہے)

(گاڑی قابو سے باہر ہو کر باندھ سے ٹکراتی ہے اور الٹ پلٹ جاتی ہے فینا اچھل کر ایک طرف گھاس میں گرتی ہے مگر موہن موٹر کے نیچے دبکر بیہوش ہو جاتا ہے)

کسم کا کمرہ

(کسم برداشتہ خاطر ہو کر اپنے کمرے میں واپس آتی ہے کہ میز پر ایک تار ملتا ہے۔)

"شام کا کھانا وہیں کھاؤں گا —— گجراج"

کسم کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی (آپ ہی آپ) وہ آگئے اور فینا نہ آئی تو آفت ہی ہو جائے گی کوئی حیلہ نہ چلے گا۔

(گھنٹی بجا کر خادمہ کو بلاتی ہے)

ابھی تار دیا ہے۔ صاحب شام کا کھانا یہیں کھائیں گے۔ میں ڈاکخانہ تک جاتی ہوں، ٹکٹ لینے ہیں اگر مسیم صاحب آجائیں تو کہدینا کہ مجھ سے مل لیں۔

کمسن خادمہ۔ (مسکرا کر) آپ کیوں تکلیف اٹھاتی ہیں۔ ٹکٹ تو میرے ہی پاس بہت رکھے ہوئے ہیں۔

کسم۔ (چونک کر) مگر مجھے ٹہلنا بھی تو ہے

شارع عام برطرف شہر

شفق کی رنگینیاں۔ دھندلکا، ہلکی چاندنی، کھیتوں کی بہار، صاف سڑک۔ کسم نے گھڑی دیکھی، سات سے اوپر ہو چکے تھے اتنے میں کوئی عورت سامنے سے بے تحاشہ بھاگتی ہوئی دکھائی دی اور قریب آکر ٹھٹک گئی۔

فینا۔ ایک حادثہ ہو گیا۔ بریک نہیں لگا۔ موٹر الٹ گئی۔ میں بچ گئی۔ بال بال بچ گئی (ہچکیاں لیکر) میں ٹھہر نہیں سکی۔ ڈر گئی۔

کسم۔ ٹھہرنے سے ڈر گئیں (لہجہ میں طنز تھا)

فینا۔ میں ڈر گئی کہ کوئی دیکھ نہ لے تمہیں نے تو کہا تھا کہ صاحب کو خبر نہ ہونے پائے۔ خاموش سی ہو گئی۔

کسم۔ صاحب کا تار آیا ہے وہ آیا ہی چاہتے ہیں۔

فینا۔ مجھے معلوم ہے

کسم۔ تمہیں معلوم ہے؟ کیسے؟

فینا۔ صبح کو خط آگیا تھا۔ مگر میں نے نہیں بتایا کہ تم روک لوگی۔ میں لوٹنے ہی والی تھی کہ یہ حادثہ ہو گیا اور میں ڈر گئی۔

کسم۔ کیا وہ زخمی ہو گئے۔؟

فینا۔ مجھے معلوم نہیں۔ میں اپنے حواس میں نہ تھی۔ موٹر الٹ گئی۔ میں نے موہن کو کھینچ کر نکالنا چاہا مگر بوجھ بہت تھا۔

کسم۔ اور تم (چہرہ سرخ ہو گیا) ان کو یونہی چھوڑ کر چلی آئیں۔ کیا انوکھا پریم ہے

فینا۔ میں کر ہی کیا سکتی تھی۔ تم نے خود ہی کہا تھا کہ صاحب کو معلوم نہ ہو۔ اگر میں رُک جاتی تو ان کو خبر ہو جاتی۔ چلو کسی کو وہاں بھیجدیں۔

کسم۔ یہ حادثہ کس جگہ ہوا۔ وہ کہاں ہیں؟

فینا۔ تالاب کے قریب ــــ ان جھاڑیوں کے پیچھے ــــ

کسم۔ وہ تو بہت سناٹے کی جگہ ہے۔ ممکن ہے گھنٹوں اس طرف سے کوئی نہ گزرے

فینا۔ (ہاتھ مل کر) گاڈ میں کیا کروں!؟

کسم۔ میں جاتی ہوں۔ تم جاؤ، اپنے آپ کو سنبھالو، چور دروازے سے جانا۔

فینا آنند کٹی کی طرف جاتی ہے اور کسم جھاڑیوں سے ہوتی ہوئی تالاب کیطرف جاتی ہے اندھیرا سا ہے آواز دیتی ہے۔ موہن صاحب

موہن صاحب۔ موٹر ایک طرف الٹ گئی تھی اور موہن نیچے دبے پڑے تھے

کسم۔ موہن صاحب

موہن۔ (آنکھیں کھول کر) کسم بائی۔ آپ یہاں تک کیسے پہونچ گئیں؟

کسم۔ فینا نے پتہ بتا دیا تھا

موہن۔ فینا۔ وہ ڈر گئیں۔ صاحب بڑے ظالم ہیں۔

کسم۔ اگر میں موٹر کو ذرا اٹھاؤں تو آپ نکل آئیں گے۔ سارا بوجھ آپ کے داہنے ہاتھ پر ہے

موہن۔ (دہشت زدہ تبسم کے ساتھ) بڑی ٹیس ہو رہی ہے۔ مگر فینا تو اچھی ہیں۔ کہیں چوٹ تو نہیں آئی؟

کسم۔ وہ اچھی ہیں کہیں چوٹ نہیں آئی۔

موہن۔ میں خوش ہوں۔ بڑی خیریت ہوئی۔ اگر آپ اک ذرا سی مدد کیجئے تو۔

(کسم نے پورا زور لگایا پسینے میں ڈوب گئی مگر موٹر ٹس سے مس نہ ہوئی)

موہن۔ دیکھئے بائیں طرف والے جیک کو ذرا سا دبا دیجئے تو کام چل جائیگا۔

(کسم نے جیک دبایا تو برائے نام موٹر کا بوجھ کم ہوا موہن نے درد کو ضبط کرنے کے لئے اس زور سے ہونٹ کاٹے کہ خون نکل آیا۔ اف میں ذرا بھی نہیں ہل سکتا۔)

کسم نے بغلوں میں ہاتھ دے کر کھینچا

موہن۔ پوری طاقت سے کھینچئے اگر چیخ پڑوں تو خیال نہ کیجئے گا۔

کسم۔ میں کھینچتی ہوں کوئی تکلیف پہونچے تو معاف کیجئے گا۔

(کسم نے موہن کو باہر کھینچ لیا ــــ کامل خاموشی ہو گئی)

موہن۔ بس یہ ہاتھ جھول گیا ہے اور کچھ نہیں ذرا سا سہارا دیجئے تو میں اُٹھ کھڑا ہوں ــ

کسم۔ میرے کھینچنے سے تکلیف تو نہیں ہوئی

موہن۔ خطا تو میری ہی تھی۔ ہاں ہاتھ تو دیکھئے۔ میں ذرا ڈرتی ہوں مگر ــــ

کسم نے سہارا دیا۔ موہن بڑی مشکل سے اٹھا تو مگر تیورا کر گر گیا

موہن۔ یہ ہاتھ غالباً ٹوٹ گیا ہے۔ بھگوان کا شکر ہے۔ بلا ٹل گئی۔ ممکن تھا کہ ہم دونوں زخمی ہو گئے ہوتے۔

کسم۔ موہن صاحب۔ مجھے مدد دلانے کے لئے یہاں سے جانا پڑے گا۔ ممکن ہے سڑک پر کوئی آنے جانے والا مل جائے

(موہن بول نہ سکے صرف سر ہلا دیا)

کسم کچھ دور گئی تھی کہ موہن نے کمزور آواز سے پکارا ــ کسم بائی

کسم نے واپس آ کر پوچھا۔ فرمائیے؟

موہن۔ فینا تو اچھی ہیں۔ کسی کو خبر تو نہ ہو گی۔

کسم۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ کسی کو خبر نہ ہو گی

موہن (تسلی کی آہ کھینچ کر) اگر فینا بدنام ہو گئی تو میں مُنہ دکھانے کے قابل نہ رہونگا ساری خطا میری ہی تھی۔ وہ بڑی بھولی ہے۔ اسے خبر ہی نہیں کہ دنیا کیسی بری ہے اور دنیا والے کتنے بڑے ہیں۔ مگر جب آپ وعدہ کرتی ہیں۔

کسم۔ کسی کو خبر نہ ہو گی۔

(موہن کا سر شانے پر ڈھلک گیا اور کسم دوڑ کر سڑک پر آئی۔ وہ ہانپ رہی تھی اور وحشت سے دیکھ رہی تھی کہ ایک سیاہ سی چیز تیزی سے آتی ہوئی دکھائی دی کسم نے بیچ سڑک پر کھڑے ہو کر ہاتھ اٹھایا موٹر رک گئی)

موٹر والے نے بگڑ کر کہنا شروع کیا۔ کیا بات ہے کیوں رُک (مگر خود ہی رُک گیا) فینا کے پتی گجراج صاحب موٹر میں تھے کسم کے ہوش اُڑ گئے سنبھل کر کہنے لگی جھاڑیوں کے ادھر تالاب کے کنارے ایک حادثہ ہو گیا ہے موٹر الٹ گئی۔ وہ زخمی ہو گئے۔ جلدی چلئے بہت جلدی۔

گجراج صاحب (دروازہ کھول کر باہر کو دوڑے) حادثہ؟ کس پر۔ کیوں کر؟

کسم۔ موہن صاحب پر۔ موٹر الٹ گئی۔ وہ دب گئے تھے۔ جلدی چلئے۔

گجراج صاحب نے نوکر سے کہا موٹر یہیں چھوڑ دو میرے ساتھ آؤ۔ تینوں چلے

گجراج۔ (اچانک) تم کو کیسے ملے۔ کیا وہ اکیلے تھے؟

کسم۔ (گھبرا کر) نہیں۔

گجراج۔ اکیلے نہ تھے؟ اُن کے ساتھ کون تھا؟

کسم۔ (کانپ کر) میں تھی۔ ہم دونوں بہت دیر سے ساتھ تھے۔ یکایک آفت آ گئی۔ غالباً بریک خراب تھے۔ موٹر باندھ سے ٹکرا کر الٹ گئی۔

گجراج۔ آپ کے چوٹ نہیں آئی۔

کسم۔ میں اچھل کر گھاس پر جا رہی۔ نام کو بھی چوٹ نہیں آئی۔ آئیے ادھر سے چلئے پگڈنڈی پر ایک ساتھ دو نہیں چل سکتے تھے۔ کسم راستہ دکھانے کے بہانے دوڑتی ہوئی موہن کے پاس پہونچی اور دو زانو ہو کر کہنے لگی۔ میں نے کہدیا ہے کہ آپ کے ساتھ میں تھی کوئی اور نہ تھا۔ آپ سمجھ گئے۔ گجراج صاحب آ رہے ہیں۔ آپ سمجھ گئے کہ نہیں؟

موہن۔ ہاں سمجھ گیا!

کسم اٹھی ہی تھی کہ گجراج صاحب بھی آگئے

(گجراج نے موٹر کو سرسری طور پر دیکھا اور کوئی چیز جیب میں رکھ لی پھر کہنے لگے۔ خوب یہ تم نے کیا کیا۔ زیادہ زخمی تو نہیں ہوئے)

موہن۔ مجھے خبر نہیں۔ صرف داہنا ہاتھ ٹوٹا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ حرکت کرنے میں جھلک ہوتی ہے

گجراج۔ اگر تم سڑک تک چل سکو تو میری موٹر موجود ہے۔ وہ بہت بڑی ہے یہاں تک نہیں آسکتی۔

موہن کے چہرے پر مُردنی سی چھائی ہوئی تھی شوفر اور گجراج نے سہارا دیکر کسی طرح موٹر تک پہونچایا اور پچھلی سیٹ پر بٹھا دیا۔

گجراج۔ چلئے سیدھے ڈاکٹر کے پاس چلیں کسم بائی۔ تم پہلو میں بیٹھ جاؤ زخمی ہاتھ کو سہارا دیئے رہو۔ گدّے لگا دو

ہسپتال۔

موٹر بہت دھیرے دھیرے چلی موہن بمشکل طور پر ضبط کر رہا

مگر بار بار چہرہ بگڑتا تھا اور ہلکی ہلکی کراہ منہ سے نکل جاتی تھی

ہسپتال کے سامنے پہونچ گئے۔ لوگ آئے موہن کو اسٹریچر پر اٹھالے گئے۔

کسم۔ میں دوڑی ہوئی آنند کٹی جاتی ہوں۔ فینیا میرے لئے پریشان ہوں گی۔

گجراج۔ (طنز سے) جیسا جی چاہے۔ میں بھی انتظام کرلوں تو آتا ہوں

کسم۔ کیا آپ کے خیال میں چوٹ بہت سخت ہے۔

گجراج۔ میں ڈاکٹر نہیں ہوں۔

فینیا دروازے ہی پر تھی کسم کو دیکھتے ہی دوڑ پڑی۔

کیوں پیاری وہ کہاں ہیں۔ کیا ہوا، تمہیں اتنی دیر کیوں لگی؟ میں کانپ رہی تھی۔

کسم۔ کانپنے کی کوئی بات نہیں۔ گجراج صاحب آگئے تھے۔ وہی ہسپتال لیگئے ہیں۔

فینیا۔ گجراج! تم نے ان سے کیا کہا؟

کسم۔ مجھے جھوٹ پر جھوٹ بولنا پڑا میں نے کہدیا کہ میں موہن کے ساتھ تھی۔ اور میں اچھل کر گھاس پر گر پڑی تھی اور مجھے چوٹ نہیں آئی۔

فینیا۔ (ذراسی خاموشی کے بعد) اگر گجراج کو کبھی بھی یہ راز معلوم ہوگیا تو وہ مجھے مار ڈالے گا۔

کسم۔ (خفا ہوکر) اگر تم اپنی بیوقوفی سے خود ہی نہ کہدوگی تو صاحب کو یہ راز کبھی نہ معلوم ہوگا بس اب سنبھل جاؤ۔ صاحب آتے ہی ہوں گے کپڑے بدلو بال سنوارو۔

فینیا۔ اچھا۔ اچھا۔ مگر میں بہت ڈری ہوئی ہوں۔

کسم۔ تم تیار ہو جاؤ تو ہم دونوں سڑک تک چل کر صاحب کا استقبال کریں۔

سڑک۔

فینیا جھٹ پٹ بن سنور کر آگئی اور دونوں مسکراتی ہوئی سڑک تک آئیں گجراج صاحب آئے مگر کھچے ہوئے انہوں نے بوسہ تک نہیں لیا۔

فینیا۔ کیسی مصیبت آگئی۔ کسم بائی اور موہن۔ کیا اُن کو زیادہ چوٹ تو نہیں آئی۔ آپ نے کیا انتظام کیا؟

گجراج۔ داہنا ہاتھ جھول گیا ہے۔ میں ابھی ابھی ہسپتال میں داخل کرکے آرہا ہوں (کسم سے) وہ کہہ رہے تھے کہ تم نے جان بچائی موٹر کے نیچے سے نکالا۔

کسم۔ جو کچھ موہن صاحب نے کہا وہی میں نے کیا۔ شکر ہے زیادہ خرابی نہیں آنے پائی۔

گجراج۔ اب اور کیا ہوتا۔

ڈرائنگ روم

(تینوں آدمی آنند کٹی میں آئے ڈرائنگ روم میں پہونچ کر گجراج نے کہا۔ خیریت ہوئی کہ تم کسم بائی کے ساتھ نہ تھیں ورنہ جانے کیا ہوتا)

کسم۔ کیوں۔ مطلب کیا ہے؟

گجراج۔ (ہنسکر) کچھ نہیں۔ یہی کہ تم ڈر کر کودنے کی کوشش کرتیں کسم بائی۔ میں تو سمجھتا تھا کہ تم کو موہن سے نفرت ہے۔ تم تو ہمیشہ ان سے بچتی رہتی تھیں یہ آج کیا ہوا۔

کسم۔ (شرم سے کٹ گئی) نفرت۔ نہیں تو (عجیب مسکراہٹ سے) وہ مجھے سیر کیلئے بہت کم پوچھتے ہیں۔ آج انہوں نے کہا میں چلی گئی۔

کھانے کا کمرہ

(شام کے کھانے کی گھنٹی بجی۔ تینوں جاکر بیٹھ گئے۔ بالکل خاموشی رہی، ہر ایک اپنے اپنے خیال میں کھویا رہا، فینیا کی نگاہوں میں بار بار شام کا حادثہ پھر رہا تھا، گجراج کا واہمہ بھی کبھی موہن کو فینیا کے پہلو میں دیکھتا کبھی کسم کو۔ کسم بھی چپ تھی اور بار بار کانپ اٹھتی تھی۔)

کھانا ختم ہوتے ہی دونوں جانا چاہتی تھیں کہ صاحب نے کہا،

ذرا ہسپتال میں فون دیکر موہن کی خیریت پوچھنی چاہیئے۔

کسم (ذراسی خاموشی کے بعد) مجھے نمبر معلوم ہے میں جاتی ہوں۔ چلی گئی

صاحب۔ فینیا ادھر آؤ۔

فینیا ناز و انداز سے اٹھلاتی ہوئی مگر رُک رُک کے بدن چراتی رہی۔ جھجک جھجک کے قدم اٹھاتی آئی۔

صاحب (طنز سے ہنسنے کی کوشش کرتے ہوئے) تم مجھے وقت سے پہلے دیکھکر کچھ ایسی خوش نہیں ہوئیں۔

فینیا۔ اور تم۔ تم نے تو آج بوسہ بھی نہیں لیا

صاحب۔ بوسہ نہیں لیا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ تم میرے بوسہ کی تمنا میں تھیں (آواز میں سختی تھی مگر دل بےچین تھا۔)

فینیا پہلے تو اپنا ہاتھ ملتی رہی پھر بڑی مشکل سے جھک کر ایک بوسہ لے لیا اور ناز سے کہنے لگی، اب میرا شکریہ ادا کرو۔ گجراج نے بھینچ کر لپٹا لیا۔ (بوسہ لیکر) کاش تم بھی مجھ سے محبت کرتی ہوتیں۔ اک ذراسی سہی (آواز گلوگیر ہوکر) پھر اس بُری طرح ہٹا دیا کہ فینیا کے لبوں سے آہ نکل گئی۔

اتنے میں کسم آگئی۔ "نرس نے بتایا کہ ہاتھ جھول گیا ہے مگر پریشانی کی بات نہیں ہے۔"

کسمؔ نے دیکھا کہ اگر فینا کچھ دیر اور اندر رہی تو بیہوش ہو جائے گی۔ کہا۔ "فینا مشاطہ باہر کھڑی ہوئی انتظار کر رہی ہے" فینا باہر کیطرف چلی۔ کسم بھی مڑی ہی تھی کہ صاحب نے کہا۔

تم ابھی نہ جاؤ مجھے دو دو باتیں کرنی ہیں۔ بیٹھ جاؤ۔

کسمؔ۔ کہئے کیا ہے؟

صاحب نے کچھ جواب نہیں دیا۔ ادھر اُدھر ٹہل کر تھوڑی دیر کے بعد۔ تم جانتی ہو کہ میری نگاہ میں تمہاری کتنی عزت اور کتنی قدر ہے؟

(کسم خاموش رہی)

صاحب۔ مگر میں وحشی ہوں، آدمی نہیں۔ میری سنگت بہت مشکل ہے، میرا کوئی دوست نہیں، کوئی ہمدرد نہیں۔ مگر جانے کیوں میں ہمیشہ تمکو اپنا ہمدرد سمجھتا رہا (اور قریب آکر) میں نے ہمیشہ تمہارا اعتبار کیا اور تم پر بھروسہ کرتا رہا!!

(کسم اب بھی خاموش رہی)

کیا یہ سچ ہے کہ جب موٹر والا حادثہ پیش آیا تو تم موہن کے ساتھ تھیں۔

(کسم کے ہونٹ ہلے مگر کوئی آواز نہ نکلی۔)

صاحب۔ سچ سچ بتادو۔ تم میم صاحب کی سیر بنا چاہتی تھیں۔

کسمؔ (گھبرا کر) نہیں نہیں۔ میں ہی تھی۔ آپ خود موہن صاحب سے پوچھ لیجئے۔

صاحب۔ اس معاملہ میں موہن صاحب کا بیان میرے لئے کچھ ایسا تسلی بخش نہ ہوگا۔

کسمؔ۔ مگر میرا بیان؟

صاحب۔ آج سے پہلے مجھے تمہارے کسی لفظ پر کبھی کوئی شبہہ نہیں ہوا

کسم۔ شکریہ (کرسی سے اٹھکر) اب اجازت ہے میں جاؤں؟

صاحب۔ ایک منٹ اور (جیب سے کچھ نکال کر) اگر تمہارا بیان سچا ہے۔ تو (عجیب آواز سے) اگر موہن کے پاس تمہارے سوا اور کوئی نہ تھا تو پھر ان کی موٹر میں اس کا ہونا کیا معنی رکھتا ہے؟

کسم۔ (سر سے پیر تک کانپ گئی) یہ میرا بیگ ہے۔ فینا نے کل ہی مجھے دیدیا تھا

صاحب (نفرت خیز لہجے میں) یہ تو فینا کو بہت محبوب تھا۔ میں حیران ہوں کہ ——

کسم۔ گجراج صاحب۔ اب خاموش نہیں رہ سکتی۔ آپ بلاوجہ اُدھیڑبن میں ہیں۔ بال کی کھال نکال رہے ہیں تو سن لیجئے ——

(صاحب کی آنکھوں میں ایک ہلکا سا تبسم تھا)

کسمؔ۔ میری منگنی موہن صاحب کے ساتھ ہوچکی ہے۔

گجراج صاحب گھبرا کر پیچھے ہٹ گئے

تمہاری منگنی۔ موہن کے ساتھ!

کسم۔ آپ کو کوئی خاص خوشی نہیں ہوئی۔ فینا عرصہ سے جانتی تھیں اور خوش تھیں

صاحب۔ فینا جانتی تھیں؟

کسم۔ ہاں۔ میں نے ہی بتایا تھا —— (تھوڑی سی خاموشی) کم سے کم مجھے مبارکباد تو دیجئے۔

صاحب۔ مبارک ہو۔ کاش موہن کے علاوہ کوئی اور ہوتا۔ میری صاف گوئی سے خفا نہ ہونا، موہن تمہارے لئے موزوں نہیں ہیں۔

کسم۔ میں خود اپنی مختار ہوں —— چلی جاتی ہے۔

ہال

(فینا پہلو والے بڑے کمرے میں انتظار کر رہی تھی)

فینا۔ صاحب نے کیا کہا۔ وہ آج بہت مشکوک سے تھے۔ کیا باتیں ہو رہی تھیں

کسم۔ زیادہ میں ہی بولتی رہی۔ وہ مشکوک تھے (بیگ کو اونچا کرکے) یہ موٹر میں ملا تھا۔ بیگ پر نگاہ پڑتے ہی فینا تڑپ اٹھی تب تو وہ سمجھ گئے ہونگے ضرور سمجھ گئے ہوں گے۔

کسم۔ مجھے کہنا پڑا کہ تم نے یہ بیگ مجھکو دیدیا تھا۔

فینا۔ ان کو ہرگز یقین نہ آئے گا وہ جانتے ہیں کہ یہ بیگ مجھے بہت محبوب تھا۔

کسم۔ (منھ پھیر لیا) دوسرا جھوٹ بھی بولنا پڑا۔ مجبور تھی۔ کہنا پڑا کہ ہم دونوں کی منگنی ہوگئی ہے۔

فینا۔ کسم!

کسم۔ بچنے کی اور کوئی صورت تھی ہی نہیں۔ اس وقت صرف یہی ایک شکل دکھائی دی۔

فینا۔ صاحب کو یقین آگیا۔

کسم۔ صاحب نے مجھے مبارکباد دی۔

فینا۔ (کسم کی گرفت سے الگ ہوکر) اور اب کیا ہونے والا ہے

کسم۔ میں نہیں جانتی مگر موہن صاحب کو خبر دینی ہوگی۔ غالباً وہ خفا نہ ہوں گے۔ سمجھ جائیں گے۔ میں نے صاحب سے کہدیا ہے کہ تم اس راز سے واقف ہو۔

فینا۔ (اپنا رومال اس طرح مروڑ رہی تھی گویا پھاڑ ڈالے گی۔) موہن کو سخت تکلیف ہوگی۔

کسم (چہرہ سرخ ہوگیا) مجھ سے زیادہ نہیں۔ اور پھر قصور میرا نہیں انہیں کا ہے۔ انہیں کو خمیازہ بھگتنا پڑیگا۔

فینا۔ اور ان سے کہے گا کون؟

کسم۔ میں لکھ بھیجوں گی۔

فینا۔ کاش مجھ سے ملاقات ہو جاتی۔

کسم۔ ناممکن ہے۔ ذرا میری حالت دیکھو۔ اگر صاحب کو میرے جھوٹ بولنے کی خبر ہوگئی تو قیامت ہو جائے گی۔ صاحب نے کہا تھا کہ میرا اعتبار کرتے ہیں

فینا۔ تم حور ہو کسم۔ مگر دیکھو ہنسو نہیں مجھے سوتیا ڈاہ کی بو آتی ہے۔ لوگ کہیں گے کہ موہن کو تم سے محبت ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ تم کو ذرا بھی نہیں چاہتے

کسم۔ جب تم جانتی ہو تو پریشانی بیکار ہے۔ مگر دیکھو اب میرے صبر کا پیمانہ بھی چھلکنے ہی والا ہے۔ میں اپنی عزت اور بھلائی کئی دفعہ قربان کر چکی ہوں اگر اس قسم کی پھر کوئی بات ہوئی تو ——

فینا۔ اگر پھر کبھی ایسی بات ہوئی تو میں موہن کے ساتھ نکل جاؤں گی۔ پیارے موہن

کسم۔ ذرا ہوش میں آؤ فینا۔ اپنے آپ کو سنبھالو۔ ورنہ ساری باتیں کھل جائیں گی۔

فینا۔ تم نہیں جانتیں۔ محبت بُری بلا ہے۔

کسم۔ پھر کہتی ہوں سنبھل جاؤ۔

فینا۔ اچھا تم خط لکھ دو میں کسی کے ہاتھ ابھی اسپتال بھیجے دیتی ہوں۔

کسم۔ تم فوراً اپنے کمرے میں جاؤ۔ صاحب کو خیال ہوگا کہ ہم لوگ کہاں ہیں کیا کر رہے ہیں۔

کسم کا کمرہ

صاحب کا کہیں پتہ نہ تھا کسم بائی اپنے کمرے میں گئی اور لکھنے بیٹھی۔ بڑی مشکل سے لکھا

"موہن صاحب"

آپ جانتے ہیں کہ گجراج صاحب بڑے شکی ہیں۔ وہ بال کی کھال نکالنے لگے تو میں مجبور ہوگئی پریشانی میں اور کچھ نہ سوجھی کہہ دیا کہ میری منگنی آپ کے ساتھ ہوچکی ہے۔ یہ لکھتے ہوئے میرا ہاتھ کانپ رہا ہے۔ جھوٹ اور سفید جھوٹ۔ مگر آپ سمجھ جائیں گے اور معاف کردیجئے۔ میں کل صبح کسی وقت آؤں گی۔

"کسم"

کسم نے دو دفعہ اپنا خط پڑھا جاذب سے خشک کیا لفافہ پر پتہ لکھا اور فینا کے پاس آئی۔ وہ اپنے کمرے میں حیران پریشان ٹہل رہی تھی

فینا کا کمرہ

کسم۔ میں نے خط لکھ لیا ہے۔ یہ لو۔ ابھی بند نہیں کیا۔ میں سمجھی کہ شاید تم بھی دیکھنا چاہو۔

فینا۔ ضرور۔ لاؤ دیکھوں (خط پڑھکر) موہن کو نفرت سی ہوجائے گی۔ میں ابھی بھیجتی ہوں۔ اسی کے ساتھ اپنا خط بھی رکھ دوں گی۔

ڈرائنگ روم

صبح کے آٹھ بجے ـــ ناشتہ کا کمرہ

صاحب۔ فینا رات کو بہت کم سوئیں۔ اسوقت آرام کر رہی ہیں۔ مجھے اسپتال کی طرف سے گزرنا ہے۔ اگر تم پسند کرو تو میرے ساتھ چلی چلو۔

کسم۔ شکریہ۔ چلی چلوں گی۔

صاحب۔ موہن صاحب تمہیں دیکھکر خوش ہوجائیں گے۔ کل رات کو درد کی تکلیف رہی ہوگی۔

کسم۔ کیا بہت چوٹ آگئی ہے؟

صاحب۔ ہاں آئی تو ہے۔

دونوں موٹر میں بیٹھ کر اسپتال پہونچے صاحب نے کہا۔ میں اسوقت جلدی میں ہوں۔ جاتا ہوں آدھ گھنٹے میں آجاؤں گا ـــ موٹر اسٹارٹ ہوگئی

ہسپتال

وارڈ ۳

کسم بہت پریشان تھی۔ کمرے کے سب پردے بند تھے۔ ایک طرف سے آواز آئی۔ کسم؟

کسم۔ (قریب پہونچ کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی) اب تو بہت آرام معلوم ہوتا ہے۔

موہن۔ رات بہت بری طرح گذری مگر یہ لوگ کہتے ہیں کہ جلد اچھا ہو جاؤں گا۔ آپ کی تکلیف کا شکریہ۔

کسم۔ نہیں تکلیف کیسی۔ یہ تو میرا فرض تھا۔ کیا آپ کو۔ آپ کو میرا پتہ مل گیا تھا؟

موہن۔ (تکیے سے خط نکال کر) آپ جو رہیں سب مجھے بڑی ندامت ہے۔

کسم۔ میں ڈر رہی تھی کہ آپ ناخوش نہ ہو جائیں

موہن۔ ناخوش (منہ پھیر کر) بھگوان کی لاکھ لاکھ دیا ہے کہ بات زیادہ بگڑنے نہ پائی میں کسی پر الزام نہیں رکھتا۔ سراسر غلطی میری ہی تھی۔ میں کبھی آپ کے احسان سے ہلکا نہیں ہوسکتا۔ آپ نے ہم دونوں پر بڑی مہربانی کی۔ مگر آپ مجھے پورا شیطان سمجھی ہوں گی

کسم۔ دوسری باتیں کیجئے۔

موہن۔ آپ نے لکھا ہے کہ گجراج صاحب کو یقین ہوگیا ہے

کسم۔ (مسکرا کر) ہماری منگنی کا حیلہ چل گیا۔ بناوٹ نے اصلیت کا جامہ پہن لیا

موہن۔ اب آپ مجھے بے تکلفی سے صرف موہن کہکر مخاطب کیا کیجئے

کسم۔ (تیوریوں پر بل ڈال کر) نہیں یہ ضروری نہیں۔ یہ چال بہت دنوں تک نہ چلی جائے گی اور نہ میں چاہتی ہوں کہ آپ ـــ

موہن کی سوتی سی نگاہیں تھوڑی دیر کسم کے چہرے پر جمی رہیں۔ جب اس نے اپنا ہاتھ بڑھایا تو ایک جڑاؤ انگوٹھی اس میں چمک رہی تھی۔

یہ میری ماں کی تھی۔ ممکن ہے آپ کی انگلی میں نہ آئے کچھ بڑی ہو مگر آپ پہن لیجئے تو......

کسم۔ (آنکھوں میں آنسو چمک گئے) میں نہ پہنوں گی۔

موہن۔ میری عزت بہت بڑھ جائے گی۔

کسم نے انگوٹھی تو پہن لی مگر برس پڑی۔ یہ تمام باتیں بڑی مضحکہ خیز ہیں۔ بڑی نفرت انگیز خاص کر ہمارے لئے جو اصلیت سے واقف ہیں (وہ اٹھی اور بے چین ہو کر ٹہلنے لگی)

موہن۔ یہ تو صرف حیلہ ہے اور کچھ نہیں ایک دو ہفتے میں تمام باتیں ختم ہو جائینگی ـــ آہ۔ آہ

کسم۔ (واپس آکر) کیا بہت درد ہے۔

موہن۔ ہاں درد ہے میں نے کہا تھا کہ اب گھر جاؤں گا۔ مگر ڈاکٹر کہتا ہے دو ایک دن ابھی اور رہنا ہوگا۔ امید ہے کہ آج بھائی صاحب دیکھنے آتے ہوں گے۔

کسم۔ آپ کے بھائی۔ تو اب مجھے جانا چاہیئے۔

موہن۔ وہ کہیں دو بجے تک آئیں گے۔ میں آپ کا تعارف ان سے کرانا چاہتا ہوں۔

یہ کہا مگر درد سے در وضبط کرتے کرتے تھک جانیکی وجہ سے آنکھیں بند ہوگئیں۔ آدھی نیند آدھی غشی چھاگئی۔ یکایک دروازہ کھلا اور گجراج صاحب آگئے۔

خوب - دونوں ہیں۔ میں کسم بائی کو لینے آیا ہوں۔ آدھ گھنٹے کا وعدہ تھا، پندرہ منٹ سے باہر انتظار کر رہا تھا۔ کہیئے موہن صاحب مزاج تو اچھا ہے۔
موہن - اچھا ہوں۔ شکریہ۔
گجراج - اگر آپ چلنا چاہتی ہیں تو ابھی چلئے۔
کسم - خدا حافظ۔
گجراج - میرا خیال نہ کیجئے۔ منگیتر سے یوں رخصت نہیں ہوتے۔ پیار لیجئے
کسم تڑپ گئی۔ کیا کرتی۔ مجبوراً جھک کر بوسہ لے لیا مگر چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ صرف گجراج کا شبہہ دور کرنے کے لئے یہ حرکت کی گئی ہے
موہن کو بھی یہ بات پسند نہیں آئی۔ دونوں شرما گئے۔

کوٹھی کی پیشیں سڑک

(دونوں اُتر کر موٹر تک آئے اور گھر کی طرف چلے)
گجراج - موہن ابھی تک خستہ معلوم ہوتا ہے
کسم - تکلیف بھی تو بہت اٹھائی
گجراج - اس کو موٹر چلانا نہیں آتا۔ تم کہو یا نہ کہو حادثہ کے وقت ساری خطا اُسی کی ہوگی۔
کسم - معلوم نہیں۔ خیال یہی تھا کہ بریک ڈھیلے ہو گئے۔
گجراج - خوب! یہ تم موہن کی انگوٹھی پہنے ہوئے ہو؟
کسم - یہ اس کی ماں کی تھی۔ مجھ سے التجا کی گئی کہ جب تک دوسری نہ آئے یہی پہنے رہوں۔
گجراج - خفا نہ ہو تو ایک بات پوچھوں۔ تم نے کبھی اپنے مستقبل کا بھی کچھ خیال کیا ہے؟
کسم - مستقبل!
گجراج - ہاں، مجھے کیا مطلب تھا گو میں تمہارا دوست ہوں۔ موہن کے پاس کوئی دولت نہیں۔
کسم - ہاں معلوم ہے مگر میرے پاس ہم دونوں کے لئے کافی ہے۔
(گجراج عجیب طور سے سر ہلا کر منہ بنا کر خاموش ہو گیا)
کسم کہیں یہ نہ سمجھیئے گا کہ ہماری منگنی اسی دولت کی بدولت ہوئی ہے
گجراج - میں یہی سمجھتا ہوں کہ وہ تمہارے لایق نہیں ہے۔
تھوڑی سی خاموشی پھر کسم نے کہا۔ دیکھئے اب کبھی پھر نہ کہیئے گا، ہماری شادی کبھی ہوئی تو صرف محبت کا نتیجہ ہوگی۔
گجراج - موہن بڑا خوش نصیب ہے۔ تم خفا تو نہیں ہو!؟

آنند کُٹی

کسم نے سر ہلا دیا۔ موٹر مکان پر پہونچ گئی تھی رُکی۔ وہ اپنے کمرے کی طرف
تیزی سے چلی مگر فینا موٹر کی آواز سن کر اپنے کمرے کے سامنے نکل کر ٹہل رہی تھی۔

فینا کے کمرے کا برآمدہ

موہن کیسے ہیں؟
آرام تو معلوم ہوتا ہے مگر کہتے تھے کہ رات بے چینی میں گزری
(دونوں کمرے میں آتی ہیں)

کسم کا کمرہ

فینا - انہوں نے مجھے پوچھا تمہارے خط کے لئے کیا کہا؟
(کسم نے بڑی احتیاط سے منہ پھیر کر اپنی ساری بدلی) انہوں نے تمہاری خیریت پوچھی وہ مضطرب تھے کہ تم صاحب کی مشکوک نگاہوں سے محفوظ رہو۔
فینا - اور میرا خط۔
کسم - کچھ زیادہ نہیں کہا مگر سمجھ گئے کہ میں مجبور تھی اور کوئی تدبیر نہ تھی۔ میرے شکر گزار ہوئے
فینا - میرے لئے کوئی خط دیا ہے؟
کسم - نہیں۔
فینا! (مایوس ہو کر) کیوں۔ کیا وقت نہیں ملا؟
کسم - نہیں۔ جب میں وہاں سے چلی تو گجراج صاحب موجود تھے۔
فینا - (یکایک شیرنی کی طرح غرّا کر کسم کا بایاں ہاتھ پکڑ لیتی ہے) تم موہن کی انگوٹھی پہنے ہوئے ہو
کسم - موہن صاحب نے اصرار کیا میں کہتی رہ گئی کہ اس کی ضرورت نہیں ہے
فینا - (گویا سنا ہی نہیں) یہ اس کی ماں کی ہے۔ میں نے کہا کہ ذرا پہن کر دیکھوں تو کہنے لگے کہ ان کو ایک سکنڈ بھی اس انگوٹھی کا جدا کرنا گوارا نہیں ہے (منہ ڈھانپ کر سسکیاں بھرنے لگی) یہ چالیں مجھے لوٹ لیں گی۔ رفتہ رفتہ وہ تمہارے ہو جائیں گے۔ اور مجھے بھول جائینگے۔
کسم - ہوش کے ناخن لو، میں تو صرف تمہارے لئے مری مٹی جا رہی ہوں اور اس کا صلہ تم یہ دے رہی ہو۔ تمہارے دل میں موہن کی محبت کی کوئی قدر نہیں کیا وہ اتنی جلد بدل سکتا ہے؟ ذرا آئینے میں تو دیکھو کہاں تم کہاں میں!
فینا - (آئینہ میں دیکھ کر مسکرا دیتی ہے) ڈر صرف اس بات کا ہے کہ لوگ اتنی سی بات کا افسانہ نہ بنا دیں۔
کسم - ہمارا دھوکا زیادہ دن نہ چلے گا۔ کاغذ کی ناؤ ہے۔

ڈائننگ روم

(دونوں خوش خوش کھانے کے کمرے میں پہونچیں گجراج صاحب منتظر تھے)

۲۶۵

گجراج۔ کسم بائی نے تم سے سب کچھ بتا دیا ہوگا، موہن زبان سے نہیں کہتا مگر دل سے بے چین ہے۔

فینا اپنے خیال میں محو تھی۔

کسم۔ وہ تو گھر جانا چاہتے تھے مگر ڈاکٹر نے روک لیا۔ وہ اپنے بھائی صاحب کے منتظر ہیں۔

فینا۔ اُن کے بھائی صاحب۔ تم ان کے بھائی صاحب سے واقف ہو؟

کسم۔ نہیں۔

فینا۔ جان لو گی تو میری ہی طرح نفرت کرو گی، پرانے ٹائپ کا ظالم انسان ہے۔ وہ مجھ سے نفرت کرتا ہے اس کی آنکھوں سے شیطنت برستی ہے

گجراج۔ یہ وہم ہے وہم بھلا غریب سوہن تم سے نفرت کیوں کرے گا۔

فینا۔ خدا ہی جانے۔ اس کی فطرت ہی ایسی ہے۔

کسم۔ وہ ہیں کیسے؟

فینا۔ پورا ڈیم فول ہے۔ ساری دولت اسی کے پاس ہے اور کوئی اولاد نہیں ہے۔ بیوی بھاگ گئی میں خود ہی ایسے شوہر کو (گجراج کی طرف دیکھکر) چھوڑ کر بھاگ جاتی۔

گجراج۔ (فینا کو دیکھکر) سوہن کو بڑی خوشی ہوئی ہو گی۔ اس کی بیوی بڑی خرانٹ تھی اور نہایت خود غرض۔

فینا۔ میں یہاں نہیں رہتی تو میرے لئے بھی ایسا ہی کہتے ہو گے۔

کسم۔ کیا بچپنے کی باتیں کرتی ہو۔ بھلا تمہیں کوئی کہہ سکتا ہے اور کیوں کہنے لگا

فینا۔ مگر صاحب تمہارے ہمزبان نہیں ہیں۔

گجراج۔ صاحب کو ہمزبانی کی کوئی ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔ تم کچھ کھا نہیں رہی ہو؟

فینا۔ بھوک نہیں ہے۔

کسم۔ مجھے بھی نہیں ہے۔ گرمی بہت ہے۔

گجراج۔ کیا دولوں کو محبت کی گرمی ہے۔ خدا دولوں کی آرزوئیں برلائے مجھے افسوس ہے کہ میں بُرے وقت مخل ہوا۔ جب تم موہن سے رخصت ہو رہی تھیں تو مجھکو باہر چلا آنا چاہیئے تھا

کسم۔ آپ کی موجودگی سے کوئی فرق نہیں ہوا۔

فینا۔ اب تم موہن سے کب ملنے جا رہی ہو؟

کسم۔ پتہ نہیں — شاید کل۔

فینا۔ میں بھی ساتھ چلوں گی۔

گجراج۔ کل سکھ بھون چلنا ہے۔ چاء کی دعوت ہے

فینا۔ (غصّہ سے) میں نہیں جانا چاہتی۔ میں نہ جاؤں گی۔ تم جانتے ہو مجھے سکھ بھون والوں سے نفرت ہے

گجراج۔ مگر تمہیں چلنا ہوگا۔ میں نے وعدہ کر لیا ہے

فینا۔ مگر مجھے ان سے نفرت ہے۔

گجراج۔ ہم کو بہتوں سے نفرت ہے (اُٹھکر) اب میں جاتا ہوں کچھ خطوط لکھنے ہیں۔

جیسے ہی صاحب گئے دروازہ بند ہوا کہ فینا کسم پر برس پڑی کیا موہن نے تمہارا بوسہ لیا تھا؟

کسم۔ فینا!

فینا۔ (میز پر ہاتھ ٹپک کر) بولو۔ کیا اس نے — کیا اس نے بوسہ؟—

کسم۔ ان کی خطا نہ تھی۔ گجراج صاحب نے کہا کہ منگیتر سے خالی خدا حافظ کہکر رخصت نہیں ہوتے اور مجھے بوسہ —

فینا۔ کیا تم نے بوسہ لیا؟

کسم۔ ہاں

فینا۔ تم مجھے دھوکا دے رہی ہو تمہیں ان سے محبت ہے۔ یہ سب تریا چرتر ہے۔ تم مجھے برباد کرنا چاہتی ہو۔ تم چھین لینا چاہتی ہو اسی لئے ہمیشہ مجھ سے کہتی رہیں کہ میں چھوڑ دوں۔ اب میں سمجھ رہی ہوں۔ سب باتیں آئینہ ہوتی جاتی ہیں۔ تمہارا اعتبار اُٹھ گیا۔

کسم بگڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی موہن کی انگوٹھی اتار کر میز پر رکھدی۔ لو تم خود ہی واپس کر دینا اور جو چاہے کہدینا۔ دروازے کیطرف بڑھی

فینا۔ (دوڑ کر گلے سے لپٹ جاتی ہے) پیاری مجھے معاف کردو۔ میں بہت نادم ہوں ہاتھ جوڑتی ہوں اب کچھ نہ کہوں گی۔ اسے پہن لو۔ پہن لو۔ (آنکھیں پونچھکر) میں دیوانی ہوتی جا رہی ہوں۔ میں اور تم سے ایسی باتیں۔ پیاری کسم۔ خدا کے لئے بھول جاؤ

کسم۔ مجھے ایسی باتیں یاد ہی نہیں رہتیں۔

فینا۔ (ٹہل ٹہل کر) سارے داؤں الٹے پڑ رہے ہیں مجھے تو معلوم ہوتا ہے کہ گجراج کو راز معلوم ہے اور اس نے صرف اس لئے کہ میں پیارے موہن کو دیکھنے نہ جا سکوں چاء کی دعوت کا ڈھونگ رچایا ہے

کسم۔ فینا۔ اپنے ہردے میں ایسے وہم کبھی باتیں نہ لاؤ۔

فینا۔ وسوسہ نہیں ہے۔ جہاں میں نہیں چاہتی تھی نہیں جاتی تھی۔ پھر کل کے لئے اتنا اصرار کیوں ہے؟

کسم۔ انہوں نے وعدہ کر لیا ہوگا

فینا۔ میں نہیں مانتی۔

کسم کا کمرہ

دونوں الگ الگ ہو کر اپنے اپنے کمروں میں چلی گئیں۔ فینا نے اپنے کمرے میں پہونچکر آئینہ میں اپنا سراپا دیکھا اور مطمئن ہو گئی۔ میرے آگے وہ اور کسی کو چاہ نہیں سکتے۔ آنکھوں میں تصویر پھر گئی کہ کسم نے یوں جھک کر مریض موہن کا بوسہ لیا ہوگا۔ آگ بگولا ہو گئی۔

اپنے راز والے جیب سے ایک پرچہ نکال کر پڑھا

"تمہارا خط مل گیا — اگر تم چاہتی ہو تو ضرور — موہن"

فینا دیر تک بناؤ سنگار کرتی رہی۔ گھڑی دیکھی تو تین بج چکے تھے۔ ایک کتاب

یہ نظر دوڑائی معلوم ہوا کہ موہن کے اسپتال میں لوگ پانچ بجے شام تک مریض کو دیکھنے جا سکتے ہیں۔ فوراً چل نکلی۔ صاحب کتب خانہ میں خطوط لکھ رہے تھے۔ فینا نے چپکے سے چور دروازہ کھولا اور نکل گئی جب اسپتال پہونچی تو ساڑھے تین ہو چکے تھے

ہسپتال

ایک نرس سے۔ کیا مسٹر موہن سے ملاقات ہو سکتی ہے۔

نرس۔ کیوں نہیں۔ سامنے والے وارڈ میں تین نمبر کا کمرہ ہے۔

فینا نے دروازہ کھولتے ہی کہا۔ موہن! مگر یکایک رک گئی، موہن اکیلا نہ تھا، ایک ہندو وضع کا پنڈت قشقہ لگائے۔ ہندو شرفا کا لباس پہنے ہوئے موجود تھا۔ کون؟ موہن کے بھائی صاحب سوہن ہیں؟

سوہن۔ نمسکار۔ اپنی کرسی خالی کر دی۔

فینا حواس باختہ تھی صرف سر کے اشارے سے سلام کا جواب دیا اور اسی کرسی پر بیٹھ گئی۔ گویا خواب دیکھ رہی تھی

سوہن۔ آپ میرے بھائی کو دیکھنے آئیں۔ بڑی کرپا کی۔

فینا۔ میں کسم کی بھیجی ہوئی آئی ہوں۔ ان کے سر میں درد تھا۔ ان کا پیام لائی ہوں آپ کو معلوم ہوگا کہ (بڑی مشکل سے آنکھیں چار کر کے) کسم کی منگنی موہن صاحب سے ہو گئی ہے۔

سوہن۔ موہن نے ابھی بتایا ہے میں مبارکباد دے چکا ہوں۔

فینا۔ میرے سوا سب کو حیرت ہوئی مگر میں تو پہلے ہی تاڑ گئی تھی

"چھپتی ہے چھپانے سے محبت کی نظر بھی"

موہن کو رنج تھا کہ ایسے وقت فینا کیوں آئی۔ یہی بچپنا موہن کو پہلے بہت بھلا معلوم ہوتا تھا مگر اب اسی بچپنے سے تکلیف ہو رہی تھی۔

سوہن۔ بھگوان نے بڑی دیا کی۔

فینا۔ (آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے) آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ ہاں ہم —— (دانت کاٹ کر) وہ دونوں ہلاک ہو گئے ہوتے۔ کسم کو ذرا بھی چوٹ نہیں آئی خراش بھی نہیں۔

سوہن۔ میں نے بھی یہی سنا ہے مگر ابھی بدقسمتی سے بھیو کے درشن نہیں ہوئے

فینا۔ آپ نے کبھی کا ہے کو دیکھا ہوگا۔ کیوں موہن صاحب۔ کسم کو جو دیکھتا ہے خوش ہو جاتا ہے؟ توبہ میں بھی کیا باتیں کر رہی ہوں — اچھا اب جاتی ہوں پھر کسی وقت آؤں گی۔

سوہن۔ آپ میرے کارن نہ جائیے۔ میں تو جا رہا ہوں۔

فینا۔ (جلدی سے) میں بھی جا رہی ہوں۔

سوہن۔ میری فٹن باہر ہی ہے۔ آپ آنند کٹی تک چلی چلیں تو میں خوش ہونگا۔ میں اب بھی موٹر سے زیادہ گھوڑے گاڑی کو پسند کرتا ہوں۔

فینا نے کہا۔ شکریہ۔ شکریہ۔ اور رخصت ہوئے بغیر دروازے کیطرف چلی۔

سوہن۔ آپ اچھی جا رہی نہیں ہیں۔ کسم بائی کا پیام تو آپ نے پہونچایا ہی نہیں۔

فینا۔ بالکل بھول گئی تھی —— انہوں نے اپنے خط کا جواب مانگا تھا۔

موہن۔ جواب کیسے لکھتا۔ داہنا ہاتھ بیکار ہے۔ بائیں سے مشق نہیں۔ کہدیجئے گا کہ کل صبح آ کر مل جائیں۔ میں تنہا رہوں گا بھولئے گا نہیں۔

اتنے میں سوہن باہر ہو گیا تھا۔ فینا نے فوراً دوڑ کر بایاں ہاتھ پکڑ لیا۔ تمہیں مجھ سے محبت ہے کہ نہیں؟ اب بھی ہے کہ نہیں؟

موہن۔ فینا تم کیوں آئیں تم نے بڑی نادانی کی

فینا۔ (ہنسکر) مجھے پرواہ نہیں۔ کل تو میں صاحب کے ساتھ سکھ بھون، جا رہی ہوں کل نہ آسکوں گی۔ پرسوں ضرور وقت نکال لوں گی۔

سڑک پر

(یہ کہکر ایک لمبا سا لے لیا اور سوہن کے پاس تیز قدم پہونچ گئی دونوں فٹن میں بیٹھ گئے اور گھر کیطرف چل نکلے۔)

سوہن۔ موہن اچھے ہو جائیں تو آپ دونوں گجراج صاحب کو لے کر کسی دن غریب خانہ پر ضرور آئیے۔ مجھے کسم بائی سے ملنے کا بہت شوق ہے

فینا۔ دونوں کی ملاقات بہت دنوں کی نہیں ہے۔

سوہن۔ یہ تو وہی کہاوت ہوئی۔ چٹ منگنی پٹ بیاہ۔ موہن کہتا ہے کہ شادی بھی بہت جلد ہو جائے گی۔

فینا۔ بہت جلد۔ مگر معاف کیجئے گا اس کے پاس تو کچھ نہیں ہے۔

سوہن۔ اس کے پاس کبھی کچھ نہیں رہا مگر سنئیے ایک راز کی بات کہتا ہوں۔ اپنے ہی تک رکھئے گا اگر مجھے یقین آجائے کہ کسی اچھی لڑکی سے منگنی ہو گئی ہے تو شاید میں بھی کچھ کر سکوں، وہ میرا سگا بھائی ہے اور میری کوئی اولاد بھی نہیں۔

فینا۔ کسم بڑی اچھی لڑکی ہے۔ مگر ذرا جوشیلی ہے۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ اس کا یہ جوش قایم رہے اور وہ شادی کرلے۔

سوہن۔ سبب؟

۲۶۷

فینا۔ میں نہیں جانتی۔ میرا خیال ہے۔ وہ دیکھئے صاحب اور کسم ٹہل رہے ہیں ۔ آپ مجھے بیوقوف سمجھیں گے مگر دیکھئے صاحب سے نہ کہیے گا کہ میں موہن کو دیکھنے گئی تھی۔

سوہن۔ (مسکرا کر) میں سمجھ گیا۔ آپ گھبرائیں نہیں

گاڑی پاس پہونچ گئی۔ سوہن نے ہاتھ ہلا کر گاڑی ٹھہرا دی اور پوچھا۔ مزاج شریف آپ کی بیوی سڑک پر بیٹھی ہوئی ملیں میں اپنے ساتھ بٹھا لایا۔ یہ کسم کیطرف دیکھ کر میری بہو آپ ہی معلوم ہوتی ہیں۔ کسم سرخ ہو کر رہ گئی۔ آج ہی صبح موہن نے مجھے بتایا ہے میں شیر باد دیتا ہوں۔

فینا الگ کھڑی ہوئی کہہ رہی تھی۔ مجھے اس سے ان سب سے نفرت ہے۔ یہ کہتی ہوئی اندر چلی گئی۔

کھانے کے کمرے سے اٹھکر۔ ڈرائنگ روم میں

فینا نے مڑ کر کہا مجھے اکیلی رہنے دو۔ میرے سر میں درد ہے۔

کسم۔ فینا بات کیا ہے۔ کچھ کہو گی بھی؟

فینا۔ کچھ نہیں۔

کسم۔ پھر تم بولتی کیوں نہیں۔

فینا۔ اس لئے کہ (مڑکر لپٹ جاتی ہے) مریم کا واسطہ انکو مجھ سے نہ چھینو! مجھے اب سے پہلے معلوم نہ تھا کہ میں ان کو کتنا چاہتی ہوں۔

کسم۔ کیسی باتیں کرتی ہو فینا!؟

فینا۔ تم دل والی ہو، مضبوط ہو، مجھ سے وعدہ کرلو کہ کل انہیں دیکھنے نہ جاؤ گی

کسم۔ میں وعدہ کرتی ہوں۔

فینا۔ دل سے!

کسم۔ دل سے۔

فینا۔ کاش کل سگھ جون نہ جانا ہوتا، مجھے ان سے نفرت ہے

کسم۔ ایک ہی دن کی بات ہے۔ گھبرائی کیوں جاتی ہو

فینا۔ میرے لئے ایک ایک منٹ ایک ایک برس سے کم نہ ہو گا۔

صبح کو فینا کافی مسرور تھی۔ جب گجراج کے ساتھ بیٹھے چلی تو کہنے لگی کسم اپنا وعدہ یاد رکھنا۔

کسم۔ اچھا!

ڈرائنگ روم

کئی گھنٹے کسم نے یونہی گزار دیئے۔ کھانے کے کمرے میں پہونچی تو فون کی گھنٹی بجی ۔۔

آواز آئی۔ میں ہسپتال سے بول رہا ہوں۔ کیا کسم بائی موجود ہیں۔ موہن صاحب نے بلایا ہے۔

کسم (چہرہ ارغوانی ہو گیا) خیریت تو ہے۔

آواز۔ وہ اچھے ہیں وہ پوچھتے ہیں کہ کسم بائی ان کو دیکھنے آرہی ہیں کہ نہیں؟

کسم۔ (آنکھوں میں فینا سے رخصتی کا سین گھوم گیا) کسم بائی موجود نہیں ہیں۔

آواز۔ تو براہ کرم جسوقت آئیں کہدیجئے گا۔

کسم۔ ضرور۔ (رسیور رو کدیا)

---- گیارہ بجے

شام کے قریب پھر وہی آواز آئی۔ کسم نے پھر وہی جواب دیا اور پوچھا کوئی خاص پیام ہے۔ آواز نے کہا کچھ نہیں خود کسم بائی سے ملنا چاہتے ہیں۔

اتنے میں فینا اور صاحب آگئے۔

صاحب۔ کیا تم اسپتال نہیں گئیں؟

کسم۔ نہیں تو ۔۔ میں دن بھر پائیں باغ میں رہی

صاحب۔ یہ تو عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے۔

فینا۔ بہت عجیب۔ ہم تو دیکھتے ہوئے آئے ہیں۔

کسم۔ پہلے سے اچھے ہیں؟

صاحب۔ اب بھی خستہ معلوم ہوتے ہیں۔

کسم۔ تم نے بھی دیکھا۔؟

فینا۔ (نظر چرا کر) بے شک

کسم۔ کچھ میرے لئے بھی پوچھ رہے تھے؟

فینا۔ کچھ نہیں۔ باتوں میں موقع نہیں ملا (ہاتھ دبا کر) سب ٹھیک ہے وہ اب بھی چاہتے ہیں۔

کسم۔ میں نے تو پہلے ہی کہدیا تھا۔

صاحب کو جاتے دیکھکر فینا بول اٹھی۔ میں بڑی بیوقوف تھی مجھکو موہن کے ساتھ کب کا نکل جانا چاہیئے تھا۔

کسم۔ فینا۔

فینا۔ انہوں نے کبھی مجھ سے نکل چلنے کو نہیں کہا۔ مگر اب کہیں تو۔ گجراج صاحب آگئے

گجراج۔ کل موہن صاحب کہہ رہے تھے کہ موہن کی طبیعت سنبھل جائے تو فوراً گھر لیجائیں مگر وہاں موہن کو میرے خیال میں کوئی راحت نہیں مل سکتی کیوں فینا۔ یہیں نہ اٹھالائیں

فینا۔ میں کیا کہوں۔ جو چاہو۔

گجراج۔ مجھے کسم بائی کا خیال تھا۔ کیوں کسم تم پسند کرو گی۔

کسم۔ بے شک (چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں)

صاحب۔ اچھا تو میں سوہن صاحب سے باتیں کر لوں گا۔ تم موہن سے کہدینا۔

کسم آپ کی عنایت کا شکریہ ---- چلا جاتا ہے

فینا۔ ہم لوگوں کے شکوک بالکل بے بنیاد تھے (جوش سرور میں رقص کرنے لگی)

کسم (تھوڑی دیر کے بعد) کہیں صاحب کا شبہ اور مضبوط نہ ہو گیا ہو اور وہ خالی بہلاوا نہ دیتے ہوں

فینا۔ بہلاوا کیسا۔ کیا میں نے کوئی گناہ کیا ہے۔ جان ہی لے گا تو کیا کریگا۔

یکایک سوہن صاحب کی فٹن دکھائی دی۔

وہ کون آرہا ہے۔ کہیں موہن کی طبیعت کچھ اور بگڑ تو نہیں گئی۔

سوہن صاحب سیدھے بڑے کمرے میں گجراج صاحب کے پاس چلے گئے اور باتیں کرنے لگے۔ فینا نے کھڑکی سے جھانکنا شروع کیا۔ وہ دیکھ رہی تھی اور خوش ہو رہی تھی۔

کوئی خاص بات نہیں ہے اور جو کچھ بھی ہو۔ ابھی معلوم ہو جائے گا۔

گجراج (اندر آکر) سوہن صاحب اسپتال سے آرہے ہیں ڈاکٹر نے کہا ہے کہ اب کوئی خطرہ نہیں۔ موہن صاحب گھر جا سکتے ہیں۔ میں نے کہدیا ہے کہ ہم لوگ ان کو یہیں اٹھالائیں گے اور وہ راضی بھی ہو گئے ہیں۔ چلو کسم موہن کو لائیں

فینا۔ (خوش ہو کر) میں یہاں کا انتظام درست رکھوں گی۔

فینا دیکھتی رہی۔ گجراج صاحب اور کسم موٹر میں بیٹھ کر اسپتال روانہ ہو گئے

موٹر جاتے ہی وہ اس کمرے میں پہونچی جو مریض کے لئے درست ہو رہا تھا اور نئے احکام سے سجانے والوں کی ناک میں دم کر دیا۔ اسے یہاں رکھو۔ اسے یوں سجاؤ۔ اسے یوں کرو۔ پھر باورچی خانہ میں پہونچی اور اتنی فضول

۲۶۸

باتیں کہیں کہ ماما بھی پریشان ہوگئی۔ تجویزیں مضحکہ خیز تھیں ادھر گجراج صاحب اور کسم موہن کو لئے ہوئے واپس آگئے۔ موٹر کی صدا سنتے ہی فینا دوڑ پڑی سر پر ٹوپی بھی نہ تھی (موہن کو دیکھتے ہوئے) بڑی دیر لگادی۔

صاحب۔ مجھے موٹر آہستہ چلانی پڑی کوئی مریض ہو تو گاڑی چالیس میل فی گھنٹہ ہانکی نہیں جاتی

موہن۔ آپ لوگوں کی بڑی عنایت ہے۔ لیکن اب بہت جلد مجھ سے اکتا جائینگے کاش میں گھر چلا جاتا

صاحب (طنز سے) آپ نے تو پوری کوشش کی تھی کہ نکل بھاگتے

موہن۔ میں کسی کو تکلیف دینا پسند نہیں کرتا۔

صاحب۔ کسم بائی کے لئے آپ کی موجودگی وجہ تکلیف نہیں باعث مسرت ہوتی (سب کے سب اندر گئے)

موہن۔ اب میں پورا مریض نہیں ہوں۔

فینا۔ کیا آپ کھانا اوپر ہی کھائیں گے۔

موہن۔ اگر کسم بائی ذراسی تکلیف اٹھائیں گی تو میں آپ سب کے ساتھ ہی کھانا کھاؤں گا۔ میرے ہاتھ میں اب تک درد ہے۔

کسم۔ ہاں ہاں۔

{ فینا آگے بڑھی تھی مگر صاحب کی آنکھیں دیکھکر بول اُٹھی۔ یہ بہت اچھا ہوگا مگر کھانا بہت بے مزہ رہا۔ موہن صاحب بار بار کراہ اٹھتے تھے۔ کھانا ختم ہوتے صاحب نے صلاح دی کہ وہ اپنے کمرے میں جاکر آرام کریں }

صاحب۔ اگر تمہاری طبیعت بگڑ گئی تو موہن صاحب مجھ سے باز پرس کریں گے۔

موہن۔ جبتک میں ان کو پریشان نہ کروں گا بھائی صاحب کو میری فکر نہ ہوگی (موہن اپنے کمرے میں اور گجراج صاحب کہیں باہر جانے لگے۔)

فینا۔ کیا آپ چاء کے وقت تک آجائیں گے۔

صاحب۔ نہیں۔ تم جانتی ہو کہ چاء مجھے بالکل پسند نہیں — (چلے گئے)

فینا۔ کوئی دوسرا مرد مجھ سے ایسی گستاخی سے بات نہیں کرسکتا

کسم۔ شوہر کو حق ہوتا ہے۔

فینا۔ اگر موہن سے ساتھ شادی ہوئی ہوتی تو وہ بیس برس کے بعد بھی اس لہجہ میں گفتگو نہ کرتے۔

کسم۔ (ہنسکر) میرے خیال میں تو وہ شادی سے پہلے ہی رنگ دکھا دیتے۔

فینا۔ تم سمجھتی ہو کہ تمہیں ان کے مزاج کا مجھ سے زیادہ اندازہ ہے۔

کسم نے بگڑ کر ایک کتاب اٹھالی۔ فینا نے تھوڑی دیر کے بعد کہا۔ موہن یہیں آکر چاء پئیں گے۔

کسم۔ نہیں۔

فینا۔ ہاں میں نے ایک چٹ لکھکر پوچھ لیا تھا۔

کسم۔ فینا!

فینا۔ زیادہ ٹھیک (؟) مجھے چٹھیں لکھنے کا حق ہے۔ وہ میرے ہیں۔ وہ صرف میری خاطر سے یہاں آئے ہیں۔

کسم۔ میں تو سمجھی تھی کہ میرے کہنے کا اثر ہوا میں نے کہا تھا کہ وہ یہاں نہ آئینگے تو صاحب کا شبہہ بڑھ جائے گا۔

فینا۔ کل تم کہو گی کہ انہیں تم سے عشق ہوگیا ہے

کسم۔ دیکھو مجھے ذلیل نہ کرو۔

فینا۔ پیاری بہن تمہارے سوا میرا اور کوئی سہارا نہیں۔ مجھے بعض وقت ذرا سا شک ہوجاتا ہے (آئینے میں اپنا سراپا دیکھکر) میرا شبہہ بالکل بے بنیاد ہے۔

کسم (ہنسکر) اگر تم سمجھتی ہو کہ بے بنیاد ہے تو اتنا پریشان کیوں کرتی ہو۔ میں نے تو کوئی بات اٹھا نہیں رکھی۔

فینا۔ میں چڑیل ہوں تم حور ہو۔ اب میں کبھی بدزبانی نہ کروں گی۔ کبھی نہیں۔ مگر آج تم چاء میں جلدی کرنا۔ (لپٹا لیتی ہے)

کسم۔ یہ مطلب ہے کہ تم دونوں کو اکیلا چھوڑ دوں؟

فینا۔ کیوں تمہیں تکلیف ہوگی؟

کسم۔ تکلیف۔ تم کہو تو میں شریک ہی نہ ہوں۔

فینا۔ یہ نہ کرنا۔ بدزیب سی بات ہوگی۔

باغ میں

مگر موہن صاحب چاء پینے آئے تو گجراج بھی پہونچ گئے۔

صاحب۔ میں نے رائے بدل دی سوچا دیکھیں کیسے (فینا کے پہلو میں بیٹھکر) اسی لئے چلا آیا۔

فینا۔ میں بھی شکر گزار ہوں اور کسم بھی —

گجراج نے چاء ختم ہوتے ہی کہا۔ موہن صاحب آپ ذرا پائیں باغ میں ٹہل آیئے۔

موہن۔ ہاں تھوڑی سی تفریح رہے گی۔

کسم۔ (پہلے تو رکی مگر پھر کہنا پڑا) چلئے شوق سے چلئے —

دونوں ساتھ ساتھ پائیں باغ کی تفریح کو چلے۔ جب آنند کٹی نگاہوں سے اوجھل ہوگئی تو کسم نے کہا "ہم سوچتے کیا ہیں ہوتا کیا ہے"

موہن۔ آپ کا مطلب کیا ہے۔

کسم۔ میں نے اور فینا نے چاء کے متعلق سب انتظام مکمل کر لیا تھا میں کسی بہانے سے وہاں سے اٹھ جاتی۔

موہن۔ کسم بائی آپ اس قدر شرمندہ کرتی ہیں کہ میری زبان پر مہر لگ جاتی ہے

کسم۔ آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں۔ اگر میں مرد ہوتی تو فینا کو خود بھی چلتا کرتی کہ کتنا شرمناک ہے۔

موہن۔ کیا چیز شرمناک ہے؟

کسم۔ فینا کی شادی ہوچکی ہے اور صاحب اس قسم کے شوہر ہیں کہ جان لیں گے۔

موہن۔ تم کیسے سمجھتی ہو کہ صاحب نہیں جانتے؟

کسم۔ وہ کیسے جان سکتے ہیں۔ وہ تو جانتے ہیں کہ آپ میرے منگیتر ہیں

موہن۔ گجراج ایک ٹھہرا ہوا پانی ہے اور ٹھہرا ہوا پانی بہت گہرا ہوتا ہے۔ پھر بھائی صاحب سوہن بھی تو ہیں۔
کسم۔ آپ کے بھائی؟
موہن۔ کل سہ پہر کو فینا آئیں تو وہ میرے پاس تھے۔
کسم۔ کہاں اسپتال میں؟
موہن۔ ہاں۔
کسم نے زبان سے کچھ نہ کہا مگر بیتاب ہو کر تیز تیز چلنے لگی۔
موہن۔ میں اتنا تیز نہیں چل سکتا، اور ساون بھادوں بھی آ گیا۔

ساون بھادوں میں

دونوں اندر جا کر بیٹھ گئے۔ خاموشی چھا گئی۔
موہن۔ کسم بائی آپ کیا سوچ رہی ہیں۔
کسم۔ میں سوچ رہی ہوں کہ زندگی بھی کیسی ہیبتناک چیز ہے۔ یہاں کوئی کسی کا نہیں ہے اور گجراج صاحب کتنے سچے آدمی ہیں۔
موہن۔ اور میں نہیں ہوں؟
کسم۔ دوسرے کی بیوی سے محبت کرنا اچھی بات نہیں ہے۔
موہن۔ معاف کیجئے مگر آپ منصف نہیں بن سکتیں۔
کسم۔ کیوں۔
موہن۔ اس لئے کہ آپ کو آج تک کسی سے محبت نہیں ہوئی۔
کسم۔ (منہ پھیر کر) شاید آپ غلطی پر ہوں۔
موہن۔ تو کیا کوئی ہے۔
کسم۔ ہاں۔
موہن۔ (تھوڑی سی خاموشی کے بعد) تو پھر بہت ہی اچھا ہوا کہ ہماری منگنی خالص بناوٹ ہے۔
کسم۔ (ہنس کر) یہ تو ہم دونوں کو پہلے ہی سے معلوم تھا۔
موہن۔ آپ فکر نہ کیجئے میرا کوئی ارادہ نہ تھا کہ آپ سے التجا کروں اور اس بناوٹ کو اصلیت کا جامہ پہناؤں
کسم۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ مجھے اس طرح گرفتار ہو جانے میں کوئی مسرت ہے تو آپ کی سخت غلطی ہے۔ میں نے جو کچھ کیا صرف فینا کے لئے تھا۔
موہن۔ کسم بائی میں نے کبھی نہیں سمجھا کہ میری محبت کی وجہ سے آپ نے ایسا کیا۔
کسم۔ (اٹھ کھڑی ہوئی آنکھوں میں آنسو بھر آئے) اگر آدمی مضبوط اور پاک نہیں ہے تو مرد ہونے کا نتیجہ ہی کیا ہے۔ آپ اپنے دل میں ان باتوں کے لئے فینا کو اور مجھے الزام دیتے ہوں گے۔ آپ کو موجودہ صورت سے نفرت ہوگی۔ مگر خطا سراسر آپ کی تھی۔ پہلے تو آپ نے دل بہلایا، جب معاملات بڑھ گئے تو آپ الگ تھلگ ہو جانا چاہتے ہیں۔ واہ کیا مردانگی ہے۔
موہن۔ (لال بھبوکا ہو کر) بدقسمتی سے میں آپ کو آپ ہی کے لہجہ میں جواب نہیں دے سکتا مگر اتنا ضرور کہونگا کہ میری دل لگی یا عشق — آپ جو کچھ سمجھیں فینا کے ساتھ میرے تعلقات کبھی زیادہ گہرے نہیں ہوئے ہیں ان کو وہ مجھے پسند کرتی تھیں۔ اس طرح کی دوستی ہر جگہ ہوا کرتی ہے
کسم۔ کنوارے مردوں اور بیاہی ہوئی عورتوں میں؟
موہن۔ ہاں عورتوں اور بیاہے ہوئے مردوں میں بھی۔ ایسی دوستی میں کوئی نقصان نہیں ہوتا —
کسم۔ یہ سچ نہیں ہے۔ آپ بھی جانتے ہیں۔
موہن۔ ہماری دوستی بے ضرر تھی۔ جب سے یہ حادثہ ہوا ساری باتیں درہم برہم ہو گئیں۔
کسم۔ معلوم نہیں 'ضرر' کا مفہوم آپ کیا سمجھتے ہیں۔ جتنے منہ اتنی ہی باتیں
موہن۔ آپ کیا سمجھتی ہیں۔
کسم۔ (مسکرا کر) آپ کسی عورت کا بوسہ لیکر اس کو اپنا گرویدہ بنا لیں تو یہ ضرر ہے اور یہ ڈھب آپ کو خوب آتا ہے۔
موہن۔ کیا بوسے سے عورت رام ہو جاتی ہے (آنکھیں جھک گئیں)
کسم۔ (ایک دم پیچھے ہٹ گئی) جیسی عورت ہو۔ اچھا اب تکرار ہو چکی ہو تو۔
موہن۔ میں تکرار نہیں کر رہا تھا۔
کسم۔ میں کر رہی تھی۔ میں یہ کہہ رہی تھی کہ آپ کا رویہ اچھا نہ تھا اور خطا آپ ہی کی تھی۔
موہن۔ شکریہ۔ ہزار بار شکریہ۔
کسم۔ آپ مجھے بنا رہے ہیں۔
موہن۔ نہیں رام کی قسم نہیں۔ آپ نے ہم دونوں پر بہت سے احسان کئے ہیں۔ میں اپنے کرتوت سے شرمندہ ہوں اور چاہتا ہوں کہ کسی طرح اس کی تلافی ہو سکے۔
کسم۔ پانی ابھی تک سر سے اونچا نہیں ہوا۔
موہن۔ شاید
کسم۔ ابھی سویرا ہے۔ میں ان معاملات کے رفع دفع ہوتے ہی یہاں سے چلی جاؤں گی۔ ہماری منگنی ٹوٹ جائے گی۔ لوگ سمجھیں گے کہ کسم کی خطا ہے۔ موہن صاحب شکستہ دل ہو گئے ہیں۔
(کسم نے ہنسنے کی کوشش کی مگر ہونٹ عجیب طرح کھل کر رہ گئے)
موہن۔ اور آپ اپنے خاص محبوب سے شادی کر لیں گی؟
کسم۔ نہیں۔ کبھی نہیں۔
موہن۔ کیوں؟
کسم۔ صرف اس لئے کہ اس نے مجھ سے التجا نہیں کی
موہن۔ التجا نہیں کی تو وہ بڑا بیوقوف ہے۔
کسم۔ (دوسری طرف دیکھ کر) گالیاں نہ دیجئے
دونوں واپس ہونے لگے۔
موہن۔ (یکایک رک کر) میرے کمرے میں بہت سے پھول ہیں۔ کیا آپ نے

رکھے ہیں؟

کسم۔ (حسرت سے) نہیں میں کیوں رکھتی فیناؔ نے رکھے ہوں گے۔

آنند کوٹی میں

موہن کا چہرہ اتر گیا جب دونوں آنند کوٹی پہونچے تو فینا ڈرائنگ روم کی کھڑکی سے دیکھ رہی تھی کسم کا دل بھر آیا۔

اتنے میں گجراج صاحب بھی فینا کے پہلو میں آکر کھڑے ہو گئے اور اسی طرف دیکھنے لگے۔

صاحب۔ کیا اچھی جوڑی ہے۔ کسم بائی کے خاندان میں اب کوئی نہیں ہے موہن سے اُن کی شادی ہو تو اچھا ہو گا۔

فینا۔ (تڑپکر) کسم بائی کی محبت یکایک کیوں جوش کر رہی ہے۔ آئے دن ایک نیا گل کھل رہا ہے

صاحب۔ مرد کو کسی نہ کسی عورت کا خیال کرنا ہی پڑتا ہے اور تم مجھے الگ ہی الگ رکھتی ہو۔

فینا۔ (ناز سے) اور اس قدر اچانک میرا خیال کیوں آگیا؟

صاحب۔ یہ اچانک نہیں ہے۔ میں تمہیں بہت چاہتا ہوں اور تم میری صورت سے بیزار ہو۔

فینا۔ شاعری اور مبالغہ آپ ہی کا حصّہ ہے۔

صاحب۔ سچائی۔ شاعری نہیں ہے۔ جب تم مجھے دیکھتی ہو تو چہرہ پر رنگ آ جاتا ہے اور جب جانے لگتا ہوں تو بشاش ہو جاتی ہو۔

فینا۔ Non sense

صاحب۔ اگر مجھے یقین ہو جائے کہ یہ Non sense ہے تو اپنی ساری جائداد قربان کر دوں۔ میں کچھ اور کہنا چاہتا ہوں۔

فینا۔ کہئے سرکار والا۔

صاحب (دونوں شانے پکڑ کر فینا کا رخ اپنی طرف کر لیا) اگر مجھے یقین ہو جائے کہ تم مجھ سے نفرت کرنے لگی ہو یا کسی اور مرد کو چاہنے لگی ہو تو میں خود کشی کر لوں یا تم کو مار ڈالوں۔

فینا۔ (شرم سے کٹ گئی گر ہنسنے کی کوشش کرتی رہی)، گجراج تم تو کبھی ایسے نہ تھے۔

صاحب نے شانے چھوڑ دیئے اور منھ پھیر لیا

صاحب۔ کبھی ایسا نہ تھا جو کچھ میں نے ابھی کہا ہے اسے یاد رکھنا۔ یہ کہا اور دروازہ بند کر کے چلا گیا۔

ہال

فینا کانپ گئی پھر بڑے کمرے میں گئی تو موہن اکیلے کھڑے ہوئے ایک "حرارت پیما" کو یونہی دیکھ رہے تھے۔

موہن!

موہن مڑا۔ جھینپ گیا۔

فینا۔ (Drawing Room) میں چلو، سارا دن گذر گیا اور میں تم سے تنہائی میں بات نہ کر سکی۔

موہن۔ میں التجا کرتی ہوں ــــ دیوانی نہ بنو۔ کوئی دیکھ نہ لے۔ کاش میں نہ آتا۔

فینا۔ (پیچھے ہٹ کر) میں سمجھی تھی کہ تم مجھ سے قریب رہنے کے لئے یہاں آئے تھے؟

موہن۔ مجھے تو یہ خیال بھی نہ تھا۔ خدا کے لئے پریشان نہ ہو۔

فینا۔ (شانے پر ہاتھ رکھکر) میں ڈاہ میں جل رہی ہوں۔ تھکی جا رہی ہوں۔

موہن۔ مگر ساری خطا میری ہی نہیں ہے۔ کیا تم چاہتی ہو کہ میں چلا جاؤں میں تمہارے لئے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔

فینا۔ اس سے کیا فائدہ ہو گا۔ تمہارے آنے کی خبر سنکر میں بہت مسرور تھی (موہن پیچھے سرک گیا) کیوں بات کیا ہے؟ (کسم کو دیکھکر) کسم، راز دار ہے قابل اعتبار ہے۔

موہن نے منہ پھیر لیا اور پائیں باغ کو واپس چلا گیا۔

پائیں باغ

پائیں باغ میں گجراج صاحب موجود تھے۔

موہن۔ آپ لوگوں نے بڑی عنایت کی۔ مگر میں مرد رہوں سب کو تکلیف ہوتی ہو گی۔ اب میں بھائی صاحب کے یہاں جانا چاہتا ہوں

گجراج۔ ہم سے اتنی جلد اکتا گئے۔

موہن۔ نہیں تو۔ یہاں رہنے سے مسرور ہوں ــ مگر

گجراج۔ تو پھر جانے کی جلدی ہی کیا ہے۔ کسم بائی اور فینا دونوں تمہاری موجودگی سے خوش ہیں۔

موہن۔ آپ لوگ بہت مہربان ہیں مگر یہ مناسب نہیں معلوم ہوتا

گجراج (گھور کر) کیا چیز مناسب نہیں معلوم ہوتی۔

موہن۔ (گھبرا کر) میرا مطلب ــ صرف یہ تھا ــ کہ مجھے یہاں رہنے کا کوئی حق نہیں ہے

گجراج۔ تمہارا حق یہی ہے کہ تم کسم بائی کے منگیتر ہو، میں کسم بائی کی بہت عزت کرتا ہوں۔ وہ میری ہمدرد ہیں۔ اب کچھ نہ کہو۔ اگر میں تمہاری باتوں میں آکر تمہیں جانے کی اجازت دیدوں تو فینا زمین آسمان ایک کر دے گی۔ اب میں ایک کام سے جا رہا ہوں ــ (چلا گیا)

فینا کا کمرہ

فینا ایک دعوت نامہ پڑھ رہی ہے۔

"موہن اور کسم بائی کی منگنی کی مسرّت میں آپ سب لوگ آج شام کا کھانا یہیں کھائیے۔"

"سوہن لال"

فینا کو یہ دعوت نامہ پڑھکر حقیقت کی اہمیت معلوم ہوئی اس نے پہلے ایک پرچہ پر لکھا

"بہت افسوس ہے ہم لوگ نہیں آ سکتے۔ ایک دوسری جگہ کے لئے پہلے سے وعدہ ہے۔"

پھر کچھ سوچ کر پھاڑ ڈالا " طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر دوں گی۔ مگر کیا فائدہ۔ یہاں تمہارا ہال ئی تو اور گھٹ جاؤں گی "

دارالمطالعہ

ٹہلتے ہوئے گجراج کی تلاش میں کتب خانہ گئی وہاں موہن صاحب ایک آرام کرسی پر سو رہے تھے زمین پر ایک کتاب کھلی پڑی تھی۔ مضمون کی سرخی موٹے حرفوں میں یہ تھی،

" ناپاک محبت کاغذ کی ناؤ ہے "

فینا۔ موہن۔ موہن

موہن آنکھیں مل کر بیدار ہوا مگر دو منٹ تک حواس درست کرتا رہا۔ کہیئے بیگم صاحب کیا کام ہے ؟

فینا۔ میں بیگم صاحب کب سے ہو گئی (دونوں گھورتے رہے) تم کب تک یہ رویہ رکھوگے کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ اصلیت ظاہر ہو جائے

موہن۔ فینا خدا کے واسطے

فینا۔ اپنے لئے کہو۔ تمہیں اپنی ہی فکر ہے۔ میری کیوں ہو (آگے بڑھ کر شانہ تھام لیتی ہے) کیا تم مجھے بالکل نہیں چاہتے ذرا بھی نہیں۔ میں نے کیا کہا ، میں کیا بدل گئی ؟

موہن (ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے) مانو میں نے کچھ کہا ہے نہ بدلی ہو۔ مگر یہ باتیں بہت انہونی سی ہیں

فینا۔ کیوں انہونی ہیں۔ جو پہلے تھی وہی بات اب بھی ہے

موہن۔ کسم بائی بھی ——

فینا۔ (بگڑ کر) ہاں تم کو اس سے محبت ہو گئی ہے۔

موہن۔ نہیں اور مجھے ہوتی بھی تو کیا تھا ، وہ تو میری صورت سے بیزار ہیں

فینا۔ (چیخ کر) اگر تم اسے نہیں چاہتے تو ——

موہن۔ اتنی زور سے نہیں کوئی سن لے گا۔

فینا۔ مجھے پرواہ نہیں (آدھی ہنسی اور آدھا رونا) صاحب بھی جان لیں تو پرواہ نہیں ایک دن ان کو معلوم ہی ہو جائے گا کہ میں تم کو کتنا چاہتی ہوں۔

موہن۔ فینا

فینا۔ میں تم پر مرتی ہوں (آنکھوں سے آنسو جاری ہیں) میں نے بڑا دھوکا کھایا کہ کسم کو سپر بنایا ، تم کہو تو ابھی صاحب سے صاف صاف کہہ دوں

موہن۔ خدا کے واسطے فینا ——

فینا۔ (پیچھے ہٹ گئی ، منہ کھلا ہوا ، نگاہوں میں یاس کی دنیا تھی) اب تمہیں میری کوئی ضرورت باقی نہیں رہ گئی۔

موہن۔ فینا

یکایک کسم بائی اندر آ گئی اور فینا کو لپٹا کر ایک طرف لے گئی۔ ہاں تو تمہارا کیا خیال ہے۔ رام راج کتنے دنوں میں ہو جائے گا اور بھارت باسی چین کی بنسی بجائینگے۔

فینا۔ (آنسو پونچھ کر) مجھے کچھ پتہ نہیں۔

یکایک گجراج اندر آ گئے۔ یہ ڈرامہ دیکھ کر پہلے تو دم بخود رہ گئے پھر کہا ، ابھی ابھی سوہن لال صاحب بھی آئے تھے سب کو زبانی اطلاع بھی دے گئے ہیں کیوں فینا خط مل گیا تھا ؟

فینا۔ ہاں ——

صاحب۔ تم ضرور چلو گی

فینا۔ ضرور

فینا خوب بن سنور کر دعوت کے لئے تیاریاں کرنے لگی۔ شفق کی نیرنگیاں بہت دلربا تھیں چڑیوں کے چہچہے فطرت کے ساز سے ہمکنار تھے۔

کسم کا کمرہ

کسم بائی اکیلی اپنے کمرے میں بیٹھی تھی کہ موہن صاحب پہونچ گئے۔

موہن۔ آپ تنہا مل گئیں بہت اچھا ہوا۔

کسم۔ کیوں کیا ہے۔

موہن۔ (واسکٹ کی جیب سے ایک ڈبیا نکال کر) آج کی رات ہماری منگنی کی خوشی میں دعوت دی گئی ہے تکمیل کے لئے یہ انگوٹھی ضروری تھی۔ ڈبیہ کھلی ، ہیرے کی جوت پھوٹ گئی۔ میری خاطر سے اسے پہن لیجئے۔

کسم (حیران پریشان سی) افسوس ہے کہ میں آپ کی خاطر نہیں کر سکتی۔ مجھے بھی ایک بات کہنی ہے۔

موہن۔ کہئے۔

کسم۔ آج رات کے بعد سے ہماری منگنی ٹوٹ جانی چاہیئے۔ بس بہت ہو چکا۔

موہن۔ صرف دو ہفتے (طنز سے)

کسم۔ (گویا سنا ہی نہیں) آج تو دعوت میں مجبوری سے جانا ہی پڑے گا مگر کل سے میں چلی جاؤں گی۔ اور سب معاملات ختم ہو جائیں گے۔

موہن۔ آپ یہ کہہ رہی ہیں کہ میں دودھ کی مکھی ہوں ؟

کسم۔ جو چاہے سمجھ لیجئے

موہن۔ اور فرض کیجئے میں نہ جانے دوں

کسم (چونک کر) کیا مطلب ؟

موہن۔ یہی کہ آپ نے صرف اس لئے منگنی کی کہ فینا بدنامی سے بچ جائے۔ اب میں چاہتا ہوں کہ یہ منگنی ابھی باقی رہے۔

پہلے تو کسم کے حواس اڑ گئے پھر سنبھل کر کہنے لگی۔ آپ خود کو بھول رہے ہیں آپ میری مرضی کے خلاف مجھ سے کسی بات کی تمنا ——

موہن (وحشیانہ تبسم سے) دیکھا جائے گا۔ تم اب تک مجھے خس برابر سمجھا کیں۔ آج میں کہے دیتا ہوں کہ یہ منگنی قائم رہے گی اور ایک دن ہماری شادی ہو گی

کسم کے ہونٹ سے آہ نکل گئی

ناممکن —— آپ کا دماغ اپنی جگہ نہیں ہے۔

موہن۔ آپ خفا ہوں یا خوش۔ میں بھی اپنی دھن کا پکا ہوں۔
کسم۔ میں بھی کہے دیتی ہوں کہ یہ سب بناوٹ صرف فینا کے لئے تھی۔ کل میں چلی جاؤں گی تو آپ سے آپ سب معاملات ختم ہو جائینگے۔
موہن۔ یہ تو آپ کا ارادہ ہے۔ کیا آپ کے محبوب نے کوئی خط بھیجا ہے؟
کسم۔ نہیں تو۔
موہن۔ تو پھر آپ اپنے محبوب کے لئے مجھے دھتکارنا نہیں چاہتیں؟
کسم نے سر ہلادیا
موہن۔ یہ آپ کا محبوب ہے کون؟
کسم (آنکھیں چرا کر) میں جواب دینے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ آپ زیادتیاں کر رہے ہیں۔
موہن (زور سے دونوں ہاتھ تھام لئے) بس اب۔۔۔۔
کسم۔ (چھوٹنے کی کوشش کرتے ہوئے) اگر تم شریف ہو تو مجھے چھوڑ دو۔
موہن۔ (ہنسکر) میں شریف نہیں ہوں اور جبتک تم جواب نہ دوگی میں نہ چھوڑونگا۔
کیا تم واقعی اس منگنی کو توڑنا چاہتی ہو۔
کسم۔ ہاں (مگر آنکھیں چار نہیں کر سکی)
موہن۔ کیا تم کو مجھ سے نفرت ہے۔
کسم۔ نفرت تو نہیں ہے۔ مگر ان باتوں سے کیا مطلب۔
موہن۔ تم نے کل ہی کہا تھا کہ اگر کوئی مرد کسی عورت کا بوسہ لے تو وہ گرویدہ ہوجاتی ہے۔
کسم۔ (تڑپ کر) میں نے نہیں کہا بعض وقت اس حرکت سے عورت کو نفرت پیدا ہو جاتی ہے
موہن۔ یہ میری قسمت ـــــ جھک کر لبوں کا پورا بوسہ لیا۔
پہلے تو کسم پریم رس میں کھو گئی مگر پھر منہ ڈھانپ کر ہچکیاں لینے لگی۔
موہن۔ معاف کردو، میں بہت شرمندہ ہوں، بہت زیادہ، میں کبھی ایسی حرکت نہ کرتا۔
یکایک دروازہ کھلا اور گجراج صاحب آگئے۔
(گھبرا کر) میں نہیں جانتا تھا کہ یہاں کوئی ہے۔
کسم فوراً باہر نکل گئی۔ گجراج نے جھرجھری لیکر کہا "عشاق کی شکررنجیاں معلوم ہوتی ہیں۔
موہن نے کوئی جواب نہیں دیا وہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ صاحب نے شانے پر ہاتھ رکھدیا۔ فکر نہ کرو جو کچھ بھی ہوا ہوگا وہ معاف کردیگی۔ عورتیں منائے جانے کے لئے لڑتی ہیں
موہن۔ کیا واقعی۔ مجھے خبر نہ تھی۔
صاحب۔ اب سے خبر ہو جانی چاہیئے۔ کسم بہت لطیف المزاج ہے اور تم خوش نصیب ہو۔
موہن۔ وہ بہت لطیف ہیں مگر میں انہیں حاصل کرکے رہوں گا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔
صاحب۔ خدا مبارک کرے۔
موٹر تیار تھی جا۔ دل پہونچے۔ کسم بائی گجراج صاحب کے پہلو میں بیٹھی۔ پچھلی سیٹ پر فینا اور موہن بیٹھے۔

موہن برداشتہ خاطر تھا۔ کھڑکی سے باہر کی چاندنی میں دیکھ رہا تھا۔ بالکل تصویر تھا۔ موٹر جارہی تھی۔
فینا۔ (شانہ چھوکر) موہن
موہن۔ کیا ہے (لہجہ سخت تھا)
فینا۔ (آنکھوں میں آنسو بھر آئے) تم کو میرے ساتھ رہنا ناگوار ہے۔
موہن۔ (بیتاب ہوکر کچھ اور کھینچا کہ فینا کا ہاتھ آستین سے الگ ہوگیا) نہیں تو مگر ایسی زندگی سے نتیجہ۔
فینا نے جواب نہیں دیا مگر بگڑ کر روٹھ کر بیٹھ گئی۔ راستہ بھر چپ لی بیٹھی رہی۔
موٹر منزل پر پہونچکر رکی موہن نے سہارا دینا چاہا
فینا۔ جائیے کسم کو اتاریئے۔ اور خود گجراج کا سہارا لیکر اتر پڑی
چاروں اتر کر چلے۔ میزبان نے آؤ بھگت کی۔ فینا مسز پرسوہن لال اور ایک دوسرے نوجوان ہندو کے بیچ میں بیٹھی اور اس نوجوان ہندو سے معاشقہ کرنے لگی صرف اس لئے کہ موہن جلیں بھنیں۔ مگر موہن کسم بائی میں اتنے کھوئے ہوئے تھے کہ خود فینا دیکھ دیکھ کر جل رہی تھی
پیانو پر ایک نوجوان لڑکی گا رہی تھی:۔
ایک مس سیمیں بدن سے کرلیا لندن میں عشق
سُن رہا ہوں اس خطا پر طعنہ ہائے دلخراش
کوئی کہتا ہے کہ بس اس نے بگاڑی نسل قوم
کوئی کہتا ہے کہ ہے یہ بدخصال و بدمعاش
دل میں کچھ انصاف کرتا ہی نہیں کوئی بزرگ
ہو کے خود مجبور اب اس راز کو کرتا ہوں فاش
ہوتی تھی تاکید لندن جاؤ انگریزی پڑھو
قوم انگلش سے ملو سیکھو وہی وضع تراش
جگمگاتے ہوٹلوں کا جاکے نظارہ کرو
بال میں ناچو کلب میں جاکے کھیلو ان سے تاش
جب عمل اس پر کیا پریوں کا سایہ ہوگیا
جس سے تھا اپنی طبیعت کو سراسر انتعاش
وہ بتان ماہرو جادو نظر، سیمیں بدن
ہاں جوانی کی امنگ اور ان کو عاشق کی تلاش
جب یہ حالت تھی تو ممکن تھا کہ اک برق بلا
دست سیمیں کو بڑھاتی اور میں کہتا دورباش
جب موہن لال صاحب مبارکباد کا ٹوسٹ دینے اٹھے تو فینا تڑپ کر رہ گئی مگر جواب ضروری تھا گلاس کانپتے ہاتھوں سے اٹھا کر موہن کو دیکھتے ہوئے کہا "یہ تمہارے لئے ہے، خدا کرے تم بامراد رہو"
کسم جھینپ گئی اور آنکھوں میں آنسو چمک گئے
فینا کے سامنے ایک نوجوان لڑکی بیٹھی تھی۔ اس نے اٹھکر کہا۔ کسم بائی مبارک ہو، میں موہن کو ایک زمانے سے جانتی ہوں

کسم ۔ آپ کی عنایت ۔

لڑکی ۔ بڑی خوشی ہے کہ موہن صاحب جلد اچھے ہو گئے ممکن تھا کہ وہ حادثہ خود انکے لئے اور گجراج صاحب کی بیوی کے لئے مہلک ثابت ہوتا ۔

چاروں طرف سناٹا چھا گیا ۔

گجراج ۔ آپ نے دھوکا کھایا ۔ اس دن موہن کے پہلو میں میری بیوی نہ تھیں ۔ کیوں کسم

کسم ۔ ہاں میں تھی

لڑکی ۔ میری نگاہیں ابھی ایسی کمزور نہیں ہیں کہ عینک کی ضرورت ہو ، کیوں بہن فینا اس دن سہ پہر کو موہن کی موٹر پر آپ نہ تھیں ۔ میں گرجے کے پاس سے گزر رہی تھی کیوں یاد آیا ؟ (تصویر بھر گئی)

فینا ۔ غلط ، بالکل جھوٹ

کسم ۔ آپ نے غلطی کی ۔ جب یہ حادثہ ہوا تو میں موہن صاحب کے ساتھ تھی

پھر ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں

موہن ۔ اب تو سوہن لال صاحب بھی پسند کر چکے ۔ تمکو شادی کرنی ہی پڑے گی ۔

کسم ۔ میری مرضی کے خلاف مجھے کوئی مجبور نہیں کر سکتا

موہن ۔ تم بھی راضی ہو جاؤ گی ، کسم

(سب لوگ رخصت ہو کر واپس روانہ ہوئے اب کی فینا قصداً اپنے شوہر کی بغل میں بیٹھی) موہن خوش تھا کسم بھی ہوئی بیٹھی تھی ۔ مگر فینا کا واہمہ اس کی آنکھوں میں عجیب عجیب تصویریں کھینچ رہا تھا ۔ کبھی وہ موہن اور کسم کو گلے میں بانہیں ڈالے دیکھتی کبھی بوسہ لیتے ۔ مگر جب ذرا سا مڑ کر دیکھتی تو وہاں کچھ بھی نہ ہوتا ۔

گھر کے قریب پہونچتے وقت

موہن ۔ تم نے کل چلے جانے کی تیاریاں کر لی ہیں ۔

کسم ۔ ہاں

موہن ۔ حیدہ کیا ہوگا کوئی تار آئے گا ۔ یا کسی خالہ کے موت کی خبر

کسم ۔ آپ سے کوئی غرض نہیں ۔

موہن ۔ ہے کیوں نہیں ۔ خیر ۔ تم نہیں جا سکتیں

کسم ۔ دیکھا جائے گا ۔ تم چاہتے ہو کہ مجھے تم سے پوری نفرت ہو جائے ؟

موہن ۔ نفرت اور محبت میں چولی دامن کا ساتھ ہے ۔

کسم ۔ کیا تم ہر عورت سے یونہی دل لگی کرتے ہو

موہن ۔ یہ دل لگی نہیں ہے میں بالکل سنجیدہ ہوں

کسم ۔ تم فینا سے بہت سنجیدہ تھے

موہن (ہونٹ کاٹ کر) میں نہ تھا ۔ تمہیں خوب معلوم ہے

کسم ۔ میں نہیں جاننا چاہتی ۔ مجھے کوئی دلچسپی نہیں

موہن ۔ تم اس مرد کا نام بتا دو جسے مجھ پر ترجیح دیتی ہو ؟

کسم ۔ میں تو نہ بتاؤں گی ۔

موہن (لہجے کے انداز سے بگڑ گیا) ضرورت نہیں شاید میں جانتا ہوں

کسم ۔ تم بڑے ہوشیار ہو

اتنے میں موٹر آنند کٹی کے سامنے آ کر رک گئی ۔

فینا اور کسم اندر چلی گئیں

ڈرائنگ روم

کسم ۔ کہو فینا کچھ تفریح ہوئی

فینا ۔ (برس پڑی) تم جانتی ہو کہ میں نفرت سے دیوانی ہو رہی تھی ۔

کسم ۔ (ایک قدم ہٹ کر) تم میری طرف سے مشکوک ہوئی جا رہی ہو

اتنے میں گجراج صاحب آ گئے ۔

فینا ۔ میں بہت تھک گئی ہوں ، سونے جاتی ہوں

صاحب ۔ دو چار منٹ تو مجھے دے ہی سکتی ہو

فینا ۔ اگر کچھر بازی کا ارادہ ہے تو معاف رکھئے

صاحب ۔ مجھکو (آواز میں نرمی اور سختی دونوں تھیں) چند سوالات کرنے ہیں

کسم بائی چپ چاپ چلی گئی ۔ فینا کا چہرہ بدل گیا ۔ آنکھیں جھک گئیں ۔

صاحب ۔ آج دعوت میں اس نوجوان لڑکی نے جو کچھ بیان کیا اس میں کتنی بات سچ تھی ۔

فینا ۔ تم کیا کہہ رہے ہو ؟

صاحب ۔ تم خوب جانتی ہو ۔ اس نے یہی کہا کہ حادثے کے وقت تم موہن کے پہلو میں تھیں ۔

فینا ۔ بہتان (Non sense) میرا اعتبار نہیں تو کسم سے پوچھ لو

صاحب ۔ تم نہیں جانتیں کہ کسم صرف تمہاری خاطر کتنی بار جھوٹ بول چکی ہے ۔

فینا ۔ تمہاری غرض کیا ہے ؟

صاحب ۔ کوئی خاص غرض نہیں میں صرف یہ پوچھتا ہوں کہ اس روز موہن کے ساتھ تم تھیں کہ نہیں ؟

فینا ۔ اگر میں جواب نہ دوں تو کیا سمجھو گے ؟

صاحب (ایک قدم آگے بڑھکر) غصہ سے دیوانہ ہو رہے تھے ۔ اگر تم جواب نہ دو گی تو میں سمجھوں گا کہ یہی سچ ہے ۔ میں سمجھوں گا کہ کسم بائی کی منگنی محض بناوٹ ہے ۔ میں سمجھوں گا کہ اب تک تم نے جھوٹی باتیں جوڑی ہیں اور مجھے بیوقوف بنایا ہے (زور سے شانوں پر ہاتھ رکھکر) جواب دو ۔ تم تھیں کہ نہیں ؟

پہلے تو فینا نے خوف بھری نگاہوں سے دیکھا پھر دیوانوں کی طرح ہنس کر کہنے لگی ۔ ہاں ۔ میں تھی

گجراج نے دھیرے دھیرے اپنی گرفت سے رہا کیا اور وہ دو قدم پیچھے ہٹ کر ہانپنے لگی ۔

فینا ۔ کہئے اب کیا ارادہ ہے ۔

گجراج نے کوئی جواب نہیں دیا چپ چاپ ایک کھڑکی کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا ۔

فینا ۔ اگر تم نہیں چاہتے تو میں ابھی یہاں سے چلی جاؤں گی

صاحب ۔ تم میرے پنجے سے اتنی آسانی سے نہیں رہا ہو سکتیں

فینا۔ مطلب کیا ہے۔ نہ میں تمکو چاہتی ہوں نہ تم مجھے۔ ہماری شادی سخت غلطی تھی وہ میری ہی سہی۔ مجھے پرواہ نہیں۔

صاحب (ہونٹوں کو زبان سے تر کرکے) کیا تم یہ کہہ رہی ہو کہ تمہیں موہن سے محبت ہے۔

فینا۔ ہاں (کہا تو مگر ڈر سے ہوش و حواس غائب ہو گئے)

صاحب (وحشت سے ہنس کر) ڈرو نہیں۔ میں حملہ نہیں کرونگا۔ (کمرے کے اس سرے تک جاکر واپس آنے کے بعد) اور کسم کی کتنی خطا ہے۔ تم نے اسے اپنی سپر بنا رکھا ہے

فینا۔ یہ خود کسم کی ترکیب ہے۔ ہر ایک سے اپنی منگنی کی داستان کہتی پھرتی ہے

صاحب۔ تمہارے بچاؤ کے لئے؟

فینا۔ پہلے تو یہی تھا مگر اب میری نگاہ سے گر گئی ہے

صاحب۔ کیا مطلب ہے؟

فینا۔ اس کو پہلے ہی سے موہن کی محبت رہی ہو گی اب وہ مجھ سے چھین لینا چاہتی ہے۔

صاحب۔ تم ــ سے ــ چھین ــ لینا ــ چاہتی ــ ہے (آنکھیں انگارہ ہو گئیں) یہ قصے کب سے چل رہے تھے؟

فینا۔ اپنے آپ کو سنبھالو۔ یوں نہ دیکھو۔ ہم دونوں ابتک صرف دوست ہیں اور کچھ نہیں۔

صاحب۔ تو پھر تم کیوں ڈر رہی تھیں کہ مجھے حادثہ والا راز معلوم نہ ہو۔

فینا۔ صرف اس لئے کہ تم کو موہن سے ہمیشہ نفرت تھی۔ رشک تھا۔ اور میں ڈرتی تھی

صاحب۔ (غم سے ہنسکر) میری زندگی کا مقصد صرف یہی تھا کہ تم خوش رہو۔ فینا کاش تم نے کبھی محبت کی ہوتی۔

فینا نے کانپتے ہاتھوں سے صاحب کا ہاتھ پکڑ لیا صاحب ایک منٹ تک بغور دیکھتے رہے پھر اسکا ہاتھ جھڑک کر بالکل چپ چاپ کمرے سے باہر جانے لگے۔

فینا دوڑ کر لپٹ گئی۔ تم کہاں جا رہے ہو۔ کیا کرنے جا رہے ہو

مگر صاحب بغیر جواب دیئے ہوئے چھڑا کر چلے ہی گئے۔

کسم کا کمرہ

فینا دیوانہ وار دوڑتی ہوئی کسم کے کمرے میں پہونچی

کسم (فینا کو دیکھکر) خیریت؟ کیا بات ہے؟

فینا۔ صاحب کو معلوم ہو گیا۔ میں نے کہدیا۔

کسم۔ کیا کہدیا؟

فینا۔ موہن کی داستان۔ اپنی محبت۔ حادثہ کا راز (ہچکیاں لیکر) میں بہت ڈر رہی ہوں

کسم۔ کیوں ڈرتی ہو۔ تم نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ صرف دل لگی تھی۔ یہ بتایا کہ نہیں۔

فینا۔ دل لگی! (لال بھبوکا ہو گئی) میں جانتی تھی کہ تم ہمیشہ سے ان سے محبت کرتی ہو تم مجھ سے چھیننے کے لئے ہمیشہ تریا چرتر کرتی رہیں۔ تم اپنے اوپر ریجھاتی رہیں اور میری دوست بنی رہیں

کسم۔ میں اب بھی تمہاری دوست ہوں۔ میں نہیں چاہتی کہ تم اپنی اور صاحب دونوں کی زندگی تباہ کرو۔ ہوش میں آؤ۔ موہن صاحب تم کو نہیں چاہتے۔ تمہیں تکلیف ہوتی ہے۔ میں نہ کہتی مگر سچی بات یہی ہے کہ موہن صاحب تم کو نہیں چاہتے۔

فینا۔ (ہاتھ بلند کرکے) میں تمہیں مار ڈالتی۔ مار ڈالتی۔ یہ بات کیسے تمہاری زبان سے نکلی۔ ان کو مجھ سے محبت ہے۔ عشق ہے۔ تم چھین لینا چاہتی ہو۔ مگر کچھ ہو جائے یہ نہ ہو گا۔

کسم۔ اب میرے بس سے باہر ہے۔ میں نے اپنی انتہائی کوشش ختم کر دی۔

فینا۔ مجھے یقین ہے کہ تم موہن سے محبت کرتی ہو اب سے نہیں پہلے دن سے۔

کسم نے منہ پھیر لیا۔ خاموشی چھا گئی

فینا۔ اگر صاحب، موہن پر حملہ کر بیٹھے تو

کسم۔ صاحب اس مزاج کے آدمی نہیں ہیں۔ اور پھر موہن صاحب نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ صرف دل لگی تھی بہن ہوش سنبھالو۔ میں جاکر صاحب سے باتیں کئے لیتی ہوں۔ اور سارا الزام اپنے سر اوڑھے لیتی ہوں۔ تم نے اپنی حالت درست نہ کی تو ساری عمر کی خرابی ہو جائے گی۔

فینا۔ (گلے سے لپٹ کر) مجھے کوئی نہیں چاہتا، کاش موت آ جاتی (رو کر) میرا کوئی نہیں ہے۔

کسم۔ جس زمین پر تم چلتی ہو صاحب اپنی آنکھیں بچھاتے ہیں میں ابھی ان سے باتیں کرکے سب درست کئے دیتی ہوں۔ گھبراؤ نہیں۔

فینا۔ اور اگر باتوں کی درستگی نہ چاہوں تو۔ تم میری جگہ ہوتیں تو کیسے دیکھ سکتیں کہ موہن پیارا موہن کسی دوسری عورت کی محبت میں گرفتار ہو جائے۔

کسم۔ فینا!

فینا۔ مجھے تم سے نفرت ــ نفرت ہو گئی ہے اور وہ چلی گئی

ڈائننگ روم

اس طرف کسم نے اپنے سفر کی تیاریاں کیں۔ ادہر موہن نے جب کھانے کے لئے کسم آئی تو آگے جراج صاحب منتظر تھے۔ کہنے لگے

"فینا کے سر میں شدید درد تھا، میں نے بھی یہی مناسب سمجھا کہ سو رہیں۔

کسم۔ میں ذرا پہلے سے آ گئی چاہتی تھی کہ آپ سے دو دو باتیں کھانے سے پہلے ہی ہو جائیں۔

صاحب۔ خیریت تو ہے؟

کسم۔ ہاں موہن صاحب کے متعلق کچھ کہنا تھا۔

صاحب۔ کہو۔ کیا ہے۔؟

کسم۔ فینا نے مجھ سے سب باتیں کہہ دی ہیں۔ شاید آپ کو معلوم ہو گیا ہے کہ حادثے والی شام کو میں نہیں فینا موٹر میں تھیں۔

صاحب اچھا پھر؟

کسم۔ مجھے صرف یہ بتانا تھا کہ خطا سراسر میری ہی تھی۔ میں ہی نے چھپایا اور منگنی کی بات بنا دی۔ فینا آپ سے ہمیشہ ڈرتی تھیں۔

صاحب۔ ان کو ڈرنا ہی چاہیئے میں نے ہمیشہ اُن پر سختیاں کیں

کسم۔ نہیں یہ بات نہیں ہے آپ اس قسم کے آدمی ہیں کہ فینا سی عورت ڈر جائے۔

صاحب۔ کبھی تم مجھ سے اڑی بھی ہو ؟
کسم۔ کبھی نہیں۔
صاحب۔ اچھا کچھ اور بھی کہنا ہے ؟
کسم۔ میرا فرض ہے کہ آپ سے بتا دوں۔ اُن دونوں میں ایک معمولی دل لگی کے علاوہ کبھی کوئی گہری بات نہیں تھی نہ ہے۔ آج کل فیشن کی آزادیاں جتنی ہیں وہ آپ کو معلوم ہیں۔
صاحب۔ تم میری بیوی کی صفائی دے رہی ہو۔
کسم۔ نہیں۔ ان کا بچپنا ضرور تھا۔ غلطی تھی۔ مگر آپ بھی ضرورت سے زیادہ اُلجھ رہے ہیں۔
صاحب۔ (کچھ آگے بڑھکر) میں تمہاری عزت کرتا ہوں۔ اس لئے کہتا ہوں کہ فینا کو موہن سے محبت ہے اور وہ میری صورت سے بیزار ہے۔
کسم۔ (ایک قدم ہٹ گئی) نہیں۔ نہیں۔
صاحب میں کہتا ہوں ہاں، میں فینا سے دس سال بڑا ہوں۔ میں فینا سے محبت کرتا ہوں اس پر اپنی جان قربان کر دینے کو تیار ہوں۔ اگر مجھے یقین ہو جائے کہ وہ کسی دوسرے سے شادی کرکے خوش رہ سکتی ہے تو میں خود ہی اس کی راہ سے الگ ہو جاؤں گا۔
کسم تصویر بنی ہوئی سنتی رہی
میری جگہ کوئی اور ہوتا تو دونوں کا بھیجا ناک کے رستے نکال دیتا۔ یا کم سے کم موہن کو ––
کسم چیخ اٹھی
نہیں ڈرو نہیں جہاں تک میرا تعلق ہے موہن بالکل محفوظ ہے
کسم۔ شکریہ ۔ احسان
صاحب۔ (گھور کر) کیا تم بھی موہن کو چاہتی ہو۔
کسم۔ آپ میرا اعتبار کرتے ہیں مجھے آپ پر بھروسہ ہے۔ سن لیجئے۔ موہن صاحب کو میری محبت ذرہ برابر بھی نہیں مگر مجھے وہ ہمیشہ سے پسند تھے فینا کی ملاقات کے پہلے سے۔ اسی لئے میں بیچ میں پڑی تھی مجھے دونوں پسند ہیں۔ مگر اب دیکھتی ہوں کہ میرے بیچ بچاؤ سے سارا کھیل بگڑا جا رہا ہے۔
صاحب۔ تب تو موہن میرے خیال سے زیادہ سادہ لوح ہے۔
کسم۔ بعض واقعات پر کسی کا قابو نہیں چلتا۔ میں آج ہی جا رہی ہوں۔
صاحب۔ جا رہی ہو ؟
کسم۔ میں ان شرمناک باتوں کے بعد نہیں رک سکتی آج ہی چلی جاؤں گی اور موہن صاحب کو لکھ دوں گی کہ ہماری منگنی ختم ہو گئی۔
صاحب۔ کیا وہ راضی ہو جائے گا ؟
کسم۔ اور کوئی چارہ ہی نہیں۔
صاحب۔ اب تم نے جانے کا ارادہ ہی کر لیا ہے۔ تمہارا جانا مجھے کھلیگا۔
(تھوڑی دیر کے بعد) غالباً ہماری دوستی اب بھی ویسی ہی ہے۔
کسم۔ ان باتوں کے بعد بھی۔

صاحب۔ ان باتوں کے بعد بھی اور انہیں باتوں کی وجہ سے۔ تم نے میری بیوی کو بہت بچایا۔
کسم۔ (ہاتھ ملا کر) کاش میں آپ کو مسرور دیکھ سکتی۔
صاحب۔ تم بڑی غمگسار ہو۔ مگر زندگی صرف کاش کا مجموعہ نہیں ہے۔
کسم کے جاتے ہی صاحب نے گھنٹی بجائی اور نوکر سے موہن صاحب کو بلوا لیا۔
موہن۔ آپ نے بلایا ہے
صاحب۔ ہاں آیئے۔ دروازہ بند کر دیجئے
دونوں تھوڑی دیر ایک دوسرے کو دیکھتے رہے پھر صاحب نے پوچھا
تمہیں معلوم ہے کہ کسم بائی آج ہی جا رہی ہیں ؟
موہن خاموش رہا
میں کسم بائی کی قدر کرتا ہوں، اسی لئے کچھ کہنا چاہتا ہوں
موہن۔ کہئے ؟
صاحب۔ (کرسی آگے کھسکا کر) میں تم سے صرف ایک سوال پوچھوں گا
موہن۔ وہ کیا ؟
صاحب۔ اگر میں نہ ہوں۔ اگر فینا آزاد ہو تو تم اس سے شادی کروگے۔
موہن (ذرا سا تامل کرکے) نہیں۔ کبھی نہیں۔
صاحب۔ اگر تم سچ کہتے ہو تو تمہاری جرأت قابل تعریف ہے مگر –– ––

– – – – – –

موہن (لال پیلا ہو کر) میں نے بہت بچپنا کیا حماقت کی مگر اپنی شرافت کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ معمولی کشش کے علاوہ اور کبھی کوئی نازیبا تعلق ہم میں نہیں ہوا۔ کسم بائی ہمارے لئے سینہ سپر ہوئی اور ہم کو نباہنا پڑا
صاحب۔ اور یہ بات تکلیف دہ ہے
موہن۔ نہیں تو۔ میں کسم بائی کو دل و جان سے چاہتا ہوں۔ اس طرح آج تک کسی دوسری عورت سے مجھے محبت نہیں ہوئی اور میں اس سے ضرور شادی کرونگا۔
صاحب۔ کسم بائی تو جا رہی ہیں
موہن۔ میں بھی ساتھ جاؤں گا
دونوں ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔
صاحب۔ میں تمہارے انتخاب کی قدر کرتا ہوں اور کسم بائی کے انتخاب سے نفرت۔
موہن۔ آپ کو پورا حق ہے کہ مجھے ذلیل کیجئے۔ مگر سیاہی ایسی گہری نہیں جیسی آپ سمجھتے ہیں۔ جو باتیں ہو گئیں، میں ان کے واسطے بہت شرمندہ ہوں۔ بہت زیادہ۔
صاحب۔ مگر تم کسم بائی سے شادی کروگے ؟
موہن۔ ضرور
صاحب۔ اور میری بیوی کا حشر کیا ہوگا۔ فینا نے مجھ سے آزادی چاہی ہے۔ کیوں چوٹ لگی ؟
(ہنسکر) خوب –– اور فوراً تیزی سے کمرے کے باہر چلا گیا

سٹیشن

گاڑی روانہ ہی ہونے والی تھی گارڈ سیٹی بجا رہا تھا، کسم فرسٹ کلاس کے ایک خالی ڈبے میں اپنا سامان رکھے ہوئے تھی۔ اتنے میں دروازہ کھلا اور ایک مرد بوکھلایا ہوا آیا۔ فوراً سامان رکھا گیا۔ قلی اترا ہی تھا کہ گاڑی چل نکلی۔

چلتی گاڑی میں

کسم۔ تم میرے پیچھے کیوں پڑے ہو؟

موہن۔ یونہی۔

کسم۔ تم نفرت بڑھاتے جا رہے ہو

موہن۔ آخر میری وجہ سے تمہارا کیا نقصان ہے؟

کسم۔ میری سب سے بہتر دوست فینا مجھ سے چھوٹ گئی۔ رخصت ہوتے وقت اس نے خدا حافظ بھی نہیں کہا۔

موہن۔ شروع ہی سے غلطیاں ہوتی رہیں۔ مگر فینا۔

کسم۔ خوب سارا الزام غریب فینا کے سر۔ یہی مردانگی ہے۔

اتنے میں ایک سٹیشن آ گیا دونوں خاموش ہو گئے۔ اسٹیشن معمولی سا تھا، ٹرین فوراً چل نکلی۔

کسم کے ذہن میں جانے کیا آیا کہ چلتی ہوئی ٹرین کا دروازہ اس نے کھولا مگر موہن نے فوراً دیکھ لیا۔ تڑپ کر قریب پہونچا ایک ہاتھ سے کسم کو سمیٹ لیا اور دوسرا ہاتھ دروازے کے دستہ کیطرف بڑھایا اتنے میں گاڑی کی حرکت سے دروازہ خود بخود بند ہو گیا اور موہن کا داہنا ہاتھ کھنچتے کھنچتے دروازے میں پس گیا، انگلیاں لہولہان ہو گئیں۔

کسم چھوٹ گئی۔ موہن تڑپ اٹھا۔

کسم۔ (پریشان ہو کر) کیا انگلیوں میں بہت چوٹ آ گئی۔

موہن۔ (درد سے رک رک کر ہنستے ہوئے اور ہاتھ پیچھے کر کے) نہیں کچھ نہیں۔ یہی جھوٹا ہاتھ تھا۔

کسم۔ تم زخمی ہو گئے۔ خطا میری تھی (آنکھوں میں آنسو بھر آئے) مجھے بڑی ندامت ہے ذرا دیکھنے دیجئے۔ کسم نے فوراً ہی پانی سے دھویا اور اپنے ریشمی رومال کو چیر کر باندھ دیا۔

موہن۔ کاش سارا جسم زخم ہی زخم ہوتا۔ ذرا میری طرف دیکھو

کسم نے دیکھنا چاہا مگر دیکھ نہ سکی۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

موہن (ایک ہاتھ سے لپٹا کر) میری طرف دیکھو

دونوں نے عجیب نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

موہن۔ کیا تم مجھے معاف کر سکتی ہو۔ میں کتنا ہی ذلیل کیوں نہوں۔ پیاری تمہاری نگاہوں میں ایک عجیب جھلک ——— معاف کر دو

کسم۔ (ذرا سا رک کر) تم مجھے ہمیشہ سے اچھے معلوم ہوتے ہو (موہن بولنے کو تھے کہ کہنے لگی) ذرا رک جاؤ۔ میری سن لو ——— (ساری جان سے کانپ رہی تھی) جب تم فینا سے واقف بھی نہ تھے میں تب سے تمہیں چاہتی تھی۔ میری آتما پر تکلیف تھی کہ تم کو اور فینا کو ———

موہن نے دونوں ہاتھوں سے اپنا منھ چھپا لیا۔ کاش تم جانتی ہوتیں کہ میں کتنا شرمندہ ہوں اور فینا کے ساتھ میرے تعلقات بالکل معمولی تھے (حادثے والا سین)

کسم۔ مگر فینا کو تم سے محبت ہے۔

گہری خاموشی چھا جاتی ہے

موہن۔ میں اپنی صفائی نہیں دیتا۔ صرف اتنا کہتا ہوں کہ مجھے جھوٹا نہ سمجھو تم سے پہلے میں نے کسی عورت سے سچی محبت نہیں کی۔ تم سے حقیقی محبت ہے۔

کسم۔ یہ کب سے؟

موہن جب سے تم پہلے پہل اسپتال میں مجھے دیکھنے آئیں تھیں اس سے بھی پہلے جب تم نے مجھے موٹر کے نیچے سے نکالا اسی وقت سے محبت کرنے لگا ہوں اور عمر بھر کرتا رہوں گا۔ تمہارے احسان بھی مجھ پر بہت ہیں۔ تم نے بہت سے نازک موقعوں پر ہمیں بچایا ہے۔

کسم کی آنکھوں میں موہن اور فینا کے معاشقے کی تصویریں پھرنے لگیں وہ خاموش تھی۔

موہن۔ کیا تم اب کبھی مجھے بوسہ نہ دو گی۔ نہ میرا بوسہ لو گی۔ میں آج ہی تم سے بمبئی پہونچتے ہی شادی کر لوں گا۔ اور آج موقع نہ ملا تو کل ہاتھ تو ملا لو۔

کسم۔ مگر میں شادی نہ کروں گی۔ تم فینا کا مال ہو۔ جب تک تمہارا قضیہ ان سے طے نہ ہو جائے میں شادی نہ کروں گی۔

موہن۔ کیسی بھولی باتیں ہیں فینا سے کیا مطلب۔ وہ میری مالک کب سے ہوئیں۔

کسم۔ میری ہنسی نہ اڑاؤ۔ میں بڑی دکھیا ہوں

موہن۔ دکھیا کیوں ہو میں پہونچتے ہی بھائی صاحب کو خبر کر دوں گا اور آج ہی شادی ہو جائے گی۔

کسم اپنے خیالات میں کھوئی ہوئی تھی موہن سے برداشت نہ ہو سکا بڑھ کر زور سے لپٹا لیا اور متواتر کئی بوسے لے لئے۔

موہن۔ اب بولو اب تو تم میری ہو

کسم۔ تم بڑے ظالم ہو

موہن اور جب تک تم شادی کا اقرار نہ کرو گی یونہی ظالم رہوں گا۔

کسم۔ مجھے شرم آتی ہے۔

موہن۔ تمہاری جگہ فینا ہوتی تو کبھی نہ ہچکچاتی۔

کسم۔ مگر میں (جل کر) فینا نہیں ہوں

موہن بھگوان نہ کرے تم فینا ہو ہم لوگ آدھ گھنٹے کے اندر بمبئی پہونچ جائینگے تم کیا کہتی ہو۔

کسم۔ میں سیدھے اپنے چوپاٹی والے مکان میں جاؤں گی

موہن۔ اور میں تم کو پہونچا کر شادی کا سامان کرنے جاؤں گا۔

کسم۔ لوگ کیا کہیں گے۔
موہن۔ پرواہ نہیں۔ تم میری ہو اور اب میں تم سے جدا نہیں رہ سکتا۔
کسم۔ مجھے تم سے محبت ہے۔ اگر تم واقعی چاہتے ہو تو میں شادی کے لئے تیار۔
موہن نے اس کا جواب بوسوں میں دیا۔ اتنے میں سٹیشن آ گیا دونوں پریم رس میں ڈوبے ہوئے جو باٹی پہونچے۔ راستہ بھر زیادہ تر اشاروں میں باتیں ہوتی رہیں۔
موہن۔ (رخصت ہوتے ہوئے) میں کل صبح سامان کر کے آ جاؤں گا۔
کسم۔ میں تیار رہوں گی۔

Calendar

March 21st Thursday 1935

کسم دوسری صبح کو Calendar دیکھتی ہے March 22

پھر گھڑی دیکھتی ہے Friday 1935

نو بجے ہیں۔ وہ بہت مسرور ہے۔ دروازے کی آواز پر بھی چونک جاتی ہے۔ تار بانٹنے والا ایک تار لاتا ہے۔ کسم کھول کر پڑھتی ہے

"فوراً چلی آؤ۔ جاں بلب ہوں"

فینا

کسم فوراً ہی اپنا چھوٹا بیگ لیکر جلدی میں ایک پرچہ موہن کے نام لکھتی ہے
"میں آنند گڑھ جا رہی ہوں" — کسم

باہر جھکر ٹیکسی پر بیٹھتی ہے اور سٹیشن پہونچ جاتی ہے۔ رام نگر جانے والی گاڑی کا وقت دیکھتے ہی ٹکٹ خریدتی ہے اور بیٹھتے ہی گاڑی چھوٹ جاتی ہے۔
پلیٹ فارم پر ایک لڑکا چیختا ہوا جاتا ہے۔ بالکل تازہ خبر مہاراج گجراج صاحب کی خودکشی،
کسم فوراً ایک اخبار خریدتی ہے۔
پہلا صفحہ "گجراج صاحب کی خودکشی"
ہمارے نامہ نگار کو بچنۃ خبر ملی ہے کہ رام نگر کے مہاراج گجراج صاحب کل رات کو بمبئی آئے۔ بارہ بجے کے بعد بھی لوگوں نے ان کو ہینگنگ گارڈن میں دیکھا۔ صبح تڑکے جمعدار نے ان کا کوٹ اور ٹوپی باغ کے ایک سرے والی بنچ پر پایا۔ کوٹ میں ایک پرچہ تھا اس میں لکھا ہوا تھا۔
"میں اپنی زندگی سے عاجز ہو کر خودکشی کر رہا ہوں۔ میرا وصیت نامہ خاندانی وکیل پنچ منی صاحب کے پاس محفوظ ہے۔" "گجراج"
کسم کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ رام نگر کا سٹیشن آ گیا وہاں ریاستی موٹر موجود تھی۔ دیکھکر ضبط نہ ہو سکا۔ رونے لگی۔
جب آنند گڑھ پہونچی تو آفت مچی ہوئی تھی غضب کا سناٹا تھا۔ خادمہ اور ماما اکثر سرگوشیاں کر رہے تھے۔ خدام ایک طرف پریشان تھے
فینا سر سے پاؤں تک سیاہ کپڑوں میں ملبوس تھی دیکھتے ہی لپٹ گئی۔

"پیاری میں تباہ ہو گئی۔ لٹ گئی۔ صاحب مر گئے۔ موہن چھن گئے
کسم۔ کس نے چھینا
فینا۔ بہن تم نے۔ ہائے اب میرا کوئی نہیں
کسم۔ میں جو کچھ کہو کرنے کے لئے تیار ہوں
فینا۔ کچھ نہیں صرف اس بے وفا کو طوطا چشمی کا مزہ چکھانا چاہتی ہوں جیسے اس نے میرا دل توڑا ہے میں بھی اس کا دل توڑوں گی یہ لکھدو کہ تمہاری منگنی ٹوٹ گئی اور وہ کبھی اپنا منہ نہ دکھائے کسم رکی ہی تھی کہ فینا نے تپنچہ نکالکر اپنے سینہ کو نشانا بنایا۔ اگر نہ لکھو گی تو میں ابھی جان دیدوں گی۔
کسم کی انگلیاں کانپ رہی تھیں۔ ابھی اس نے صرف منگنی کا لفظ لکھا تھا کہ دروازہ کھلا اور موہن اندر آ گیا

کسم نے فوراً ہی اخبار موہن کو دیدیا۔ موہن اخبار پڑھکر غمگین ہو گیا۔
فینا۔ (کسم سے) تم ذرا دیر کے لئے باہر چلی جاؤ میں ابھی بلا لوں گی۔
کسم مڑی ہی تھی کہ موہن نے بڑھکر روک لیا۔ پیاری میں تمہیں تنہا نہ جانے دوں گا۔ میں بھی چلتا ہوں
فینا۔ اچھا تو یہاں تک نوبت پہونچ گئی۔ رونے لگتی ہے۔
اتنے میں خاندانی وکیل پنچ منی صاحب کے آنے کی خبر ہوتی ہے سب لوگ بیٹھ جاتے ہیں۔
وکیل صاحب۔ وصیت نامے کی رو سے جائداد کا ½ حصہ کسم بائی کو ملنا چاہیئے اور بقیہ آپ کو مگر اس شرط سے کہ آپ —
فینا۔ یہ سب گھر کے لوگ ہیں آپ بلا تکلف کہیئے
وکیل صاحب۔ کہ آپ ان سے (موہن کیطرف اشارہ کر کے) شادی نہ کیجئے۔
فینا۔ میں اور ایسے کنگال سے شادی! ہائے میرا سرتاج۔ ہائے پیارے گجراج (تصویر پھر جاتی ہے)
موہن (بگڑ کر) چلو کسم یہاں سے چلیں۔ کہیں یہاں کی زہریلی ہوا سے تمہارے پھول ایسے گال کملا نہ جائیں
فینا۔ اگر میں جانتی ہوتی تو کبھی تم کو منہ نہ لگاتی
موہن۔ اور میں بھی منہ نہ لگاتا
وکیل صاحب رخصت ہو جاتے ہیں مگر باہر جا کر ایک کھڑکی کی آڑ سے پردہ سرکا کر باتیں سنتے ہیں۔
فینا۔ یا تو وہ گرما گرمی یا یہ بے رخی۔ تم بڑے کم ظرف ہو
موہن۔ اگر تم مرد ہوتیں تو اس بیہودگی کا کوئی مزہ چکھا دیتا۔ مجھے تم سے کبھی محبت نہ تھی۔
فینا۔ تو چھپ چھپ کر ملنا کیا تھا؟
موہن۔ صرف حماقت۔ تم خود جانتی ہو کہ ہم میں کبھی کوئی نازیبا بات نہیں ہوئی۔
فینا۔ کیا اب بالکل محبت نہیں۔

کسم - جھوٹ نہ بولنا ؟

موہن - مجھے نفرت ہے۔

کسم - یہ کیا کہتے ہو ؟

فینا - (تڑپ کر) مجھے خود نفرت ہے (رو کر) ہائے مرے سرتاج اگر وہ زندہ ہوتے تو تم اس طرح گستاخیاں نہ کرتے۔ ایک غریب بیوہ پر ایسی سختی اتنا ظلم۔

دروازہ کھلا - وکیل صاحب آئے

معاف کیجئے گا ایک ضروری بات بھول گیا تھا۔ وصیت نامہ کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ اگر کسم بائی اور موہن صاحب کی شادی ہو جائے تو سارا خرچ اسی ریاست سے دیا جائے۔

فینا - (تڑپ کر) اُف میرے سرتاج اگر تم زندہ ہوتے تو میں پاؤں کی خاک بن کر رہتی اے گجراج کی پاک روح مریم کے واسطے شاہد رہ کہ میں اپنے پیارے شوہر کے پاس پہونچنے کے لئے اپنی جان نچھاور کرتی ہوں۔

فینا نے فوراً ہی تمنچہ نکالا۔ بوڑھے وکیل نے بڑھکر ہاتھ ڈالا مگر گھوڑا دب چکا تھا۔ دنا کا ہوا اور فینا کے پیچھے والی دیوار سے چونا گرا۔ دھواں ہو گیا۔ فینا کے ہاتھ سے تمنچہ چھن گیا اور دھواں چھٹا تو گجراج صاحب کھڑے تھے۔ لباس وکیل ہی صاحب کا تھا مگر چہرہ بدل گیا تھا۔ سب لوگ حیران رہ گئے۔

گجراج - پیاری میں نے خودکشی نہیں کی تھی۔ وہ صرف چال تھی۔ تم ہنسو گی۔ مگر سوتیا ڈاہ مجھے بھی ہوئی اور میں نے جانچ کی یہ ترکیب نکالی تھی۔

کسم - سچ ہے ایک دن دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو جاتا ہے۔

فینا - (قدموں پر گر کر) آج سے میں سچی ہندو استری کے سمان رہوں گی۔ مجھے شدھ کر لیجئے۔ فیشن اور آزادی پر لات مارتی ہوں

گجراج گلے سے لپٹا لیتے ہیں

کسم ہم دونوں کو بھی شما دیجئے۔ دیا کیجئے

کسم - آج سے یہ میری بہن ہیں اور یہ میرے بھائی ہیں۔

گجراج - اور میرے بھی۔

کسم - اور یہ میری بہن ہیں آپ میرے بھائی تھے ہیں اور رہیں گے۔

موہن - اور میرے بھی —

گجراج - آج مجھ سے زیادہ کوئی خوش نہیں ہے۔

فینا - میں ہوں

کسم - میں بھی

موہن - اور میں بھی۔

فینا اور کسم ساریوں میں۔ موہن اور گجراج قدیم شریف ہندوؤں کے لباس میں گنگا اشنان کر کے۔ سورج دیوتا کو جل چڑھا رہے ہیں اور بھجن ہو رہا ہے۔

نبی آخر الزماں

پیارے محمد کی سوانح حیات

یہ کتاب اپنی جامعیت سلاستِ زبان بصحتِ تاریخ۔ خوبی کاغذ اور صفائی طباعت کے لحاظ سے بہت ممتاز ہے۔

تاریخ عرب اور میلاد رسولؐ سے لیکر وفات تک کے حالات درج ہیں اِس کتاب میں عاشق رسول جناب منشی فضل الدین صاحب مؤلف نے وہ وہ خوبیاں پیدا کی ہیں جنکے مطالعہ سے آپکی حیات دینی میں خاص جوش پیدا ہوگا۔ اصلی قیمت پانچ روپیہ (۵ر) مجلد رعایتی (۲؏) محصولڈاک بذمہ خریدار۔ منی آرڈر روانہ کرنیوالے اصحاب سے خرچ ڈاک لیا جائیگا۔

ملنے کا پتہ

منیجر عارف کمپنی نیلہ گنبد لاہور

لالہ فام

بواسیر کا حکمی علاج

بواسیر خونی ہو یا بادی لالہ فام کی ایک شیشی کے استعمال کے بعد ظالم مرض سے ہمیشہ کیلئے نجات ہو جاتی ہے۔ قیمت فی شیشی ایک روپیہ (عہ) علاوہ محصولڈاک۔

ملنے کا پتہ

منیجر یونانی کیمیکل فارمیسی نیلہ گنبد لاہور

بیانِ حال

مصنفہ **اشفاق اظہر دہلوی**

مسلمانوں کی شوکت رفتہ اور حالت موجودہ کا عبرتناک مرقع دیکھنا ہو تو ڈھائی آنے (۲؍۔) کے ٹکٹ بھیجکر یہ کتاب منگالیں۔ ہر دردمند مسلمان کو یہ کتاب ضرور پڑھنی چاہیئے۔

ملنے کا پتہ

منیجر عارف کمپنی نیلہ گنبد لاہور

قوت کی لاثانی بے ضرر اور تیر بہدف دوائی

کایا کندن

مشرق کی وہ ایجاد جو صدیوں سے استعمال میں آرہی ہے انسانی زندگی کی حقیقی حفاظت بڑھاپے کو دور کرکے شباب میں بدلنے والی ایک ایسی ایجاد جسکی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ مشرقی اطبا نے اس دوا کا نسخہ ہندوستان کے رؤسا اور امراء کیلئے تیار کیا تھا اور اسی دوا کے بل بوتے پر وہ ہمیشہ ہمیشہ جوان اور تندرست سُرخ و سپید رہتے تھے۔

زندگی اور زندہ دلی کا راز

انسانی طاقتوں میں اضافہ کرنیکے لئے کایا کندن سے بڑھکر کوئی ایجاد نہیں

مایوس مریض

چند دنوں کے استعمال کے بعد اسکے گرویدہ ہو جاتے ہیں۔ اسکے استعمال سے قوت میں اس قدر ترقی ہو جاتی ہے جس کا اظہار ممکن نہیں۔

ایک شیشی نئی زندگی بخشتی ہے

قیمت فی شیشی علاوہ محصولڈاک پانچروپیہ (۵ر) (چالیس یوم کی دوائی) آزمائش کے طور پر دس یوم کی دوائی منگواکر استعمال کریں۔ قیمت شیشی نمونہ ایک روپیہ آٹھ آنہ (عہ)۔

ملنے کا پتہ

منیجر یونانی کیمیکل فارمیسی نیلہ گنبد لاہور

ادبی مرکز میرٹھ سے ایک بلند ہفتہ وار سیاسی و ادبی اخبار

آفتاب

کا طلوع

زیر ادارت

عالیجناب پنڈت گوپی ناتھ سنہا بی۔اے۔ایل ایل۔بی ایڈوکیٹ سابق مُدیر روزنامہ "قوم" میرٹھ

مدت سے ایک ایسے اخبار کی ضرورت کو محسوس کیا جا رہا تھا جو شہر اور ملک کی صحیح نمائندگی کے فرائض ادا کرے۔ ہم نے باوجود چند در چند ذمہ داریوں کے بالآخر ایک ہفتہ وار اخبار کی ذمہ داری کا بار بھی اپنے سر لے لیا۔ اور دارالاشاعت ساغر پریس سے ایک بلند معیار ہفتہ وار جاری کر دیا تاکہ شہر اور ملک کی خدمت کی جا سکے۔

آفتاب اپنی اصابت رائے، مضامین، سیاسی مقالات، طباعت، اور اپنی اُٹھان کے لحاظ سے بہت پسند کیا گیا ہے۔ ملک کے بہترین انشاپرداز و شعرا کے مقالات اور نظمیں، دلچسپ افسانے، انسانی فطرت میں رفعت پیدا کرنے والے اقوال، لطائف و ظرائف، غرضکہ ہر وہ عنصر جو ایک ہفتہ وار اخبار کے لئے ضروری ہے "آفتاب" میں نہایت تکمیل کے ساتھ پایا جاتا ہے۔

قیمت سالانہ ([illegible]) علاوہ محصول۔ فی پرچہ (۱ر)

ملنے کا پتہ

دارالاشاعت ادبی مرکز (ساغر پریس) سی پٹ بازار میرٹھ